

مولانا عبدالرشید

www.KitaboSunnat.com

پروفیسر محمد سرور



معزز قارئین توجہ فرمائیں

- کتاب و سنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب... عام قاری کے مطالعے کیلئے ہیں۔
- مَجْلِسُ التَّحْقِيقِ الْإِسْلَامِيِّ کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق و اجازت کے بعد (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کیلئے ان کتب کو ڈاؤن لوڈ (Download) کرنے کی اجازت ہے۔

تنبیہ

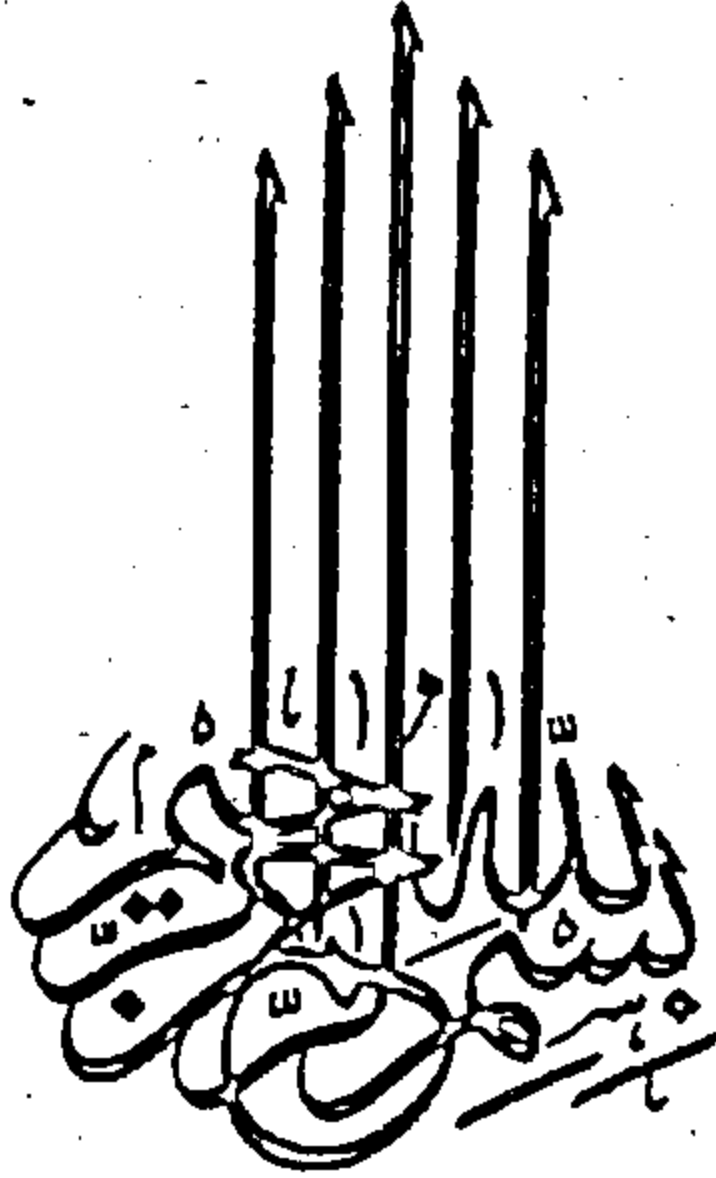
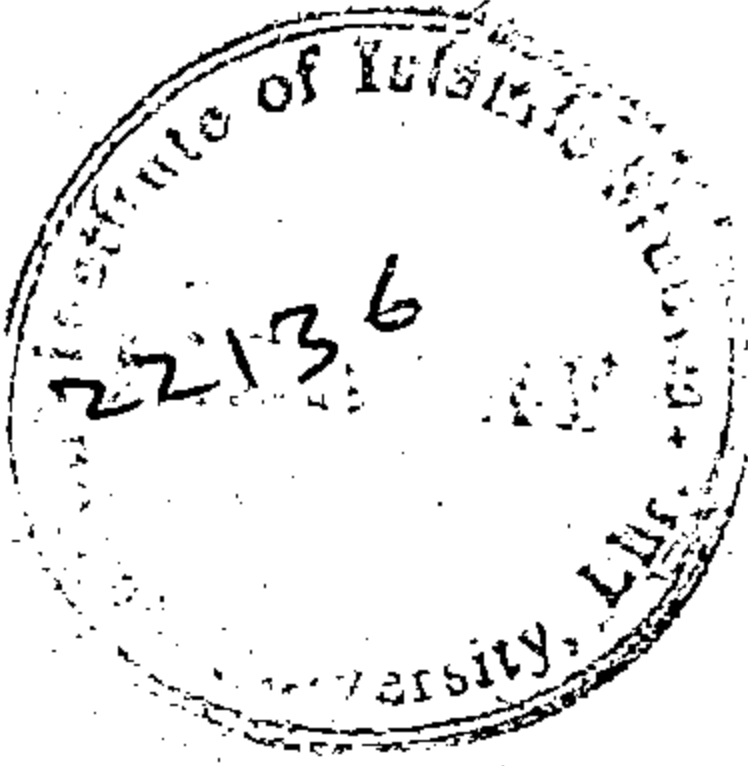
ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی ممانعت ہے
کیونکہ یہ شرعی، اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

PDF کتب کی ڈاؤن لوڈنگ، آن لائن مطالعہ اور دیگر شکایات کے لیے درج ذیل ای میل ایڈریس
پر رابطہ فرمائیں۔

✉ KitaboSunnat@gmail.com

🌐 www.KitaboSunnat.com

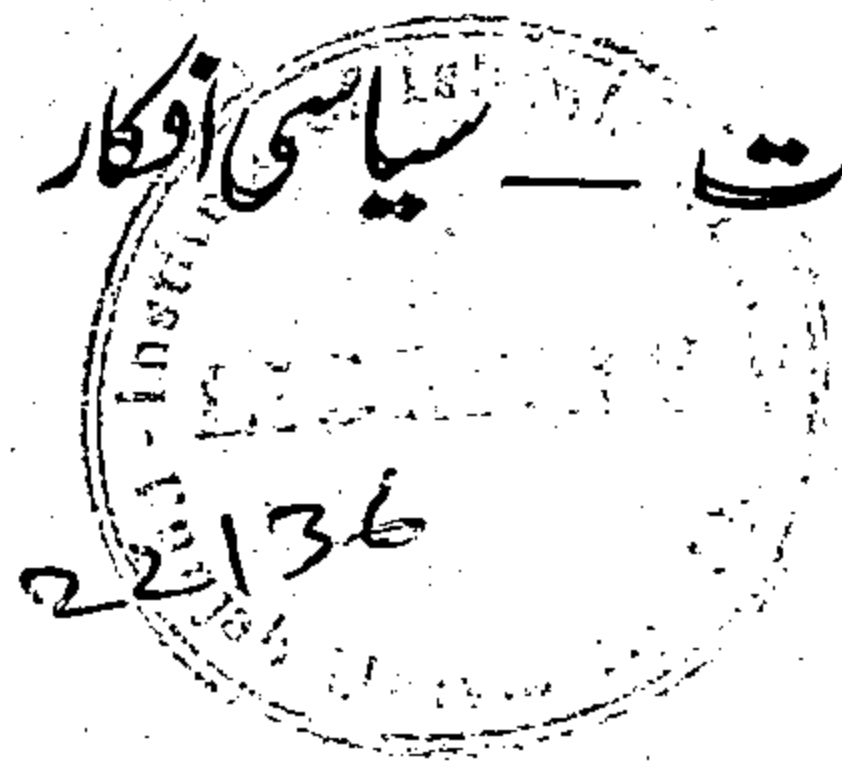


DATA ENTERED

MFAK
2729

مولانا عبدالرشید مدنی

حالات - تعلیمات - سیاسی افکار

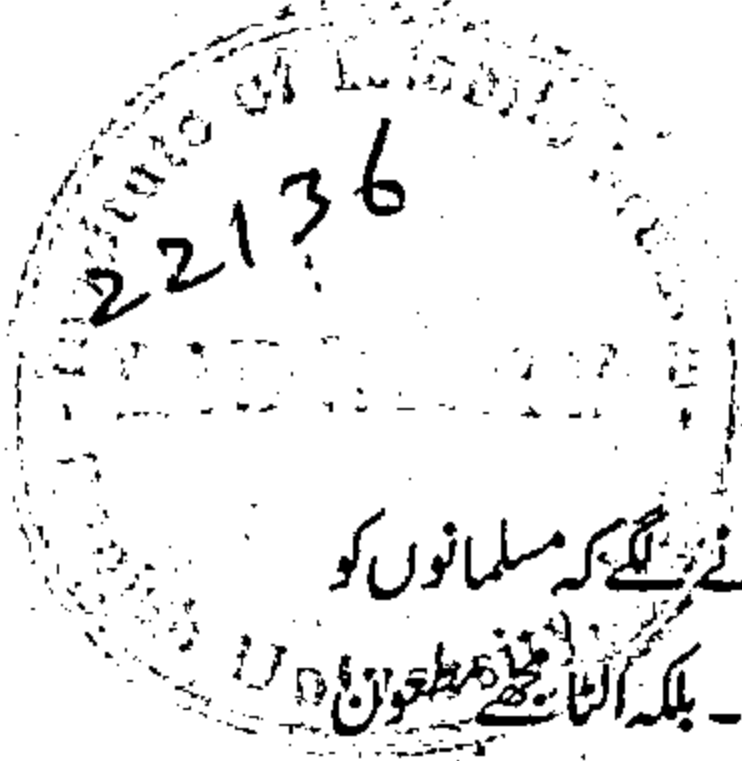


پروفیسر محمد رسالتی استاد جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

www.KitaboSunnat.com

سندھ ساگر اکادمی لاہور

21- عزیز مارکیٹ، اردو بازار



ایک دن مولانا بڑے مغموم سے تھے۔ فرمانے لگے کہ مسلمانوں کو کام کی اور ضرورت کی باتیں کہتا ہوں لیکن وہ نہیں سنتے۔ بلکہ انہیں مٹھوں سے پھینک دیتے ہیں۔ مجھے دیکھو میں سولہ برس کا تھا کہ گھریا چھوڑ کر نکل آیا تھا۔ مانا کہ میرا خاندان بہت بڑا نہ تھا اور نہ ہمارے ہاں دولت کی فراوانی تھی لیکن آخر میری ماں تھی۔ میری بہنیں تھیں اور ان کی محبت میرے دل میں جاگزیں تھی۔ لیکن اسلام سے مجھے اتنی محبت تھی کہ میں کسی محبت کو بھی خاطر میں نہ لایا۔ خدا ہی جانتا ہے کہ ماں کو چھوڑنے سے مجھے کس قدر ڈہنی کوفت ہوئی۔“ (یہ کہتے ہوئے مولانا آب دیدہ ہو گئے)

آپ نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ ”اسلام سے میری اس شیفٹنگی کا نتیجہ تھا کہ جو بھی مجھے اسلام کی بات سمجھاتا اور وہ بات میرے دل میں بیٹھ جاتی تو میں اس کا دل و جان سے گرویدہ ہو جاتا۔ حضرت شیخ الہند نے مجھے اسلام سکھایا۔ اور ان کے واسطے سے میں شاہ ولی اللہ کی تعلیمات کو سمجھا۔ مجھ پر قرآن حکیم کے حقائق منکشف ہوئے اور میں دین اسلام کی حکمت سے آگاہ ہوا۔ اب اگر میں موجودہ مذہبی طبقتوں کے خلاف کوئی بات کہتا ہوں تو اسے یہ سمجھنا کہ میں مذہب کے خلاف ہوں، کس قدر غلط ہے۔ میں نے دنیا کی عزیز ترین متاع یعنی اپنی والدہ کی محبت پر مذہب کو مقدم جانا اور آج عمر بھر کی مصائب اور تکالیف کے باوجود بھی مجھے اپنے مسلمان ہونے پر فخر ہے۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ آج جبکہ مجھے اپنی زندگی کا آخری کنارہ نظر آ رہا ہے، کوئی بات ایسی کہوں جس سے خدا نہ کرے اسلام کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔“

جملہ حقوق محفوظ

2002ء

محمد صدیق نے

حاجی محمد حنیف اینڈ سنز پرنٹرز لاہور

سے چھپوا کر شائع کی۔

قیمت: 150 روپے

اشاعت سوم

یہ کتاب پہلی دفعہ ۱۹۴۳ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس وقت حضرت مولانا عبید اللہ سندھی زندہ تھے۔ انہوں نے اس کتاب کو پڑھا اور پسند فرمایا۔ دوسری بار یہ چھپی تو جلد ہی ختم ہو گئی۔ اور ایک عرصے سے یہ نایاب تھی۔

۱۹۴۷ء کے بعد برصغیر پاک و ہند کا سیاسی نقشہ اور پوری تاریخ ہی بدل گئی ہے اور حضرت مولانا سندھی مرحوم مغفور نے جس تاریخی پس منظر میں اس برصغیر کی سیاسیات پر اظہار خیال فرمایا تھا، وہ یکسر تبدیل ہو گیا۔ لیکن مرحوم کے حالات زندگی، تعلیمات اور سیاسی افکار پر چونکہ اس کتاب کی حیثیت ایک تاریخی دستاویز تھی۔

محمد سرور

مئی ۱۹۶۷ء

اسلام آباد

اشاعت پنجم

سب سے پہلی بار یہ کتاب ۱۹۴۳ء میں چھپی تھی۔ اس میں ایک عالم دین کی طرف سے جس کے مستند عالم اور دارالعلوم دیوبند کے سلسلے کے ایک مسلم بزرگ ہونے سے کوئی انکار نہیں کر سکتا تھا، پہلی دفعہ ہندوستان میں ایک آزاد جمہوری، سیکولر اور سوشلسٹ حکومت قائم کرنے کی دعوت دی گئی۔ اور یہ بتایا گیا کہ اس ملک کے مختلف مذاہب اور ان کے ماننے والے وحدت الوجود کے عقیدے کو اپنا کر اور سیاست و معیشت میں وطنی قومیت و اشتراکیت کو اساس بنا کر ایک کل ہندو وسیع تر سیاسی وحدت کے اندر امن، آزادی اور خوشحالی کے ساتھ رہ سکتے ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مسلم لیگ مسلمان عوام میں بڑی ہر دلعزیز ہو رہی تھی۔ اس کا دعویٰ یہ تھا کہ ہندوستان کے اندر مسلمان بحیثیت مسلمان ہندوؤں سے الگ ایک قوم ہیں۔ جماعت اسلامی گو مسلم لیگ کی مخالفت کرتی تھی۔ لیکن وطنی قومیت کو وہ بھی اسلام کی ضد اور انگریزی حکومت کے خلاف سیاسی جدوجہد کو غلط سمجھتی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ جمعیت العلمائے ہند کا انگریز اور متحدہ ہندوستانی قومیت ہر دو کی حامی تھی۔ اور کانگریس کے پہلو پہ پہلو برطانوی حکومت کے خلاف برسر کار تھی۔ لیکن اس کے رہنما علماء حضرات مذہب میں قدامت پسند اور سماجی امور میں رجعت پسند ہونے کی وجہ سے سیکولر ازم اور اس سے مترتب ہونے والے قدرتی نتائج سے خائف تھے اور مستقبل کے ہندوستان کے متعلق ان کے ذہنوں میں کوئی واضح خاکہ نہ تھا۔

اس وقت مولانا سندھی نے ملکی سیاست کو مذہب کی بنیاد پر جسے وہ مذہبی فرقہ واریت کا نام دیتے تھے چلانے کے خطرات سے ان الفاظ میں آگاہ کیا۔ فرماتے ہیں: ”ہم اس وقت جس مذہبیت کا شکار ہو رہے ہیں۔ یہ مذہبیت روگی ہو چکی ہے۔ یہ سنی کو شیعہ سے لڑاتی ہے۔ اہل حدیث کا دل حنفی سے میلا کرتی ہے۔ احمدی اور غیر احمدی میں نفرت ڈالتی ہے اور ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کا جانی دشمن بتاتی ہے۔ اس مذہبیت کے طفیل انسان انسان کے خون کا پیاسا ہو گیا ہے۔ میں اس روگی مذہبیت کو مٹانا چاہتا ہوں۔“

اس ضمن میں مولانا نے کہا: ”ہمارے موجودہ مذہبی طبقے ناکارہ ہو چکے ہیں۔ وہ آسانی سے

رجعت پسندی کے آلہ کار بن جاتے ہیں۔ نیز اب تک مذہب کے نام سے ہمارے یہاں جو تحریکیں چلیں ان سے خود مسلمانوں کے اندر افتراق اور جھگڑے پیدا ہوئے۔“

مولانا کے سامنے سرزمین ہندوستان میں مسلمان کا تصور یہ تھا۔ اسی کتاب میں ہے: ”میرا مقصد یہ ہے کہ ہم شاہ ولی اللہ کے بتائے ہوئے اصولوں پر مسلمان بنیں۔ اس سے نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کی آپس کی فرقہ پرستی مٹ جائے گی۔ بلکہ ایک مسلمان کے دل میں اتنی وسعت پیدا ہو سکے گی کہ ہندوؤں کے ساتھ سیاسی اور معاشی معاملات میں پورا پورا تعاون کرے۔ دونوں میں وحدت الوجود کا مشترک دینی فکر اساس موالات بن سکے گا۔ پھر اس ہندوستانی مسلمان کو میں آج کی دنیا کے بین الاقوامی ترقی پسند انسانی تصور کا حامل دیکھنا چاہتا ہوں اسی لیے میں اسے یورپ کے علوم سائنس اور طریقہ ہائے تنظیم کو اپنانے کی دعوت دیتا ہوں۔“

۱۹۳۲ء میں کانگریس نے انگریزی حکومت کے خلاف ”ہندوستان چھوڑ دو“ کی قرارداد منظور کی جس کے نتیجے میں اسے خلاف قانون قرار دیا گیا اور اس کے تمام چھوٹے بڑے لیڈر اور ہزار ہا کارکن جیلوں میں بند کر دیے گئے۔ مولانا نے عین ان دنوں کانگریس کی حمایت کی اور اس بات پر زور دیا کہ آزادی کی جدوجہد میں تمام ہندوستانیوں کی بلا تین مذہب و نسل ایک مشترکہ تنظیم ہونی چاہیے۔ اور یہ تنظیم اپنی شاندار ماضی کی بنا پر صرف کانگریس ہی ہو سکتی ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ مولانا کا کہنا تھا کہ کانگریس سے ایک طرف مسلمان اور دوسری طرف اشتراکی رجحان رکھنے والے الگ ہوتے جا رہے ہیں۔ آپ نے متنبہ کیا کہ اگر کانگریس جلد رجعت پسندی کے اثرات سے آزاد نہ ہوئی تو بد قسمتی سے ملک کو بہت برے دن دیکھنے پڑیں گے۔ وہ کانگریس کو ایک قومی سیکولر اور سوشلسٹ تنظیم کی صورت میں دیکھنا چاہتے تھے اور گاندھی جی نے اسے ایک طرح کا جو مذہبی رنگ دے رکھا تھا وہ اس کے برخلاف تھے۔“

اسی کتاب میں مولانا کے یہ ارشادات درج ہیں: ”گاندھی جی اپنے من کی دنیا میں کچھ اس طرح الجھے رہے کہ انہوں نے مشین کے پیدا کیے ہوئے انقلاب کو اپنے تصور حیات میں پوری اہمیت نہ دی۔ یہی وجہ ہے کہ گاندھی جی کی قیادت کے خلاف ایک طرف اگر مسلمانوں نے آواز اٹھائی تو دوسری طرف مشین کی پیدا کی ہوئی ذہنیت کے حاملین نے بھی اس قیادت کا دامن چاک چاک کر دیا..... اب خود ہی انصاف فرمائیے کہ جس کانگریسی نظام سے مسلمان اور اشتراکی دونوں بے تعلق رہے اس کا کل

ہندوستان کو نمائندگی کرنا کیسے حق بجانب ہو سکتا ہے.....“

”مولانا سندھی کا کہنا یہ ہے کہ کانگریس خالص سیاسیات اور اقتصادیات کے اصولوں پر اپنے مسلک اور حکمت عملی کی بنیاد رکھے اور کسی مذہبی جماعت کو یہ اجازت نہ دی جائے کہ وہ اپنے خاص مراسم مذہبی کو کانگریس کا جزو بنا سکے۔“

اس کتاب میں سوشلزم، کمیونزم اور سوویت یونین پر بحثیں بھی ہیں۔ اسی کی بنا پر بعض لوگوں نے مولانا سے شکایت کی تھی کہ اس کتاب میں ان کے حوالے سے سوشلزم پر وہ پیگنڈا کیا گیا ہے۔ مولانا نے اس شکایت کو قابل توجہ نہ سمجھا اور کتاب کے ہر اندراج پر صاف فرمایا۔ مولانا اشتراکیت کو ایک بین الاقوامی تحریک مانتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ایک ہے روسی اشتراکیت کا عمومی پہلو اور ایک ہے اس کا قومی پہلو اور ان میں کوئی بنیادی تناقض نہیں۔ مولانا کمیونسٹ نہیں تھے لیکن میں ان کی زبان سے کمیونزم کی مخالفت کبھی نہ سنی۔ اس معاملے میں ان کا سیاسی مسلک آج جسے ”قومی جمہوری“ کہا جاتا ہے کم و بیش وہی تھا۔ خود مولانا کے الفاظ میں ”یہ مشینی دور اب کسی کے روکے نہیں رک سکتا۔ روس میں مشین پر کام کرنے والے کاریگروں اور مزدوروں نے خود اپنی حکومت بنالی ہے..... جن ملکوں میں مشین پر کام کرنے والے مزدور اور کاریگر انقلاب برپا کریں گے اس وقت اگر وہاں کے کاشتکار بھی منظم ہو چکے ہوں گے تو وہ بھی ان کے ساتھ شامل ہو جائیں گے۔ مزدوروں اور کاشت کاروں کا یہ انقلاب ہمارے ہاں بھی آ کر رہے ہیں۔“

یہ کتاب اکتوبر ۱۹۳۳ء میں شائع ہوئی اور تقریباً ایک برس بعد اگست ۱۹۳۳ء میں آپ کا انتقال ہو گیا۔ اس واقعہ پر بتیس سال ہو رہے ہیں۔ قارئین دیکھیں گے کہ اس مدت میں کتنی ہی باتیں جو مولانا نے کہیں اور ان کے اہل زمانہ نے انہیں ان ہونی سمجھا اور ان کا مذاق اڑایا۔ وقوع پذیر ہوئیں۔ اور آج دنیا جس سمت کو بڑھ رہی ہے وہ دن دور نہیں کہ مولانا کی دوسری باتیں بھی اسی طرح صحیح ثابت ہوں۔

محمد سرور
لاہور

مئی ۱۹۷۶ء

پیش لفظ

22136

مولانا عبید اللہ صاحب سندھی دیار حرم میں تشریف فرما تھے کہ
 خاکسار مصنف ان کی خدمت میں پہنچا۔ موصوف ہندوستان آئے تو راقم
 الحروف بھی وطن لوٹ آیا۔ یہاں ایک عرصہ تک مصنف کو مولانا کی خدمت
 میں بیٹھنے اور ان سے استفادہ کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ معمول یہ تھا کہ
 جب کبھی مجھے مولانا کی مجلس میں بار ملتا آپ میری استعداد کے مطابق کسی
 موضوع کا انتخاب فرما لیتے اور اس پر گفتگو کرتے۔ میں چپ چاپ بیٹھا سنتا
 رہتا کبھی کوئی بات واضح نہ ہوتی تو میں سوال کی جرأت کرتا۔ آپ نہایت
 شرح و بسط سے اس کا جواب دیتے۔ اور ایک ایک نقطہ کی پوری وضاحت
 فرماتے۔ بعض دفعہ یہ صحبت تمام تمام دن جاری رہتی۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوا
 کہ مولانا نماز مغرب کے بعد جو بیٹھے تو ساری رات تعلیم و ارشاد فرماتے گزار
 دی۔ مجلس ختم ہوتی تو میں مکان پر آ کر مولانا کے ان ارشادات کو اپنی یاد
 داشت سے قلم بند کر لیا کرتا۔ مولانا کے حضور میں کچھ لکھنا ممکن نہ تھا۔ ایک دو
 دفعہ میں نے کوشش بھی کی۔ لیکن ایک تو اس طرح لکھنے سے مولانا کے انہماک
 اور یک سوئی میں خلل آتا اور دوسرے گفتگو اتنی موثر اور دل و دماغ کو مسحور
 کرنے والی ہوتی کہ ذہنی تاثرات کو اسی وقت قید تحریر میں لانا میرے لیے
 مشکل ہو جاتا۔ ناچار مجھے اپنے حافظہ پر ہی انحصار کرنا پڑتا۔ معلوم نہیں مولانا
 کی گفتگو پوری طرح ضبط کرنے میں مصنف کس حد تک کامیاب ہو سکا ہے۔
 اور پھر اس کا بھی قوی امکان ہے کہ وہ اپنے تصور فہم کی بنا پر مولانا کی کسی بات
 کو سمجھنے میں بھی قاصر رہا ہو۔

مولانا کے ارشادات کی روایت میں مجھ سے اگر کوئی غلطی ہوئی ہو

یا خداخواستہ کتاب کے کسی مضمون کو پیش کرنے میں راقم الحروف نے ٹھوکر کھائی ہو تو میں اپنے محترم و بزرگ حضرت مولانا نیز کتاب کے قارئین کرام سے درخواست کروں گا کہ وہ ان مجبوریوں کا خیال کرتے ہوئے اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہ فرمائیں گے کہ ایک تو کتاب کا موضوع بڑا مشکل اور نیا تھا اور دوسرے لکھنے والا ابھی اس راہ میں خام ہے۔

محمد سرور

جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ دہلی

۲۵ ستمبر ۱۹۴۳ء

فہرست

مقدمہ	15
حالات زندگی	21
وحدت انسانیت	31
خدا پرستی ---- انسان دوستی	37
جہاد ---- انقلاب	46
انسانیت کے بنیادی اخلاق	62
تصوف	74
اسلامی تصوف	90
نظریہ تمدن	116
تاریخ اسلام پر ایک نظر	126
پس منظر اور ابتدائی دور	
مسلمانوں کی قومی حکومتوں کا دور	141

اسلامی افکار میں قومی اور ملکی رجحانات 165

اسلامی ہندوستان 186

اکبر اعظم 196

اورنگ زیب عالمگیر 206

شاہ ولی اللہ 213

ولی اللہی سیاسی تحریک 222

انڈین نیشنل کانگریس 229

ہندوستانی مسلمانوں کا مستقبل 252

ایک تاریخی منشور 262

پروفیسر محمد سرور 273

از قلم مولانا عبید اللہ انور

مقدمہ

۱۹۲۹ء کا ذکر ہے کہ جامعہ دہلی میں عربی کی تکمیل کر کے مزید تعلیم کی غرض سے راقم الحروف عازم مصر ہوا۔ میں نے جامعہ میں پورے چار برس تک مولانا محمد سورتی صاحب سے عربی پڑھی تھی۔ مرحوم عربی زبان کے بے نظیر ادیب اور ہندوستان میں مانے ہوئے عالم تھے۔ عربی ادب کے علاوہ دوسرے اسلامی علوم میں بھی آپ کا پایہ بہت بلند تھا۔ مولانا مسلک میں اہل حدیث تھے اور اسلاف کے تتبع میں مرحوم کو بڑا تشدد تھا۔ طلبہ کی ذرا سی آزاد خیالی اور عمل میں غیر معلوم سی بے راہ روی بھی طبیعت کو ناگوار گزرتی۔ مرحوم ہمیشہ اس امر میں کوشاں رہتے کہ ان کا کوئی طالب علم شریعت کے معمولی سے معمولی شعار کی بھی عدم پابندی کا مرتکب نہ ہو۔ جامعہ کی زندگی اور پھر مولانا سورتی صاحب کی شاگردی۔ طالب علمی کا یہ زمانہ اس ماحول میں گزرا۔

مصر پہنچے تو وہاں بالکل ہی دنیا بدلی ہوئی پائی۔ عام زندگی میں جو کچھ دیکھنے میں آیا وہ کچھ کم ہوش رہا نہ تھا لیکن مصر کی علمی اور ذہنی زندگی میں اس وقت جو طوفان پھاٹھا اور ہر سمت نئے اور پرانے خیالات، زندگی کی قدیم اور جدید قدروں، رہن سہن کے پہلے طریقوں اور یورپی آداب معاشرت۔ غرض زندگی کی ہر وضع، اُس کے ہر شعبہ ہر مقام میں قدامت اور تجدید یا عام اصطلاح میں مشرقیت اور مغربیت میں جس زور شور سے کش مکش ہو رہی تھی، اُس کو آنکھوں سے دیکھتے ہوئے اور خود اس ہنگامہ کارزار میں رہتے ہوئے اپنے فکر و ذہن کے توازن کو برقرار رکھنا محال نہیں تو مشکل ضرور تھا۔ ایک طرف عالم اسلام کی قدیم ترین درس گاہ جامعہ ازہرا اپنی ہزار سالہ روایات کو لیے ہوئے اسلامی زندگی کا ایک نقشہ پیش کرتی تھی۔ ازہر میں علمی پختگی تھی، گہرائی تھی، ایک خاص وضع داری اور آن تھی اور سب سے بڑی چیز جو طبیعت کو متاثر کیے بغیر نہ رہتی تھی وہ ازہر کے علماء کی پرتمکنت اور بارعب شخصیتیں، ان کا عالمانہ وقار اور متین و سنجیدہ انداز مشیخت تھا۔ ان بزرگوں نے ساری عمریں اپنے مضامین کو پڑھنے اور پڑھانے میں صرف کر دی تھیں۔ انہوں نے پڑھا تھا تو ایک مذہبی فریضہ سمجھ کر، سچے دل سے پورے خلوص نیت اور جوش عمل کے ساتھ۔ اور اب پڑھاتے تھے تو ثواب کا کام جان کر۔ اُن کی ایک ایک بات میں شفقت اور محبت ٹپکتی تھی اور بات کرنے کا اسلوب ایسا کہ طلبہ کی جبین نیاز خود بخود جھک جاتی۔

دینداری“ کا عمل دخل تھا اور دوسری طرف کہنے والوں کی زبان میں ”الحاد زندقہ اور کفر“ نے اپنے جھنڈے گاڑ رکھے تھے۔ راقم الحروف کو اس ”دین داری“ کے ماحول سے بھی استفادہ کا شرف حاصل ہوا اور ڈاکٹر طہ حسین کے درسوں میں بھی بیٹھنے کا موقع ملا۔

جامعہ ازہر اور جامعہ مصریہ کے علاوہ اس زمانہ میں مصر کے اخبارات، رسائل، اہل قلم، علمی مجلسوں اور ادبی انجمنوں میں یہی کش مکش جاری تھی۔ بعض علمی مجالس تھیں جہاں نئے افکار و خیالات کا پرچار کیا جاتا اور قدیم روایات پر کڑی تنقیدیں ہوتیں۔ اور بعض انجمنیں ”مغرب پرستی“ کی اس ”لعنت“ کے خلاف ہفتہ وار تقریریں کروا تیں اور ازدحام دونوں قسم کے اجتماعوں میں ہوتا۔ یہی حال رسائل کا تھا۔ اسی طرح اہل قلم بھی دو صفوں میں بٹے ہوئے تھے اور ہر جماعت دوسرے پر اپنا ترکش خالی کرنے میں کوتاہی نہیں کرتی تھی۔

انہی دنوں کا ذکر ہے مصر کے سب سے بڑے روزنامہ ”الاہرام“ میں شیخ تفتازانی نام کے ایک بزرگ نے مصطفیٰ کمال کی اصلاحات کے خلاف ایک مضمون لکھا، اس کا جواب ایک مشہور اہل قلم اور مصنف فرید وجدی نے دیا اور دلیل و برہان سے ثابت کیا کہ ترکوں نے جو کچھ کیا ہے ٹھیک کیا ہے۔ اور فقہ حنفی سے ان کی بعض اصلاحات کا جواز نکلتا ہے۔ شیخ موصوف نے اس کا رد لکھا۔ فرید وجدی نے پھر اس کا جواب دیا۔ رد و قدح کا یہ سلسلہ مہینوں تک چلتا رہا۔ آخر میں شیخ مصطفیٰ المرانی جو آج کل شیخ الازہر ہیں سچ میں پڑے۔ اور ان کے ایک تاریخی اور معرکہ آراء مضمون نے اس بحث میں ثالثی کا فرض ادا کیا۔ کچھ عرصہ کے بعد ایک اور مسئلہ چھڑ گیا۔ علامہ رشید رضا مرحوم نے جن کی تفسیر القرآن تمام دنیا میں مشہور ہے۔ اور جو ”المنار“ کے ایڈیٹر کی حیثیت سے اسلامی دنیا میں غیر معمولی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ اپنے رسالہ میں کہیں صحیح بخاری کی ایک حدیث پر جو طلوع و غروب آفتاب کے متعلق تھی، جرح کر دی۔ اس پر ازہری علماء کا ایک گروہ نبرد آزما آیا اور ”الاہرام“ ہی کے صفحات پر یہ قلمی جنگ بڑے جوش و خروش سے لڑی گئی۔

راقم الحروف دوران قیام مصر میں ایک طویل مدت تک قدامت اور تجدد کے ان معرکوں کا نہایت قریب سے مشاہدہ کرتا رہا۔ قدیم وجدید ہر خیال والوں کی باتیں سنیں، دونوں گروہوں کی مجلسوں اور انجمنوں میں شمولیت کرتا رہا۔ ہر فریق کے مضامین پڑھے۔ ان کی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ دونوں کی درس گاہوں سے مستفید ہوا۔ اور ایک گروہ دوسرے گروہ کے خلاف قرآن، حدیث، فقہ اور قدامت کے اقوال سے جو دلیل اور حجت پیش کر سکتا تھا، وہ سب سنتا اور پڑھتا رہا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ہر میدان میں قدامت پیچھے ہٹ رہی ہے اور نئے خیالات والے زندگی کے ہر شعبے میں بازی لے جا

لیکن دل و نظر کی ان تمام کششوں کے باوجود یوں محسوس ہوتا تھا کہ ازہر میں کسی چیز کی کمی ہے۔ جب کبھی ازہر سے باہر کی دنیا میں جانے کا اتفاق ہوتا تو اس کی فضا کے جو نقوش صفحہ دل پر ثبت ہوتے وہ دھندلے سے پڑ جاتے، اس سے دل کو بڑا قلق ہوتا اور طبیعت بھی بے حد پریشان ہوتی۔ لیکن مصر میں رہتے ہوئے یہ ممکن نہ تھا کہ آدمی باہر کی دنیا سے بے تعلق ہو سکے یا اسے دیکھے اور آنکھیں بند کر لے۔ نئی زندگی اپنی پوری تابانی کے ساتھ چاروں طرف لمحہ فلگن تھی اور وہ بتدریج پرانی زندگی کے ایک ایک شعبہ پر اس طرح قبضہ کرتی چلی جا رہی تھی کہ اس کو نہ دیکھنا اپنی آنکھوں کو دھوکا دینا اور اپنے دل و دماغ سے دشمنی کرنا تھا۔

جامعہ ازہر کے ایک بہت بڑے عالم شیخ وجوی کے درس میں جنہیں ”فیلسوف ازہر“ کے باعزت لقب سے یاد کیا جاتا تھا، بڑی باقاعدگی سے حاضر ہوتا رہا۔ لیکن ان کے افکار کی تمام بلندی اور وسعت محض ازہر کی علمی چار دیواری تک محدود رہتی۔ وہ گرد و پیش کی دنیا سے بے خبر تھے۔ انہیں کچھ معلوم نہ تھا کہ مشرق و مغرب میں کیا کیا طوفان اٹھ رہے ہیں اور قوموں اور ملکوں کی سیاسی معاشی ذہنی اور علمی زندگی میں ابھی ان چند سالوں میں کیا کیا انقلابات ہو چکے ہیں اور کن کن کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ازہر کی دنیا میں بظاہر سکون اور طمانیت نظر آتی تھی، لیکن یہ سکون رکے ہوئے پانی کا سکون تھا۔ ازہر کے نزدیک قدیم قدروں کی حفاظت اور اسلاف کی روایات کے تسلسل کا نام صحیح زندگی تھا۔

دریائے نیل کے ایک طرف تو ماضی کی شاندار علمی و فکری روایات کی یہ یادگار کھڑی تھی اور اس کے دوسرے کنارے پر مصر کی نئی علمی زندگی ”جامعہ مصریہ“ کی صورت میں معرض وجود میں آ رہی تھی۔ اگر ازہر قدامت کا مجسمہ تھی۔ تو یہ درس گاہ جدت اور نیا پن کا مرقع۔ ایک کی نظر صرف ماضی پر لگی ہوئی تھی اور دوسری کے نزدیک پیچھے کی طرف دیکھنا گناہ تھا، اگر ازہر کے مشائخ اپنی دنیا کی دل فریبیوں میں مگن تھے تو جامعہ مصریہ کے ”فیلسوف“ ڈاکٹر طہ حسین نئی دنیا کے بنانے میں ماضی کی ہر عقیدت، عظمت اور روایت کو ترک کرنے کی دعوت دے رہے تھے۔ ازہر کا ماحول فاطمی اور ممالیک کے دور کی یاد تازہ کرتا تھا اور جامعہ مصریہ کے اطراف و جوانب میں نکل جائے تو لندن اور پیرس کا شبہ ہوتا تھا۔ ازہر کے استاد قرآن و حدیث و فقہ کے احکام کی تفسیریں کرتے اور ہر ”بدعت“ کے سدباب کے لیے قلم و زبان سے سرگرم عمل رہتے۔ دوسری طرف جامعہ مصریہ کے پرنسپل ڈاکٹر طہ حسین تھے کہ قبل از اسلام کی ادبی تاریخ میں انہوں نے ایسی باتیں لکھ دیں کہ ان کی کتاب کو ضبط کر لیا گیا اور ان پر مصری قوم کے دین کو خراب کرنے کے الزام میں مقدمہ دائر ہوا۔ بہر حال ایک طرف تو ”خالص

انگلستان سے انہیں امریکہ جانے اور وہاں کافی عرصہ تک قیام فرمانے کا اتفاق ہوا تھا۔ یورپ اور ”یورپ زدگی“ کی باتیں ہم بہت سن چکے تھے اور یورپ کے بارے میں ہمارے اخبارات، رسائل اور اہل قلم کی کتابوں کے مطالعہ سے جو تصور عام طور پر ہر لکھے پڑھے مسلمان کے دماغ میں ہوتا ہے وہ تصور ان سطور لکھنے والے کا بھی تھا۔ لیکن صاحب موصوف کے ساتھ پانچ برس تک رہنے اور ان کے خیالات و افکار سے استفادہ کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ یورپ کی اصل رُوح کیا ہے؟ یورپی ادب فکر و ذہن کے کس معراج کمال پر ہے؟ یورپ والوں نے بنی نوع انسان کی تہذیب، تمدن اور کلچر میں کتنے زندہ جاوید اور ناقابل فراموش اضافے کیے ہیں۔ دراصل بات یہ تھی کہ تحصیل علم کے سلسلہ میں صاحب موصوف کی کوششیں صرف یورپ کے علوم و فنون اور اس کے تمدن کی ظاہری تراش خراش کی خوشہ چینی تک محدود نہ رہی تھیں، انہوں نے اپنے آٹھ سال کے قیام میں یورپ کی رُوح کو اپنایا تھا۔ وہ رُوح جس نے یورپ کو عملی زندگی میں اتنی سر بلندی اور عقل و فکر میں اس قدر گہرائی، وسعت اور جمال بخشا ہے اور موصوف کی خود اپنی زندگی میں یورپ کی یہ رُوح اس طرح رچی ہوئی تھی۔ اور ان کے ذہن کو یورپی ادب نے اتنی جلا اور ان کی حس جمال کو اس قدر نفاست عطا کی تھی کہ جو شخص بھی ان سے ملتا، ان کا گرویدہ ہو جاتا، اور ان کے زندگی کے ہر رخ کو مکمل پاتا۔

اکبر صاحب، جن کی بے وقت موت نے ابھی گزشتہ ماہ ان کے طالب علموں دوستوں عزیزوں اور جامعہ والوں کو اُن کی ان بے بہا صلاحیتوں سے ہمیشہ کے لیے محروم کر دیا ہے، یورپ کو اس کے صحیح اور اصلی رُوح میں متعارف کرانے کا ذریعہ بنے، ممکن تھا کہ اپنے مرحوم دوست کی ان باتوں کو میں محض باتیں سمجھ لیتا، لیکن یورپی علم و ادب کی تحصیل اور یورپی تربیت نے ان کے ذہن کو جو سلامت روی اور ان کے اخلاق کو جس طرح کا ثبات اور استحکام دیا تھا۔ اس کو آنکھوں سے دیکھ کر اور میل جول میں آزما کر یورپ کے فکر و عمل کی زندگی پر جو احسانات ہیں، ان کا انکار کرنا ممکن نہ تھا۔ اکبر صاحب بظاہر کسی روایتی اخلاقی ضابطہ کے قائل نہ تھے۔ لیکن میں نے انہیں نجی اور جماعتی ہر نوع زندگی میں اتنا بااخلاق پایا کہ گناہ و ثواب پر احکام اخلاق کی بنیاد رکھنے والے کبھی باور نہ کریں گے۔ حسن و قبح کا یہ احساس ظاہر ہے کچھ تو ان کا ذاتی تھا۔ لیکن اس کی صحیح تربیت اور اس کو موثر بنانے میں یورپی ادب اور اس کے کلچر کا بڑا حصہ تھا۔

زندگی کی یہ تعلیمی منزلیں تھیں، جن کے اثرات پر اپنے ذہن کی کل کائنات کا انحصار تھا لیکن مصیبت یہ تھی کہ ان منزلوں میں باہمی کوئی ربط نہ تھا، یہ ذہن کے الگ الگ خانے تھے اور ان میں برابر نزاع رہتی۔ ہر منزل نے دل و دماغ پر اپنے نقوش چھوڑے تھے، لیکن ہر نقش دوسرے سے متضاد نظر آتا۔ نہ ایک کو ترک کیے بنتی اور نہ دوسرے پر یقین راسخ ہوتا۔ دماغ ایک خیال کو ایک وقت میں اپنے

رہے ہیں۔ کوئی علمی مسئلہ ہو، کسی نئے طرز عمل کو نافذ کرنے کا سوال ہو، زندگی کے کسی پرانے ڈھرے کو بدلنے کی بحث ہو، شروع میں اس کی سخت مخالفت ہوتی، اور قدامت پرست مذہب، اسلاف کی روایات اور قومی تمدن کے نام سے اس جدت یا ”بدعت“ کے خلاف بڑے زور کا حملہ کرتے۔ لیکن زیادہ عرصہ نہ گزرتا کہ جدت فتح مند نظر آتی اور قدامت عملاً اپنی شکست تسلیم کر لیتی۔ میں نے دیکھا کہ آہستہ آہستہ قومی زندگی کے ہر شعبے پر نئے خیال والے قابض ہو رہے ہیں۔ سیاست پر یہ حاوی ہیں۔ صحافت ان کے ہاتھ میں ہے۔ علمی دنیا میں ان کی قدر ہے۔ طلحہ حسین کسی انجمن میں تقریر کرتے ہیں تو ملک کا نوجوان طبقہ جن کے قبضہ میں کل کو اقتدار کی باگ ہوگی، ہزاروں کی تعداد میں وہاں اٹھ آتا ہے۔ پڑھے لکھوں میں باتیں ہوتی ہیں تو نئے ادب کی اسلوب بیان سراہا جاتا ہے تو نئے لکھنے والوں کا اور داد دی جاتی تو طلحہ حسین، بیگل اور ان کے طرز کے اہل قلم کی۔ اور تو اور خود از ہر کے نوجوان طلبہ اکثر اپنی جمود کی زندگی سے نالاں نظر آتے۔ اور ان میں سے جس کا بھی بس چلتا وہ جبہ و دستار اتار کر ”شیخ“ سے ”آفندی“ بن جاتا اور سوٹ و طربوش پہن کر اپنے آپ کو نئے خیال والوں میں منسلک کر لیتا۔

پرانی عمارتوں کے گرنے اور ان کی جگہ نئی عمارتیں بننے کے درمیانی وقفہ میں عام طور پر ٹوٹ پھوٹ، گرد و غبار اور شور و شر سے ساری فضا مکر ہو جاتی ہے۔ بعینہ یہی حالت اس وقت مصر کی اخلاقی اور اجتماعی زندگی میں رونما تھی۔ اخلاق کی پرانی قیود ایک ایک کر کے ٹوٹ رہی تھیں۔ لیکن چونکہ زندگی کے نئے ضابطے ابھی بننے نہ پائے تھے اس وجہ سے عام زندگی میں عجیب انتشار، بے راہ روی اور ہیجان برپا تھا۔ قدامت پسند اس اخلاقی تباہی کا ذمہ دار تجدید پسندوں کو ٹھہراتے تھے اور تجدید پسند تھے کہ وہ اس راہ میں اور تیز قدم جانے کے لیے بے چین تھے۔

اس میں شک نہیں کہ قدیم و جدید کی اس کش مکش میں نئے خیال والے غالب آ رہے تھے لیکن عام زندگی میں اخلاقی ضابطوں کے ٹوٹنے سے جو عملی نتائج برآمد ہوئے تھے۔ ان کو دیکھ کر تجدید پسند حسن ظن رکھنا بھی مشکل تھا۔ ایک طرف پرانی قدروں کی فرسودگی آنکھوں کو صاف نظر آتی تھی اور دوسری طرف نئی زندگی کے بادیہ پیاؤں کا جو حشر ہو رہا تھا۔ اس کو دیکھ کر بھی ڈر لگتا تھا۔ طبیعت عجیب گوگو میں تھی۔ نہ ادھر قرار ملتا اور نہ ادھر سکون نظر آتا۔ ایک مسلسل ذہنی کوفت، ہر لمحہ اضطراب کی کیفیت نہ کامل یقین اور نہ پورا انکار، تشنگ جو ہر وقت دماغ کو مصروف اور دل کو پریشان رکھے۔ یہ تقریباً چار برس طالب علمانہ زندگی کا حاصل تھا، جو وادی نیل سے لے کر راقم الحروف وطن لوٹا۔

مصر سے واپسی پر جامعہ میں تعلیم کی خدمت سپرد ہوئی۔ یہاں اپنے ایک عزیز دوست کے ساتھ رہنے کا موقع ملا۔ یہ صاحب جامعہ سے فارغ التحصیل ہو کر اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان گئے تھے اور

دامن میں جگہ دیتا اور دوسرے وقت میں اس سے بالکل مخالف خیال دستک دیتا تو دماغ اسے بھی قبول کرنے میں تامل نہ کرتا۔ چنانچہ اس کی وجہ سے نہ فکر میں کوئی تسلسل قائم رہ سکتا اور نہ طبیعت کو سکون نصیب ہوتا۔ اس ذہنی انتشار سے زندگی میں جو تلخی پیدا ہوتی ہے اس کا اندازہ کرنا زیادہ مشکل نہیں۔

خیالات کی ان تنگنائیوں میں بھٹک رہا تھا کہ ۱۹۳۸ء میں شیخ الجامعہ صاحب کا حکم ملا کہ مولانا عبید اللہ سندھی جامعہ کے کسی استاد کو مکہ معظمہ بلا رہے ہیں۔ تم جلدی کرو فوراً روانہ ہو جاؤ۔ حج بھی کر لو گے اور مولانا کی زیارت بھی ہو جائے گی۔

شوق و عقیدت، خوف و طمانیت اور تشنگ و یقین کے ملے جلے جذبات کو لیے ہوئے میں حرم پاک کے جوار میں مولانا کی بارگاہ میں حاضر ہوا۔ میری سعادت کہ شیخ الجامعہ صاحب کا قرعہ قال میرے نام پڑا۔ اور پھر یہ مزید خوش نصیبی کہ مولانا نے مجھے اس لائق سمجھا کہ میں ان کے سامنے زانوئے ادب تہ کر سکوں۔ مولانا نے نہ صرف یہ کیا کہ جو کچھ میں جانتا تھا۔ اسے پھر سے سمجھایا اور اس جاننے کی وجہ سے ذہن میں جو گرہیں پڑ گئی تھیں، انہیں کھولا۔ بلکہ آپ نے علم کی ان بے کنار و سعوتوں کی طرف بھی توجہ دلائی جن کی حامل ان کی ذات اقدس تھی۔

مولانا کی شخصیت اور ان کے مبلغ علم و فکر کے ایک کونہ کا یہ دھندلا سا خاکہ ہے جو میں اس کتاب میں پیش کر سکا ہوں۔ میرا محدود علم ابھی اس قابل نہیں کہ اس عظیم المرتبت شخصیت سے اہل ملک کو کما حقہ واقف کر سکتا۔ خدا نے توفیق دی اور مجھے مزید مطالعہ کا موقع ملا تو انشاء اللہ مولانا کی شخصیت اور ان کے پیام کے متعلق مستقبل میں زیادہ قابلیت اور بہتر صلاحیت کے ساتھ کچھ اور لکھنے کی کوشش کروں گا۔

محمد سرور

حالات زندگی

۱۰ مارچ ۱۸۷۲ء کو پنجاب کے ضلع سیالکوٹ میں ایک سکھ گھرانے میں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ لڑکے کی پیدائش سے پہلے ہی باپ کا انتقال ہو چکا تھا۔ بیوہ ماں نے خدا کا بہت بہت شکر ادا کیا کہ بیوگی کا سہارا مل گیا۔ بہنوں کی خوشی کی کوئی حد نہ تھی کہ خدا نے انہیں بھائی دیا۔ ماسوں نے اطمینان کا سانس لیا کہ جوان بہن کا اجڑا ہوا گھر پھر آباد ہو گیا۔ یہ بچہ گھر کا بڑا لڑکا تھا۔ ماں نے بڑے نازوں سے اسے پالا، بہنیں تھیں کہ ننھے بھائی پر قربان ہو جاتی تھیں۔ اس محبت بھری فضا میں اس بچے نے آنکھیں کھولیں۔ ماموں جام پور ضلع ڈیرہ غازی خاں میں پٹواری تھے۔ بچے نے کچھ ہوش سنبھالا تو ماموں نے وہیں کسی اسکول میں داخل کر دیا۔

ضلع ڈیرہ غازی خاں یوں تو پنجاب کے صوبہ میں ہے لیکن اس کی حدیں سندھ اور صوبہ سرحد سے ملتی ہوئی ہیں۔ آبادی بیشتر مسلمانوں کی ہے۔ اس علاقہ میں پیروں اور فقیروں کی بڑی قدر ہے اور عوام و خواص دونوں کو تصوف سے بڑا لگاؤ ہے۔ صدیوں سے اس سرزمین میں بڑے بڑے صوفیاء اور اہل اللہ پیدا ہوتے رہے اور ان کی باتیں اور یادگاریں ہر طرف سننے اور دیکھنے میں آتی ہیں۔ یہ ماحول تھا جس میں اس لڑکے کے دس بارہ سال گزرے۔ دوسری طرف گھر کے چھوٹے بڑے سب سکھ تھے۔ سکھ مذہب کی ابتدا بابا گورو ناک سے ہوئی ہے۔ بابا جی خود درویش تھے اور ان کی تعلیمات مسلمان صوفیوں سے بہت ملتی جلتی ہیں۔ بعد میں سکھ مذہب نے جو شکل اختیار کی وہ بالکل دوسری ہے اور زیادہ تر وہ نتیجہ تھی اس زمانے کے سیاسی حالات کا۔ بہر حال سکھ گھرانوں کو اسلام اور تصوف کے اصل اصولوں سے زیادہ بعد نہیں۔ مذہب کی نمائش رسوم سے بیزاری خدا کو ایک ماننا سب مخلوق کو برابر جاننا اچھے کاموں ہی کو اصل نیکی سمجھنا یہ بنیادی باتیں ہیں۔ گرو ناک کی تعلیم کی۔ ظاہر ہے اس سکھ لڑکے کا اپنے ارد گرد کے مسلمانوں سے ملنے جلنے میں پرہیز نہ کرنا کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ آخر اس کا مسلمانوں سے میل جول بڑھا دوسرے مذہب والوں سے عموماً جو کدروت ہوتی ہے وہ آہستہ آہستہ دور ہوتی گئی اور اس لڑکے کو مسلمانوں کی زندگی کا بہت قریب سے مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔

اس لڑکے نے محسوس کیا کہ جن چیزوں کو میں دل سے ٹھیک سمجھتا ہوں۔ اور میری عقل ان پر

پورا یقین رکھتی ہے وہ چیزیں ہندوؤں اور سکھوں کے مذہبی طور طریقوں سے زیادہ اسلام میں ہیں۔ یہ اس کا اپنا مشاہدہ تھا۔ کسی مولوی نے اسے دلیل سے قائل نہ کیا تھا اور نہ کسی بزرگ کی سنی سنائی بات پر اس نے یقین کر لیا تھا۔ اس لڑکے نے دیکھا کہ سکھ بھی خدا کو ایک مانتے ہیں اور مسلمان بھی خدا کو ایک ہی مانتے ہیں لیکن اسلام کا ایک خدا کا تصور سکھوں سے بلند تر ہے۔ مساوات انسانی دونوں مذہبوں میں موجود ہے لیکن اسلام نے مساوات کو جس طرح عملی شکل دی ہے وہ سکھوں سے ارفع ہے۔ مذہب کی نمائندگی رسوم سے دونوں مذہبوں کو نفرت ہے لیکن اس نے محسوس کیا کہ سکھ مذہب نے اپنے آپ کو ان رسوم میں بری طرح مقید کر لیا ہے۔

اس چھوٹے لڑکے کے دل میں یہ خیالات اٹھتے رہے وہ سوچتا اور غور کرتا اور معلوم نہیں کتنی راتیں اس نے اس سوچ میں جاگ جاگ کر کاٹیں اور ہفتوں نہیں مہینوں وہ اسی ادھیڑ بن میں رہا کہ وہ مذہب جس کو اس کی ماں بہنیں ماموں دل سے سچا مانتے ہیں اور اس کی سیوا ان کو سب سے زیادہ عزیز ہے وہ سچا نہیں۔ بلکہ اسلام جو غیروں کا مذہب ہے یہ غیر نہ اس کے رشتہ دار ہیں۔ اس کی اور ان کی کوئی بات ایک سی نہیں۔ ان میں سے کسی نے اس کی پرورش نہیں کی۔ کسی نے ماں اور بہن کی طرح جان اور دل اس پر نچھاور نہیں کیا۔ لیکن ان غیروں کا مذہب سچا ہے۔ اس کی حقانیت خود بخود دل میں اترتی جاتی ہے ان کے طور طریقوں کو دل مانتا ہے اور عقل قبول کرتی ہے۔ اب وہ کرے تو کیا کرے۔ ایک طرف وہ ہے جس کے جگر کا وہ ٹکڑا ہے۔ ماں نے معلوم نہیں کن کن امیدوں کے ساتھ اپنا خون پلا پلا کر اسے پروان چڑھایا ہے۔ بہنیں ہیں جو اسے ”ویرویر“ کہتی تھکتی نہیں۔ اب اگر وہ اپنے دل اور دماغ کا کہا مانتا ہے تو ماں کو چھوڑنا پڑتا ہے، بہنوں کو چھوڑنا پڑتا ہے، ماموں سے الگ ہونا پڑتا ہے۔ سارے خاندان سے جدائی ہوتی ہے۔ آخر ہو کیا؟ وہ برابر سوچتا رہا۔ کوئی حل ایسا نظر نہ آتا تھا کہ وہ دل کی بات بھی مان لے اور اپنوں سے قطع تعلق بھی نہ ہو۔ وہ مہینوں اس چکر میں سرگرداں رہا۔ آخر فیصلہ کرنا ہی پڑا۔

ایک دن چپ چاپتے یہ لڑکا گھر سے نکل گیا۔ نہ ماں کو اطلاع دی اور نہ ماموں کو خبر ہوئی۔ چلتے چلتے یہ بہت دور نکل گیا اسے ڈر تھا کہ کہیں تعاقب نہ ہو راستہ میں اسے ماں کی مامتا یاد آتی تھی۔ بہنوں کی محبت بھی پیچھے کی طرف کھینچتی تھی لیکن یہ لڑکا برابر آگے بڑھتا گیا۔ اس کے جی میں جو بات سمائی تھی وہ کسی محبت اور کسی قیمت پر اسے چھوڑنے کو تیار نہ تھا۔ آخر چلتے چلتے وہ صوبہ سندھ میں داخل ہو گیا اور وہاں ایک خدا شناس بزرگ کے دست مبارک پر اس نے اسلام قبول کیا۔ یاد دوسرے لفظوں میں اس لڑکے نے اپنی بات خود اپنے آپ سے منوالی۔ یہ جدوجہد بہت کٹھن تھی لیکن یہ عزم بڑی ہمت والے کا عزم تھا۔ اپنی بات سے پھر جانا اس کے نزدیک زندگی سے منہ موڑنا تھا۔ آخر زندگی ہے کیا؟..... رشتہ

داروں کی محبت، گھر کا آرام یا ایک عقیدہ اور اس کے لیے جدوجہد۔ اس طرح اس لڑکے نے سب کچھ کھو کر اپنے آپ کو پالیا۔ اپنی بات خود اپنے آپ سے منوا کر چھوڑی، پرانا نام چھوڑا، اور عبید اللہ کہلایا۔ کہنے کو تو یہ کہا جائے گا کہ ایک سکھ لڑکے نے اپنا مذہب بدل دیا اور سکھ سے مسلمان ہو گیا۔ کہنے کے لیے یہ بات ہے تو ٹھیک، لیکن کیا ہم اسے یوں نہیں کہہ سکتے کہ اس لڑکے کو قدرت کی طرف سے ایسی طبیعت عطا ہوئی تھی جو تمام مذاہب کی اصل غایت یعنی خدا شناسی تک پہنچنے کے لیے بیتاب تھی۔ سکھ سماج اس بیتاب طبیعت کی تسلی نہ کر سکا۔ اس لڑکے نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور مسلمانوں کی سوسائٹی میں اپنے لیے خدا شناسی کی راہ ڈھونڈی۔ یعنی اس کی روح پر سکھ سماج کا لباس تنگ تھا۔ وہ لباس اس نے اتار پھینکا اور اسلام کا لباس جو اس کی نظر میں کشادہ اور وسیع تھا، پہن لیا۔ اب یہ سکھ لڑکا مولوی عبید اللہ بنتا ہے اور سندھ میں اپنے پیرو مرشد سے تصوف اور طریقت کی ابتدائی منزلیں طے کرتا ہے۔ اس کی طبیعت کو اطمینان حاصل ہوتا ہے اور جس چیز کے لیے اس نے ماں بہن اور عزیز چھوڑے تھے وہ اسے مل جاتی ہے۔

پچیس برس کی عمر میں سندھ سے مولوی عبید اللہ سندھی دینی تعلیم کی خاطر دیوبند آتے ہیں۔ یہاں انہیں مولانا محمود حسن جیسا استاد ملتا ہے جو شاگرد کی رہنمائی اس اسلوب سے کرتا ہے کہ شاگرد کی ذات اپنی تکمیل کی راہ میں کسی قسم کی کوئی روک محسوس نہیں کرتی۔ استاد کامل تھا۔ شاگرد کو اپنے ساتھ کمال کی منزل پر لے جاسکا۔ ورنہ بعید نہ تھا کہ جو شخص دلی تسکین نہ پا کر اپنی ماں اور عزیز رشتہ داروں سے منہ موڑ سکتا ہے وہ استاد کی رہنمائی سے سرتابی نہ کرتا۔ مولوی عبید اللہ نے دیوبند میں تمام اسلامی علوم پر عبور حاصل کیا۔ عربی زبان پڑھی تاکہ قرآن سمجھیں تفسیر اور حدیث کا مطالعہ کیا۔ فقہ پڑھی، منطق اور فلسفہ میں درک پیدا کیا۔ ان کی طبیعت دارالعلوم دیوبند میں جم گئی اور اس تعلیم اور مطالعہ نے انہیں پکا مسلمان بنا دیا۔ انہیں اس امر کا یقین ہو گیا کہ خدا تک پہنچنے کا یہ راستہ سب سے سیدھا اور یقینی ہے۔

دیوبند سے فارغ التحصیل ہو کر مولانا عبید اللہ سندھ لوٹے اور چھ سات برس تک جو کچھ پڑھا تھا، طالب علموں کو پڑھاتے رہے۔ مولانا نے اپنا ایک مدرسہ بھی قائم کیا۔ طلبہ کو جمع کیا ان کی کفالت اور مدرسین کے گزارے کا بار بھی خود اٹھایا اور جس گوہر مقصد کو انہوں نے اتنی محنت اور مصیبت کے بعد حاصل کیا تھا، ہر خاص و عام کو اس سے روشناس کرتے رہے۔ ایک مدت کے بعد مشفق استاد نے اپنے ہونہار شاگرد کو دیوبند بلوا بھیجا اور مدرسہ کے پرانے طلبہ کی تنظیم کا کام ان کے سپرد ہوا۔ مولانا عبید اللہ دیوبندی ضرور تھے لیکن دیوبندیت کے ظاہری رنگ و روپ اور شکل و صورت کے تو وہ کبھی قائل نہ تھے۔ وہ تو دیوبندی روح کے ماننے والے تھے جو شاہ ولی اللہ سے مشائخ دیوبند نے حاصل کی تھی اور مولانا محمد

قاسم پانی مدرسہ جس کے مبلغ تھے اور مولانا محمود حسن نے ظواہر اور رسوم کے تمام پردے ہٹا کر اپنے عزیز شاگرد کو اسی روح کا جلوہ دکھایا تھا جس سے مولانا عبید اللہ کو سکون ملا تھا۔ دیوبند میں رہتے ہوئے مولانا کی مسلمانوں کے سماج سے نکر ہوتی ہے اور جس طرح سکھ سماج کا دائرہ مولانا کے لیے تنگ ثابت ہوا مسلمانوں کے خود ساختہ سماج نے بھی جسے وہ اسلام کا نام دیتے تھے اسی طرح مولانا نے اپنے دروازے بند کر دیئے اور مشائخ دیوبند کے ایک حصہ کی بارگاہ سے مولانا کو ”کافر“ کا لقب ملا۔ خوش قسمتی سے اس وقت تک مولانا اسلام کی اصل حقیقت سے آگاہ ہو چکے تھے۔ اور وہ جان گئے تھے کہ اسلام وہ نہیں جس کے ٹھیکیدار یہ لوگ بنتے ہیں۔ چنانچہ ان کے کفر کے فتوے کے بعد مولانا کو اپنے مسلمان ہونے کا اور زیادہ یقین ہو گیا۔

دیوبند سے مولانا عبید اللہ دہلی آگئے اور پہلے کے بنے ہوئے اسلامی سماج کے خلاف قرآن کے بتائے ہوئے اصولوں پر اسلامی سماج بنانے کی طرح ڈالی۔ نظارۃ المعارف دہلی کے مدرسہ کی تاسیس کا مقصد یہی تھا۔ مولانا نے سمجھ لیا تھا کہ خدا شناسی کا سب سے اچھا طریقہ اسلام ہی ہے۔ گو مسلمانوں نے اس کی حقیقت بگاڑ رکھی ہے۔ لیکن اس طریقہ کا دستور اب تک اپنی اصلی شکل میں موجود ہے یہ دستور قرآن کریم ہے۔ مولانا نے خدا کا نام لے کر اپنا کام شروع کر دیا۔ لیکن ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم کی وجہ سے اور دوسری اہم ضرورتوں کی طرف انہیں مجبوراً متوجہ ہونا پڑا۔

اس وقت ہندوستانی مسلمانوں کی ساری امیدیں ترکی کی خلافت سے وابستہ تھیں۔ اور انگریز تھے کہ انہوں نے ترکوں کے خلاف جنگ چھیڑ دی تھی۔ ہندوستان کے مسلمان زعماء اپنے ترک بھائیوں کی مدد کرنا چاہتے تھے۔ مولانا عبید اللہ کو اپنے استاد کا حکم ملا کہ وہ کابل روانہ ہو جائیں۔ سنا ہے مولانا کابل جانے کے لیے آمادہ نہ تھے۔ لیکن استاد کے حکم کی سرتابی بھی گوارا نہ تھی۔ بوڑھی سکھ ماں کو جس کی زندگی کا سہارا اس کا صرف یہ مسلمان لڑکا تھا۔ اللہ پر چھوڑا اور ۱۹۱۵ء میں بڑی دقتوں سے کابل پہنچ گئے۔

افغانستان پر اس زمانے میں امیر حبیب اللہ خاں کی حکومت تھی۔ امیر موصوف ایک حد تک دولت برطانیہ کے زیر اثر تھے اور خاص طور پر سلطنت کے خارجی معاملات میں وہ معاہدہ کی رو سے پابند تھے کہ کوئی قدم برطانیہ کے صلاح مشورے کے بغیر نہ اٹھائیں اور ہندوستان سے مولانا عبید اللہ ایک واضح اور متعین مقصد کے پیش نظر گئے تھے۔ اس زمانہ میں ہندوستان سے نکلے ہوئے بعض اور لوگ بھی کابل پہنچ گئے تھے۔ نیز عثمانی سلطنت اور جرمنی کی طرف سے بھی چند نمائندے امیر حبیب اللہ خاں کے پاس آئے تھے ان سب کی کوشش یہ تھی کہ افغان انگریزوں سے بھڑ جائیں۔ امیر موصوف بظاہر تو ان

سب سے اچھی طرح پیش آئے لیکن انہوں نے برطانیہ سے بگاڑنا مصلحت کے خلاف سمجھا۔ افغانی سیاست کا یہ دور بڑا پُر آشوب تھا۔ ایک طرف کابل میں برطانوی اور روسی مدد برپا تھی اور دوسری طرف ان کے دشمن تھے کہ امیر حبیب اللہ خاں کو ہندوستان پر حملہ کرنے پر اکساتے تھے۔

ان دنوں کابل ایشیا کا سوئزر لینڈ بنا ہوا تھا اور یہاں ہر سلطنت کے مدبر اور سیاست دان ایک دوسرے کے خلاف جوڑ توڑ کرنے میں مصروف تھے۔ مولانا نے بین الاقوامی سیاسیات کی اس کش مکش کو دیکھا اور صرف دیکھا نہیں بلکہ اس میں بطور ایک اہم فرد کے شریک بھی رہے۔ آپ نے کابل میں امیر حبیب اللہ کی حکومت کا بھی غور سے مطالعہ کیا اور استبدادی سلطنتوں کو اندر ہی اندر جو گھن کھا رہا تھا وہ آپ کی آنکھوں نے صاف صاف دیکھ لیا۔

مولانا عالمگیر اخوت اسلامی کے جذبہ کے ماتحت وطن سے نکلے تھے۔ اور اس وقت ان کا اور ان کے ساتھیوں کا یہ خیال تھا کہ جان پر کھیل کر بھی خلافت عثمانیہ کو بچانے کی کوشش کی جائے۔ مولانا نے یہاں آ کر دیکھا کہ ہر اسلامی ملک کی اپنی خاص ضرورتیں ہیں اور وہاں کے لوگ مجبور ہیں کہ اپنی قومی ضرورتوں کو مقدم رکھیں۔ اسی سلسلہ میں آپ کو اس بات کا بھی علم ہوا کہ ہر شخص کو اپنے وطن سے اپنی زمین سے اور اپنی مخصوص روایات سے کتنی شینگی اور وابستگی ہوتی ہے۔ اور افغان اور ہندوستانی مسلمان ہونے کے باوجود دونوں اپنا الگ الگ قومی وجود رکھتے ہیں۔ ایک افغان کو یہ گوارا نہیں کہ ایک ہندوستانی کے ماتحت کام کرے۔ اسی طرح ہندوستانی کو بھی افغان کی سرداری کھلتی ہے۔ ہمارے خیال میں پہلی ٹکر تھی جو مولانا کے ”ما فوق قومی“ تصور کو لگی اور آپ نے محسوس کیا کہ قوم کا وجود ایک مستقل حقیقت ہے۔ مولانا آج کل ہندوستانی پر جو زیادہ زور دیتے ہیں اور بین الاقوامیت کی بنیاد مستقل قومی وحدتوں پر رکھنا چاہتے ہیں اور ہندوستانی مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ جب تک تم ہندوستانی نہ بنو گے نہ تمہاری اپنے ملک میں عزت ہوگی اور نہ اسلامی ملکوں میں تمہیں احترام کی نظروں سے دیکھا جائے گا۔ کابل کی زندگی کے یہ چند سال مولانا کے ان افکار کو سمجھنے میں بڑی مدد دے سکتے ہیں۔

مولانا کابل ہی میں تھے کہ جنگ عظیم کا فیصلہ ہو گیا۔ جرمنی نے ہارمان لی۔ اور ترکی خلیفہ فتح مند اتحادیوں کا امیر ہو گیا۔ مولانا ترکی کی خلافت کو بچانے وطن سے نکلے تھے۔ اب انہوں نے دیکھا کہ وہ خلافت تقریباً ختم ہو گئی ہے اور اخوت اسلامی کا برائے نام رہا سہا جو مرکز تھا وہ بھی باقی نہیں رہا۔ ہندوستانی مسلمانوں کی سیاست کا وہ دور جو بلقان اور طرابلس کے ہنگاموں سے شروع ہوا۔ اور جس کے پیش نظر ترکی خلافت کے استحکام سے ہندوستان میں اپنے اسلامی وجود کو باوقار بنانا تھا اب ترکی خلافت

کی شکست کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔ ہندوستان میں اس کے بعد اسلامی سیاست کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ مولانا محمود مالٹا کی اسیری کے بعد جب ہندوستان لوٹے تو کانگریس میں شریک ہو گئے اور ان کی جماعت کے دوسرے بزرگ مثلاً مولانا محمد علی، ڈاکٹر انصاری، مولانا شوکت علی اور مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ نے بھی کانگریس میں شرکت کی۔ اسی زمانہ میں کابل میں بھی کانگریس کمیٹی کی ایک شاخ کھولی گئی اور مولانا عبید اللہ اس کے صدر بنے۔

مولانا کا بیان ہے کہ دوران قیام کابل میں امیر حبیب اللہ خاں کے حکم یا مشورہ پر میں انڈین نیشنل کانگریس میں شامل ہوا۔ اس وقت کابل میں بعض انقلابی ہندو بھی موجود تھے۔ امیر صاحب چاہتے تھے کہ ہندوستان کے مسلمان ہندوؤں کے ساتھ مل کر سیاسی کام کریں۔ بد قسمتی سے ہمارے اکثر مسلمان زعماء کو اب تک ہندوستان کی اسلامی سیاست کے اس نئے دور کا صحیح اندازہ نہیں ہوا۔ وہ اب تک بین الاصلہ مہم کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ لیکن مولانا نے افغانستان میں رہتے ہوئے دیکھ لیا تھا کہ اب مصلحت کا تقاضا کیا ہے اور مسلمانوں کی سیاست کا رخ کیا ہونا چاہیے۔

اسی زمانہ میں افغانستان میں بھی ایک انقلاب رونما ہوا۔ امیر حبیب اللہ خاں اپنے سرمائی پایہ تخت جلال آباد میں کسی نامعلوم قاتل کی گولی کا نشانہ بنے ان کے بعد ان کا بھائی نصر اللہ تخت کا وارث بن کر اٹھا۔ لیکن تقدیر نے مرحوم کے ایک بھٹلے صاحبزادہ کی سازگاری کی اور وہ امیر افغانستان بن گیا۔ امیر امان اللہ خاں نے برسر اقتدار آتے ہی ہندوستان پر حملہ کر دیا۔ ایک مختصر سی لڑائی کے بعد دونوں حکومتوں میں صلح ہو گئی۔ امیر امان اللہ خاں ہر میسٹی امان اللہ خاں بن گئے۔ افغانستان امارت سے دولت مستقلہ کے بلند مقام پر پہنچ گیا اور خارجی اور داخلی ہر لحاظ سے ہندوستان کی یہ ہمسایہ سلطنت آزاد ہو گئی۔

امیر حبیب اللہ خاں کے زمانہ حکومت کے بعد مولانا نے اعلیٰ حضرت امان اللہ خاں کا دور بھی دیکھا۔ معلوم نہیں کیا وجوہ تھے کہ مولانا نے ۱۹۲۲ء میں افغانستان چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ کابل سے مولانا روس تشریف لے گئے اور کم و بیش ایک سال آپ کا روس کا سفر اور ماسکو کے قیام میں گزرا۔ ماسکو سے ۱۹۲۳ء میں آپ ترکی چلے آئے۔

مولانا روس انڈین کانگریس کے ایک رکن کی حیثیت سے گئے۔ اس وقت لینن ابھی زندہ تھا۔ زار کا روس ختم ہو چکا تھا اور اس کی جگہ نیا اشتراکی روس بن رہا تھا۔ مولانا نے روس میں اشتراکی انقلاب کے کارکنوں کو سرگرم عمل دیکھا۔ ان کے ولولے، ہمتیں، قربانیاں، جفاکشیاں اور عزت دولت اور منصب پانے کے خیال سے نہیں بلکہ ایک اعلیٰ مقصد کے لیے خوشی خوشی جانیں دینا ایسی باتیں نہ تھیں کہ مولانا دیکھتے اور متاثر نہ ہوتے۔ ماسکو میں مولانا کا قیام تقریباً ایک برس تک رہا۔ افغانستان کے دوران

قیام میں آپ نے علماء کی تنگ خیالی اور اسلامی حکومت کی گراؤ کے بہت سے مناظر دیکھے تھے اور انہیں اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ علم و مذہب اور دولت و حشمت کے یہ سب بے جان لاشے ہیں۔ اس کے بعد مولانا روس آئے تو انہوں نے بالکل نئی بنیادوں پر ایک نئے عالم کو تعمیر ہوتے دیکھا۔ آپ ان معماروں کی اولوالعزمی اور بلند خیالی سے متاثر بھی ہوئے لیکن اس کے باوجود آپ کی اسلام کے ساتھ شیفتگی کم نہ ہوئی۔ نیا روس بالکل لادینی تھا اور مولانا بچے دیندار، لیکن مولانا کی دینداری نے انقلابیوں کی اس لادینی میں بھی صحیح دینی جذبہ کو سرگرم عمل پایا۔ مولانا ماسکو میں بہت سے اشتراکی لیڈروں سے ملے۔ آپ کو اشتراکیت کے مبادی و اصول کے مطالعہ کا بھی موقع ملا۔ آپ نے کھلے دل سے روسی انقلاب کی ہر اچھی چیز کو سراہا۔ اور انقلاب برپا کرنے والوں کی معجزانہ قوتوں کو تسلیم کیا لیکن اس کے باوجود آپ مسلمان ہی رہے اور اسلام روسی انقلاب کی ان ساری بلندیوں سے بھی انہیں بلند تر نظر آیا۔

مولانا کی طبیعت ایسی ہے کہ جس بات کو وہ دل سے مان لیں، کوئی امر اس کے اظہار میں ان کو مانع نہیں ہو سکتا۔ کوئی روک جو ان کے آگے قدم بڑھانے میں حائل ہو، مولانا اس روک کو کبھی برداشت نہیں کر سکتے یہ روک کسی کے نام سے ہو، مذہب کے نام سے ہو، کسی بزرگ کے نام سے ہو۔ مولانا کی طبیعت اس کے خلاف بغاوت کرتی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر ان کو اسلام کا انقلاب روس کے انقلاب سے کم تر نظر آتا تو وہ بے کھلے اشتراکیت کو قبول کر لیتے۔ لیکن تعجب یہ ہے کہ مولانا ایسی انقلابی طبیعت اور ماسکو کا انقلابی ماحول، پھر بھی مولانا اسلام سے روگرداں نہ ہو سکے۔ لیکن یہ یاد رہے کہ یہ اسلام جو انہیں روس کے انقلاب سے بھی بلند تر نظر آیا تھا، وہ اسلام نہ تھا جس کے عملی نمونے آپ نے ہندوستان اور افغانستان میں دیکھے تھے۔ چنانچہ اب ان کے دل و دماغ میں نام نہاد ”اسلامی سماج“ اور مستبد مسلمان بادشاہوں کی ”اسلامی حکومتوں“ کے لیے مطلق کوئی جگہ نہ رہی تھی۔ انہیں ان کے متعلق شک پہلے ہی تھا۔ لیکن ان کے باطل ہونے کا یقین مولانا کو روس کے سفر میں حاصل ہوا۔

ماسکو سے مولانا ترکی آئے۔ اس وقت مصطفیٰ کمال ترکی کو کمالی ترکی بنا رہے تھے۔ خلافت منسوخ کی جا چکی تھی۔ شرعی قانون کی جگہ سوشل لیڈ کے قانون نے لے لی تھی۔ ترکی ٹوپی ممنوع قرار دی جا چکی تھی۔ شیخ الاسلام کو ترکی سے رخصت کر دیا گیا تھا۔ اوقاف ضبط اور مذہبی مدرسے حکماً بند کر دیئے گئے تھے۔ ترکی زبان عربی حروف کے بجائے لاطینی حروف میں زبردستی لکھوائی جاتی تھی۔ الغرض پرانی زندگی کا ہر رنگ مٹایا جا رہا تھا۔ ایک نئی ترکی بن رہی تھی اور ترک نیا جنم لے رہے تھے۔

مولانا ساڑھے تین سال تک ان سب انقلابات کو اپنی آنکھوں کے سامنے ہوتا دیکھتے رہے۔ ان کے دل پر جو کچھ گزری ہم نہیں جانتے۔ لیکن مولانا عبید اللہ ایسی طبیعت والے انسان پر اس

قسم کے شدید حادثات کا جو اثر ہو سکتا ہے اس کا اندازہ کرنا زیادہ مشکل نہیں۔ مولانا ان لوگوں میں سے نہیں ہیں کہ جو اپنی پسند کی چیز نہ دیکھیں تو آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور اپنے دل کو یہ ڈھارس دے لیتے ہیں کہ اگر ہم اس چیز کو نہیں دیکھ رہے ہیں تو وہ چیز سرے سے موجود ہی نہیں۔ مولانا اپنی آنکھیں ہمیشہ کھلی رکھتے ہیں اور اپنے دل و دماغ پر کسی قسم کی مہر لگانے کے روادار نہیں۔ چنانچہ مولانا نے روسی انقلاب اور ترکی انقلاب کو خوب دیکھا اور ان دنوں انقلابات کے تجربات کو دل میں لیے وہ اسلام کے اصلی مرکز میں پہنچے۔

ترکی سے مولانا نے سرزمین حجاز کا رخ کیا۔ حجاز آتے آتے اٹلی اور سوئٹزر لینڈ کی سیاحت بھی ہو جاتی ہے۔ حجاز آئے تو ابن سعود کی حکومت قائم ہو چکی تھی۔ دس بارہ سال تک مولانا حجاز میں مقیم رہے اور ابن سعود کی خالص "اسلامی حکومت" کا نہایت قریب سے مطالعہ کرتے رہے۔

مولانا فرماتے ہیں کہ میں نے حجاز پہنچ کر وہاں کی حکومت سے ایک انڈین کانگریس کے رکن کی حیثیت سے اپنا تعارف کرایا۔ اس سے یہ ہوا کہ حجاز کے معاملہ میں ہندوستانی مسلمانوں کے اس وقت جو دو گروہ بن گئے تھے میں اس سے بے تعلق اور غیر جانبدار تسلیم کر لیا گیا اور مجھے ارض مقدسہ میں رہنے کی اجازت مل گئی۔ مولانا کا یہ سارا زمانہ درس و تدریس میں صرف ہوا۔ آپ کو بعض ہندوستانی اور عرب احباب سے کتابیں مل جاتیں آپ یا تو مطالعہ کرتے یا جاوی اور ہندوستانی طلباء کو پڑھایا کرتے۔ ان دس بارہ برسوں میں آپ نے شاہ ولی اللہ کی تصنیفات کو بالاستیعاب بار بار پڑھا اور ہندوستان کی اسلامی تاریخ اور مسلمانوں کی تیرہ سو سال کی تاریخ پر تنقیدی نظر ڈالی۔

حجاز کے زمانہ قیام میں مولانا سیاسی سرگرمیوں سے بالکل دور رہے۔ اور آپ نے سارا وقت مطالعہ و تدریس میں گزارا۔ جب کبھی کسی کو مولانا کے مکان پر جانے کا اتفاق ہوتا تو وہ آپ کا کمرہ کتابوں سے بھرا ہوا پاتا۔ ایک طرف مصر کی تازہ بتازہ اور نو بنوعربی تصنیفات نظر آتیں۔ دوسری طرف اردو کی نئی مطبوعات اور تازہ رسالے پڑے ہوتے اور شاہ ولی اللہ اور ان کے خانوادہ علم کی کتابیں تو سب سے نمایاں جگہ پر ہوتیں۔

حجاز میں مولانا نے دس بارہ سال کا طویل زمانہ گزارا۔ اور اس عزلت میں وہ اپنی گزشتہ زندگی اور اس کے تجربات کا برابر جائزہ لیتے رہے۔ اس زمانہ میں انہوں نے اپنے افکار بھی مرتب کیے اور چونکہ ان افکار کی افادیت اور صداقت کو وہ عملی دنیا میں کامیاب ہوتا دیکھ چکے تھے۔ اس لیے ان کے سچے ہونے پر ان کو غیر متزلزل یقین تھا۔ مولانا چاہتے تھے کہ اپنی اس بصیرت کو عام کریں اور طویل تجربوں کے بعد جو کچھ انہوں نے سیکھا ہے اسے دوسروں کو بھی سکھائیں۔ لیکن حجاز والے نہ ان کی باتیں

سمجھ سکتے تھے اور نہ انہیں ان کی ضرورت تھی۔ ان افکار و خیالات سے صرف مولانا کے اہل وطن ہی فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ اس لیے جب انہیں واپس آنے کا موقع ملا تو انہوں نے حکومت کی وہ تمام قیود و شرائط مان لیں جن کو مانے بغیر ان کا ہندوستان آنا مشکل تھا۔ مولانا زندگی کے آخری دنوں میں صرف اسی غرض سے وطن آئے ہیں کہ اپنے اہل وطن کے سامنے اپنے چوبیس برس کے تجربات کا حاصل پیش کریں۔

۷ مارچ ۱۹۳۹ء کو مولانا کراچی کے ساحل پر اترے اور آپ نے اترتے ہی اپنے خیالات کی اشاعت شروع کر دی۔ مولانا نے عزم و استقلال کے ساتھ اپنے وطن لوٹے ہیں۔ چوبیس برس کا جلا وطنی کا زمانہ جو بقول ان کے پیہم خطرات کا سامنا کرتے گزرا اور اس طویل مدت میں شاید ہی ان کی ایک رات کبھی اطمینان سے کٹی ہو۔ مولانا بے تاب ہیں کہ اس طویل مدت میں جو جو باتیں ابھرا بھر کر ان کے دل کے اندر ہی اندر دبی رہیں۔ انہیں بے محابا کھلے بندوں سب کو سنائیں۔ مولانا کی یہ باتیں بعض لوگوں کو بڑی تلخ گزرتی ہیں لیکن وہ جانتے نہیں کہ مولانا نے جو حقائق دیکھے ہیں وہ کتنے تلخ ہیں اور ان تلخ حقائق کا جاننا ہندوستان والوں کے لیے کتنا ضروری ہے۔

مولانا کہتے ہیں کہ یہ گھروندے جو تم نے بنا رکھے ہیں اور انہیں تم فلک الافلاک سے بلند سمجھتے ہو یہ گھروندے زمانہ کے ہاتھ سے اب بچ نہیں سکتے۔ تمہارا تمدن، تمہارا سماج، تمہارے افکار، تمہاری سیاست اور تمہاری معاشرت سب کھو چکی ہے۔ تم اسے اسلامی تمدن کہتے ہو۔ لیکن اس تمدن میں اسلام کا کہیں شائبہ بھی نہیں۔ تم مذہب کا نام لیتے ہو لیکن یہ مذہب محض تمہاری ہٹ دھرمی کا نام ہے۔ مسلمان بنتے ہو تو اسلام کو سمجھو۔ یہ اسلام جسے تم اسلام کہتے ہو یہ تو کفر سے بھی بدتر ہے تمہارے امیر جاہ پرست ہیں۔ حکمران شہوات میں پڑے ہیں اور غریب طبقے تو ہمت کا شکار ہو رہے ہیں۔ بدلو۔ ورنہ زمانہ تمہارا نشان تک بھی نہ چھوڑے گا۔ سنبھلو ورنہ مٹا دیے جاؤ گے۔

مولانا جو کچھ کہتے ہیں۔ یہ ان کے محض نظریے نہیں ہیں۔ انہوں نے "مقدس سماجوں" "خدائی نظاموں" اور "الہی حکومتوں" کو ٹوٹتے دیکھا ہے اور ان کا کہنا یہ ہے کہ یہ سماج، نظام اور حکومتیں مقدس اور الہی نہ تھیں۔ ان ناموں سے لوگوں نے اللہ کی مخلوق کو لوٹا اور اپنے شخصی اقتدار کے لیے مذہب کی آڑ لی۔ سلطان عبدالحمید "ظل اللہ" کہلواتا تھا۔ معزول ہوا اور آج اس کا خاندان در بدر پھر رہا ہے۔ امیر خلیف اللہ خاں اپنے ہی وطن والوں کے ہاتھ سے قتل ہوا۔ زار کا جو انجام ہوا سب جانتے ہیں۔ بد قسمتی سے ہندوستان والے اب تک شیشے کے کمروں میں بند ہیں۔ اس لیے یہاں "مقدس" "خدائی" اور "الہی" القاب سے خلق خدا کو گمراہ کیا جا رہا ہے لیکن اب زمانہ بدل چکا ہے۔ انقلاب کی گھڑی قریب آ گئی ہے۔ ان ناموں سے دنیا کو دھوکا نہ دو۔ نفس پرستی کو خدا پرستی نہ کہو۔ تمہارا یہ کھوکھلا سماج اور بے روح

تہن چند دن کا مہمان ہے۔ اس کو خود بدل لو تو بہتر ہے۔ ورنہ زمانہ کار یلا اسے بدل دے گا اور اس وقت تم کہیں نظر نہ آؤ گے۔ مولانا کی ان باتوں سے اکثر لوگ سیخ پا ہو جاتے ہیں اور ان کو برا بھلا کہنے سے بھی نہیں جھکتے۔ یہ لوگ جانتے نہیں کہ ان کے ارد گرد دور و نزدیک کتنے بڑے بڑے طوفان اٹھ رہے ہیں۔ جن کے سامنے طوفان نوح کی بھی کوئی حیثیت نہیں۔ مولانا کی دور رس نگاہ ابھی سے اس طوفان کو اٹھتا دیکھ رہی ہے اور وہ اپنی قوم کو اسی آنے والے ہولناک انجام سے ڈراتے ہیں۔

مولانا نے جس مقصد کے لیے آج سے پچاس ساٹھ برس پہلے اپنا گھربار چھوڑا تھا آج اسی مقصد کی خاطر اپنے دوستوں، نیاز مندوں اور بزرگوں کو چھوڑنے سے نہیں جھکتے۔ جب انہوں نے اوائل عمر میں ماں کی مامتا اور بہنوں کی محبت کی پروا نہ کی تو اب جبکہ آپ کی عمر ستر برس سے تجاوز کر چکی ہے اور آپ کا ایک پاؤں قبر میں ہے اور دوسری دنیا سامنے بے حجاب نظر آ رہی ہے، کیسے ممکن ہے کہ وہ کسی محبت، عزت یا شان کی خاطر وہ بات کہنا چھوڑ دیں جسے وہ حق سمجھتے ہیں۔

غرض مولانا عبید اللہ سندھی کی ساری زندگی ایک جستجو، ایک ولولہ، ایک عزم اور ایک انتھک اور مسلسل جدوجہد میں گزری ہے اور آج بھی ستر سال کی عمر میں وہ جوانوں سے کہیں زیادہ ہمت اور مشقت سے سرگرم عمل ہیں۔ کبھی وہ بیت الحکمت جامعہ نگر میں پہروں طلبہ میں بیٹھے درس دیتے نظر آتے ہیں۔ نہ انہیں آرام کا خیال ہے اور نہ کھانے پینے کا ہوش۔ کڑا کے کی سردی کی پروا نہیں اور نہ جھلستی لوکا احساس ہوتا ہے۔ کوئی استفادہ کے لیے خدمت میں حاضر ہو تو ساری رات اس کو سمجھاتے آنکھوں میں کاٹ دیتے ہیں۔ اور ان پر ذرا بھی اضمحلال کے آثار نظر نہیں آتے۔ کبھی سندھ کے ریگستان میں گوٹھ پیر جھنڈا کے مقام پر درس و تدریس میں لگ جاتے ہیں۔ وہاں زمین خریدنے کی صلاحیں ہوتی ہیں۔ عمارت کا نقشہ بنتا ہے اور مادی حالات سازگار نہیں ہوتے تو کھلی زمین میں جھونپڑیوں میں طلبہ کو لے کر بیٹھ جاتے ہیں۔ ہمت ہے کہ شکست قبول نہیں کرتی اور ایمان ہے کہ عمر کے ساتھ ساتھ اور پختہ ہوتا جاتا ہے۔

وحدت انسانیت

مولانا کی زندگی کا ما حاصل یہ ہے کہ آدمی ایک عقیدہ رکھے اور اس عملی دنیا میں مادی شکل دینے کے لیے مسلسل جہاد کرتا رہے۔ انسان اپنے آپ سے جہاد کرے۔ اپنے خاندان والوں سے جہاد کرے۔ اپنے سماج سے جہاد کرے۔ رسوم و رواج کے خلاف جہاد کرے۔ قوم اس کے عقیدہ کی راہ میں حائل ہوتی ہے تو اس سے جہاد کرے۔ اور اگر وہ دیکھتا ہے کہ ساری دنیا اس کے عقیدہ کی رو سے غلط کار ہے تو وہ اس کے خلاف بھی جہاد کرے۔ مولانا کے نزدیک اگر عقیدہ محض عقیدہ رہتا ہے اور خارج میں اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ تو یوں سمجھنا چاہیے کہ عقیدہ ناپختہ ہے۔ اسی طرح اگر کوئی عقیدہ رکھے بغیر جہاد کرتا ہے تو اس کا یہ جہاد بھی ناقص ہے اور اس سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔

مولانا فرماتے ہیں کہ میں نے زندگی میں عقیدہ اور جہاد کا یہ سبق قرآن مجید سے سیکھا اور اس سبق کا عملی نمونہ مجھے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کی زندگیوں میں بدرجہ اتم نظر آیا۔ مولانا نے ایک دفعہ فرمایا کہ یہ جذبہ بچپن ہی سے مجھ میں تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے سکھوں کے گورنر دیوان مولراج کے خاندان کے ہاں میری نانی اور والدہ کا آنا جانا تھا۔ رام نگر یا رسول نگر میں دیوان مولراج کا گھر تھا اور میرے خاندان کے مراسم دیوان مولراج کے خاندان سے تھے۔ ان کے ہاں کی عورتیں اکثر انگریزوں کے مظالم بیان کیا کرتیں اور میری والدہ اور نانی گھر آ کر مجھے یہ واقعات سناتی تھیں۔ ان باتوں سے مجھے انگریزوں سے نفرت ہو گئی اور میرا دل ان کی حکومت کو تسلیم نہ کرتا۔ میں مسلمان ہوا تو شاہ اسماعیل شہید سے مجھے خاص طور پر موانست ہو گئی۔ اور ان کی مجاہدانہ زندگی میرے لیے کشش کا باعث بنی۔ ان بزرگوں کے عمل نے میرے جذبہ جہاد کو گرمایا اور ان کی تعلیمات نے میرے عقیدہ کو وسعت اور گہرائی بخشی اور وہ جذبہ جو بچپن میں صرف پنجاب اور سکھوں تک محدود تھا، شاہ اسماعیل اور شاہ ولی اللہ کی برکت سے اتنا وسیع ہوا کہ وہ ساری انسانیت پر محیط ہو گیا۔ ان مرشدوں ہی نے مجھے بتایا کہ قرآن صرف مسلمانوں کی کتاب نہیں بلکہ کل انسانیت کا صحیفہ ہے اور مجھے اس کا مطالعہ کرتے آج پچاس ساٹھ برس ہونے کو ہیں لیکن مجھے ان بزرگوں کی بات پر آج تک کبھی شک نہیں ہوا۔ مولانا کے خیال میں قرآن مجید کل انسانیت کے بنیادی فکر کا ترجمان ہے۔ اور یہ بنیادی فکر

نہ کبھی بدلا ہے اور نہ آئندہ کبھی بدلے گا اور سارے ادیان، مذاہب اور فلسفوں کا اصل الاصول یہی فکر ہے۔ اس بنیادی فکر کو فطرت اللہ کہہ لیجئے۔ اسے دین کا نام دیجئے۔ یا اسے ضمیر انسانی سے تعبیر کیجئے۔ اسی ضمیر انسانی کی ترجمانی انبیاء صلحا اور حکماء کرتے آئے ہیں۔ مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ اصلی فکر میں باہر سے کدورتیں شامل ہوتی گئیں اور بار بار نئے ”نذیر اور بشر“ کی ضرورت پڑی۔ قرآن مجید اسی بنیادی فکر کا ترجمان ہے اور یہ بنیادی فکر عالمگیر ازلی ابدی اور لازوال ہے۔ قرآن میں بے شک اس فکر کا جامہ عربی ہے۔ اور ”ام القریٰ“ اور ”من حولہا“ کو سمجھانے کے لیے ماحول کے لوازم کا خیال رکھا گیا ہے۔ لیکن ”مشاہدہ حق“ کے بیان کے لیے ہمیشہ سے ”ساغر و مینا“ کی ضرورت پڑتی رہی ہے۔ اہل نظر جانتے ہیں کہ کہنے والے نے کیا کہا ہے اور ان کو اس کا بھی علم ہوتا ہے کہ الفاظ و تراکیب کی سرحد سے پرے معانی کا مقصود اصلی کیا ہے۔

قرآن مجید اسی ضمیر انسانی کا ترجمان ہے۔ مولانا کے نزدیک گیتانے بھی اپنے زمانے میں اسی حقیقت کی ترجمانی کی تھی۔ توریت اور انجیل بھی اسی ضمیر انسانی کی شارح ہیں اور حکماء نے بھی کہیں کم کہیں زیادہ اسی راز سے پردہ اٹھایا ہے۔ مولانا کے نزدیک گیتا حق ہے لیکن اس کی جو غلط تعبیر کی گئی ہے وہ کفر ہے۔ توریت اور انجیل حق ہیں لیکن جو غلط معانی ان کے الفاظ کو پہنائے گئے ہیں وہ باطل ہیں۔ اسی طرح قرآن حق ہے لیکن جس طرح مسلمان اس کو عام طور پر مانتے ہیں اور جو تفسیر وہ کرتے ہیں اگر گیتا اور انجیل کو ماننے والے کافر قرار دیے جاسکتے ہیں تو قرآن کو غلط مفہوم میں ماننے والے کیسے مومن کہے جائیں گے۔

تعلیمات شاہ ولی اللہ کے آئینہ میں مولانا نے قرآن کو اس کی اصل شکل میں دیکھا اور انہیں معلوم ہوا کہ خالص اور بے میل انسانیت ہی قرآن کا صحیح اور مکمل نصب العین ہے۔ جو تعلیم عام انسانیت کے تقدم اور ترقی میں مدد و معاون ہے وہ حق ہے اور جو تعلیم انسانیت کے ارتقاء میں حارج ہو وہ تعلیم حق نہیں ہو سکتی۔ ان معنوں میں قرآن مجید مولانا کا عقیدہ بنا اور قرآن کے نظام کو عملی شکل دینے کے لیے جدوجہد کرنا زندگی کا مقصد ٹھہرا۔

قرآن کے اصولوں پر اس دنیا میں خالص انسانیت کا قیام مولانا کا عقیدہ ہے۔ ان کے نزدیک خالص بے میل انسانیت ہی فطرۃ اللہ کی محافظ ہے اور سچا دین اگر ہے تو یہی ہے۔

مولانا اپنے اس خیال کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک اسلام کی تعلیمات کا لب لباب قرآن مجید کی آیت ”هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ“

لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْلَا تَمْشِرِ كُؤُنَ هِيَ۔ یعنی قرآن کا مقصود اصلی سب دینوں سے اعلیٰ دین یعنی سب فکروں سے بلند تر فکر یا سب سے بلند بین الاقوامی نظریہ جو زیادہ سے زیادہ انسانیت پر جامع ہو پیش کرنا اور اس پر عمل کرانا ہے۔ یہ دین دوسرے ادیان کو مٹانے نہیں آیا۔ یہ سب ادیان کی بنیادی صداقتوں کو تسلیم کرتا ہے اور سب قوموں کے وجود کو مانتا ہے لیکن اس کا کہنا یہ ہے کہ تاریخ میں یہ ہوتا آیا ہے کہ ایک قوم ایک مذہب کو اختیار کرتی ہے اور جوں جوں زمانہ گزرتا ہے وہ اسے اپنے رنگ میں رنگتی جاتی ہے اور اس طرح انسانی دین قومی دین بن جاتا ہے لیکن اس قوم کا اصرار ہوتا ہے کہ اس کا دین ہی ساری انسانیت کا دین ہے اور صرف یہی قوم انسانیت کی حامل اور نمائندہ ہے۔ بے شک ابتداء میں ان کا یہ فکر دین انسانی ہوتا ہے اور اس میں ہر رنگ اور ہر نسل والے کو بار مل جاتا ہے لیکن آہستہ آہستہ یہ قومی بن جاتا ہے اور آخر میں نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ ہر فرد یہ سمجھنے لگتا ہے کہ میں اور صرف میں ہی حق پر ہوں۔ باقی لوگ سب گمراہ اور کافر ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں کہ وہ دین جو ساری انسانیت کا شیرازہ بند بن کر آتا ہے۔ ایک وقت آتا ہے کہ انتہائی انتشار اور نزاع کا باعث بن جاتا ہے۔ قرآن اسی کو کفر قرار دیتا ہے۔

قرآن نے یہ کیا کہ ان تمام قومی مذاہب کو جو انسانیت کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کا سبب بن گئے تھے مردود قرار دیا اور یہ تلقین کی کہ خدا کا سچا مذہب وہ ہے جو خدا سے زیادہ قریب ہو اور خدا سے قربت کے معنی یہ ہیں کہ وہ فرقوں اور قوموں سے بالاتر ہو کہ ساری انسانیت کو اپنے دامن میں سمیٹ لے۔ مولانا کے نزدیک قرآن نے تمام اقوام، ادیان اور مذاہب کے مرکزی نکات کو جو کل انسانیت پر منطبق ہو سکتے ہیں، یکجا کیا اور ساری دنیا کو یہ دعوت دی کہ صرف یہی ایک اساس ہے جس پر صحیح انسانیت کی تعمیر ہو سکتی ہے۔ اگر یہودیوں کی قوم میں اس انسانیت کا فقدان ہے تو وہ خواہ اپنے منہ سے ”أَبْنَاءُ اللَّهِ وَأَحِبَّاءُ“ بنیں، گمراہ ہیں۔ اگر عیسائی اس سے خالی ہیں تو ان کا ”ابن اللہ“ کا ماننا کسی کام نہ آئے گا۔ اور اگر ہندوؤں میں انسانیت کی کمی ہے تو ان کا پوتر ہونا محض خام خیالی ہے اسی طرح مسلمانوں پر بھی اس حکم کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ قرآن ایک میزان ہے جس میں سب تولے جا سکتے ہیں۔ ہندو، مسلمان، یہودی اور عیسائی کی اس میں کوئی تمیز نہیں جو رائی برابر بھی کم نکلا اس کی پرش ہوگی۔

مولانا کے نزدیک اصل ذین یہی ہے کہ باقی سب رسوم اور روایتیں ہیں۔ قرآن کا مقصد انسانیت کو ان رسوم اور روایتوں کے بندھنوں سے آزاد کرانا ہے بد قسمتی سے ہر قوم نے ان رسوم کو اصلی مذہب سمجھ لیا اور ان کے پیچھے لوگ ایک دوسرے سے لڑنے لگے قرآن کا سچا ماننے والا وہ ہے جو ان بے روح رسوم کے خلاف جہاد کرے اور خلوص دل سے رسوم شکن ہو۔ قرآن کا ماننے والا ”موحد“ ہوتا ہے اور اس کا ”کیش ترک رسوم“ ہے۔ جب رسوم مذہب کا درجہ حاصل کر لیں اور مذہب کا یہ لباس مظہر وجود کی بجائے تنگ وجود ہو جائے تو اس وقت ان رسوم کا مٹانا قرآن کے ماننے والے کا فرض ہو جاتا ہے۔

مولانا ان معنوں میں یکے موحد ہیں اور ترک رسوم کے دل و جان سے حامی۔ لیکن وہ ترک رسوم کی اجازت ایک حد تک دیتے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ زندگی جب اس دنیا میں اسباب و حالات کا جامہ پہنتی ہے تو اسے ممکن اور موجود ہونے کے لیے لامحالہ رسوم اختیار کرنی پڑتی ہیں۔ ان رسوم کے بغیر زندگی زمان و مکان کے اس دائرہ میں وجود پذیر نہیں ہو سکتی۔ لیکن ہونا یہ چاہیے کہ ان رسوم کو رسوم ہی سمجھا جائے۔ لباس، لباس ہی رہے اسے صاحب لباس نہ مان لیا جائے لیکن جب لباس پر ہی زور دیا جائے اور رسوم ہی اصل مذہب کا درجہ حاصل کر لیں اور اکثریت قبلہ کو قبلہ نما سمجھنے سے عاری ہو جائے۔ تو پھر یہ رسوم بت بن جاتے ہیں اور جس طرح کبھی لات و ہبل کو ریزہ ریزہ کر دیا گیا تھا انہیں بھی توڑ پھوڑ دینا پڑتا ہے قرآن اسی توحید کی دعوت دیتا ہے اور اس کے خلاف تمام شعائر کو کفر سمجھتا ہے۔

یہ شعائر کفر ہمیشہ پتھر اور سونے چاندی کے بت نہیں ہوتے۔ ہماری رسوم ہمارے اخلاقی معیار ہمارے آداب و اطوار اور ہمارے نام نہاد مذاہب بھی ایک وقت میں بت بن جاتے ہیں۔ اور جس طرح پہلے کبھی پتھر کے بت غیر اللہ بن گئے تھے۔ اسی طرح جب رسوم کے بت غیر اللہ بن جائیں تو ان کے خلاف بھی قرآن جہاد کی تلقین کرتا ہے۔ اصلی مذہب اور رسوم کے اس نازک فرق کو مولانا یوں بیان فرماتے ہیں۔

”اقوام میں۔ کسی تحریک کو محفوظ کرنے کا یہ اساس ہے جو چیز متوسط طبقے میں آ

جائے وہ چیز فنا نہیں ہو سکتی۔ ادنیٰ طبقہ اس کی تقلید کرتا ہے اور اعلیٰ طبقہ جو کچھ کہتا ہے اس کی عملی صورت یہی ہوتی ہے جو متوسط طبقہ میں ہے۔ شاہ ولی اللہ حجتہ اللہ میں اسے ”رسوم“ سے تعبیر کرتے ہیں۔ ایک حقیقت اور حکمت کو جب تک رسم نہ بنایا جائے وہ انسانیت کے لیے مفید نہیں ہو سکتی۔ امام ولی اللہ تمام شرائع الہیہ کے اندر رسوم کو مرکز مانتے ہیں۔ قرآن عظیم نے اس کو ”معروف“ کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔“

یہ شک رسوم قابل احترام ہیں، لیکن اس وقت تک جب تک وہ حقیقت اور حکمت سے بہرہ ور رہتی ہیں۔ لیکن جب رسوم کھوکھلی ہو جائیں اور ان کے اندر صحیح روح باقی نہ رہے تو پھر ان کا وجود اور عدم وجود برابر ہوتا ہے اور ان کا بدلنا یا ان کی تجدید لازمی ہو جاتی ہے۔ یہ ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے اور ہمیشہ ہوتا رہے گا۔ رو بد بدل اور تجدید کا یہ عمل اس لیے ضروری ہے تاکہ انسان ان رسوم میں پڑ کر بھول نہ جائے کہ سارے انسان ایک ہیں اور قوموں، فرقوں اور طبقوں کی تقسیم حقیقی نہیں۔ دراصل سب کی اصل ایک ہے۔ ساری انسانیت ایک ہے۔ کل کائنات ایک ہے اور جو کچھ ہمیں نظر آتا ہے سب ایک ہی وجود سے نکلا ہے اور یہ وجود ایک ہی ذات کا پرتو یا فیضان ہے۔ ہر ذرہ میں اسی وجود کا ظہور ہے اور ہر انسان میں اسی نور کی جلوہ گری ہے۔

قوموں کی زندگی میں ایک دور ایسا آتا ہے جب تعینات، قوانین اور مذاہب پردے بن کر کل اور جزو کے درمیان حائل ہو جاتے ہیں تو اس وقت فطرت انسانی ان کے خلاف بغاوت کرتی ہے اور نئے دور کا ظہور ہوتا ہے۔ جس میں ہر فرد کا رشتہ پھر نئے سرے سے روح کل سے جڑ جاتا ہے۔ یعنی جب کسی قوم کی حالت یہ ہو کہ بقول اقبال

دانش و دین و علم و فن بندگی ہوس تمام
عشق گرہ کشائے کا فیض نہیں ہے عام ابھی
جوہر زندگی ہے عشق جوہر عشق ہے خودی
آہ کہ ہے یہ تیغ تیز پردگی نیام ابھی

اس وقت کیا تمدن، کیا تصوف، کیا شریعت اور کیا کلام سب کے سب بت بن جاتے ہیں۔ حقیقت خرافات میں کھو جاتی ہے اور مذہب روایات کا طومار بن جاتا ہے۔ جو ہر زندگی کی آگ

بجھ جاتی ہے۔ اور انسان را کھ کا ڈھیر ہو جاتا ہے۔ چنانچہ پھر انسانیت نئی تجلی کا انتظار کرتی ہے اور آخر کار طور سے یہ آواز اٹھتی ہے

کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے
پیران کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو

یہ عمل تاریخ میں برابر ہوتا رہتا ہے اور جس دن انسانیت اپنے اس تقاضہ زندگی سے محروم ہوگئی۔ وہ دن انسانیت کی موت کا ہوگا۔ یہ روح ہے قرآن کی تعلیمات کی۔

مولانا وحدت انسانی کیا، کل کائنات کی وحدت کے قائل ہیں لیکن جس طرح کائنات کی کثرت صاحب نظر کو پریشان نہیں کرتی اور وہ جانتا ہے کہ ان سب مختلف شکلوں میں ایک ہی جلوہ عکس ریز ہے۔ اسی طرح مولانا کو انسانوں کا 'قوموں گروہوں اور افراد میں بنا ہونا وحدت انسانیت کے منافی نظر نہیں آتا۔ وہ اس تقسیم کو منانا غیر فطری سمجھتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ یہ کبھی ہو نہیں سکتا۔ فرد ایک مستقل اکائی ہے، جماعت ایک اکائی ہے جو افراد پر مشتمل ہے۔ اس طرح ایک قوم اپنی جگہ مستقل وجود رکھتی ہے۔ اور انسانیت سب قوموں کو اپنے احاطہ میں لیے ہوئے ہے۔ فرد کا صالح ہونا اس بات پر منحصر ہے کہ وہ جماعت کا اچھا جزو ہو۔ اچھی جماعت وہ ہے جو قوم سے تضاد نہیں اختلاف رکھتی ہو اور اچھی قوم اسے کہیں گے جو کل انسانیت کے لیے جزو صالح کا حکم رکھتی ہو۔ انفرادیت ان معنوں میں کہ ہر فرد ہر جماعت اور ہر قوم دوسرے سے برسر نزع ہو اور کل مل کر ایک مجموعی انسانیت نہ بن سکیں غلط اور مردود ہے۔

اس سب بیان کا حاصل یہ ہے کہ مولانا وحدت انسانیت کو مانتے ہیں۔ قرآن مجید کو اسی وحدت کا شارح سمجھتے ہیں ان کے نزدیک قرآن کی تعلیمات کا مقصد یہی ہے کہ اس وحدت کا قیام عمل میں آئے اور لوگ عقیدہ، عملاً، اور علماً موحد بن جائیں۔

خدا پرستی۔ انسان دوستی

مولانا کے نزدیک ساری آسمانی کتابیں دراصل اسی وحدت انسانیت کی ترجمان ہیں اور حقیقت شناس حکیم بھی اسی فکر کے مفسر تھے۔ لیکن ہوا یہ کہ ان کے تبعین نے اپنی اپنی ٹولیاں بنا لیں اور اپنی ٹولی اور اپنی ٹولی کی بات کو وہ ساری انسانیت کا مدعا بنا بیٹھے۔ ایک دفعہ اس سوال کے جواب میں کہ ہر قوم کا دعویٰ ہے کہ ہمارا نبی آخری ہے اور ہمارا دین سب سے سچا دین ہے۔ ہر قوم اس کے ثبوت میں دلیلیں دیتی ہے، برہان و منطق کے زور سے اپنی بات منوانے پر اصرار کرتی ہے۔ دوسروں کی کتابوں میں مین میخ نکالتی ہے اور خود ان کی کتابوں پر اعتراضات ہوں تو ان کی صفائی پیش کرتی ہے۔ کیا ایک حقیقت کا جو یا اس صورت حال سے پریشان نہیں ہو جاتا؟ آخر یہ کیسے پتہ چلے کہ اصل ہدایت کہاں ہے؟ اور حق کیا ہے؟

مولانا نے فرمایا کہ ان الجھنوں سے نکلنے کا صرف ایک ہی حل ہے اور وہ یہ کہ مذاہب اور آراء کے ان اختلافات کو ایک طرف رکھو اور عام انسانیت کی تاریخ کا مطالعہ کرو اور پھر پتہ لگاؤ کہ آخر مجموعی انسانیت کا طبعی تقاضا کیا ہے۔ انسان کن باتوں سے قعر تنزل میں گرے اور کون سے اصول تھے جن پر چل کر وہ بام رفعت پر پہنچے۔ اس تلاش و تفحص کے بعد انسانوں کی اس طول و طویل تاریخ میں جو اصول سب قوموں میں آپ کو مشترک نظر آئیں گے وہ فطرۃ اللہ ہے اور یہی "الدین القیم" ہے اور جو تعلیم مجموعی انسانیت کی فطرت کے مطابق ہوگی وہی حق ہے۔

قرآن مجید کے برحق ہونے کے یہ معنی ہیں کہ وہ ایسی تعلیم دیتا ہے جو سب انسانوں کے فطری رجحانات کی آئینہ دار اور ساری نوع انسانی کے فائدہ کے لیے ہے۔ لیکن اگر قرآن کو ایک فرقہ یا گروہ کی کتاب بنا دیا جائے تو پھر یہ ثابت کرنا کہ وہ ازلی اور ابدی ہے اور اس کی تعلیمات سب کے لیے ہیں اور ہر زمانہ کے لیے ہیں بڑا مشکل ہے۔ قرآن کی عالمگیریت محض اس بنا پر ہے کہ وہ کل انسانیت کی کتاب ہے۔

مولانا فرماتے ہیں کہ قرآن کے بعض طالب علم جنہیں میں محض طالب علم کہوں گا، قرآن کے عالم نہ کہوں گا، قرآن کے الفاظ کے معنی کر کے سمجھ لیتے ہیں کہ یہ مفہوم ہے قرآن کا۔ اور اسی مفہوم

کے مطابق وہ قرآن کی تعلیمات کو عملی جامہ پہنانے کے مدعی ہوتے ہیں۔ یہ لوگ دوسرے مذاہب اور فلسفیانہ تصورات والوں کے سامنے جب قرآن کے اپنے اس مفہوم کو پیش کرتے ہیں تو انہیں مطلق اپنی بات سمجھا نہیں سکتے۔ اب ایک طرف تو ان کا یہ دعویٰ ہوتا ہے کہ قرآن کی تعلیم عالمگیر اور ہمہ گیر ہے اور دوسری طرف ان کی قرآن نہیں کا یہ حال ہوتا ہے کہ وہ اپنے مخصوص گروہ کے سوا کسی غیر مذہب والے صاحب عقل اور لامذہب سوچنے والے معقول آدمی پر اپنا مفہوم واضح نہیں کر سکتے۔ مولانا نے فرمایا کہ میں ان لوگوں سے کہوں گا کہ آپ نے قرآن کا مفہوم صحیح طور پر نہیں سمجھا۔ یہ مفہوم جسے آپ قرآن کا لب لباب کہتے ہیں آپ کے اپنے ذہن کی پیداوار ہے یا اپنے خاص گروہ اور ٹولی کا نظریہ۔

مولانا کا ارشاد ہے کہ میں قرآن کو اس طرح نہیں سمجھتا۔ میرا یہ عقیدہ ہے کہ انسانیت کی ترقی کے لیے ہر دور میں اچھے لوگ آتے رہے۔ ان حق شناس بندوں نے انسانوں کی ہدایت کے لیے اپنے اپنے وقت میں تعلیمات الہی کی تبلیغ کی اور اس طرح انسانیت کا قافلہ منزل بمنزل آگے قدم بڑھاتا چلا گیا۔ عہد ماضی کے یہ روشن نقوش انسانی تاریخ کے صفحات پر کم و بیش کچھ رد و بدل کے ساتھ ثبت ہیں۔ قرآن کے عالم کو چاہیے کہ وہ تاریخ کے مطالعہ سے معلوم کرے کہ انسانی ترقی کے عام اور غیر متبادل قوانین کون سے ہیں۔ اس کے بعد وہ قرآن میں تفحص کرے وہ دیکھے گا کہ قرآن انہی عالمگیر اور ناقابل تغیر اصول حیات کو پیش کرتا ہے۔ یہ قرآن کا صحیح مفہوم ہے اور یہی چیز ہے جو ازل سے ابد تک قائم رہے گی اور اسی کے ماننے میں تمام انسانوں کا بھلا ہے۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے تمام انسانوں میں ایک وحدت فکری ہے اور ان میں یہی ایک نقطہ اشتراک ہے اور اسی سے تمام ادیان اجناس اور اقوام کے تنازعات ختم ہو سکتے ہیں۔ نیز قرآن اور دوسری الہی کتابیں اسی وحدت فکری کی ترجمان ہیں۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ہر مذہب نے اپنی ایک ملت بنائی اور اس ملت کو اپنے لیے شریعت یعنی قانون بنانے کی ضرورت پڑی۔ ایک ملت نے ایک وضع اختیار کی اور دوسری ملت نے دوسری وضع۔ ایک کی شریعت کچھ اور تھی اور دوسری کی کچھ اور۔ اب اگر ان تمام ادیان کی وحدت مان لیں تو شریعتوں کے ان اختلافات کا کیا جواب ہے؟

مولانا فرماتے ہیں کہ قانون نتیجہ ہوتا ہے ایک خاص قوم کے خاص حالات اور خاص زمانے کے تقاضوں کا۔ زمانہ بدلتا ہے اس کے ساتھ اس کے تقاضے بھی بدلتے ہیں اور حالات میں بھی تبدیلی ہوتی ہے۔ ”کُلُّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ“ ہر نیا زمانہ ”شان اللہ“ ہے اور اللہ کے ”شؤون“ کی نہ کوئی حد ہے اور نہ حساب۔ نئے زمانے کو نہ ماننا اور اس کے تقاضوں کا انکار کرنا ”شؤون اللہ“ کا انکار ہے۔ شاہ ولی اللہ کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے قرآن کی تعلیم کا صحیح تجزیہ کیا۔ حکمت جو دائمی سرمدی اور عالمگیر ہے اس کو قانون

سے نمایاں کر کے دکھایا۔ چونکہ قانون کا قوم کے مزاج اور حالات سے متاثر ہونا ضروری ہوتا ہے اس لیے قانون ابدی اور سرمدی نہیں ہو سکتا۔ ابدیت صرف حکمت کو ہے اور قانون کی حیثیت ایک نمونہ اور مثال کی ہوتی ہے۔

اب اگر قرآن کو یوں سمجھا جائے تو آدمی ہر عامی و فاضل کو قرآن کا مفہوم ذہن نشین کر سکتا ہے۔ اپنے مذہب والے کو بھی سمجھا سکتا ہے اور غیر مذہب اور لامذہب والے کو بھی قائل کر سکتا ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ میرے خیال میں ہر وہ شخص جو سوچتا ہے اور سوچ سمجھ کر دنیا میں چلنے کا خیال رکھتا ہے وہ کسی مذہب کا ہو یا اس کا کوئی مذہب نہ ہو۔ وہ قرآن کے اس مفہوم کو ضرور مانے گا اور اصل میں یہی مطلب ہے قرآن مجید کے اس ارشاد کا ”هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ“

ایک مصنف نے لکھا ہے کہ ”تاریخ“ انسان کی زندگی کی کہانی ہے۔ حقیقت میں سب انسانوں کی اصل ایک ہی ہے لیکن ہر انسان کو مختلف حالات اور مختلف زمانوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس لیے اس کے کام کاج اور اس کی بات چیت میں یکسانیت نہ رہی۔ کوئی گرم ملک میں پیدا ہوا وہ کالا ہو گیا۔ کسی کو سرد ملک میں جگہ ملی تو سفید بن گیا۔ کسی کی سوچ بچار اسے کہیں لے گئی اور کوئی دوسرے راستے سے منزل مقصود پر پہنچا۔ مظاہر کے ان اختلافات کی بنا ماحول کے اختلافات پر ہے۔ ورنہ سب انسانوں کی جبلت ایک ہی سی ہے اور سب کے بنیادی محرکات عمل بھی یکساں ہیں۔ لیکن تجربات ہر ایک کے جدا جدا ہیں۔ کیونکہ ہر ایک کو قسمت نے الگ الگ تجربہ گاہ اور مختلف وسائل تجربے عطا کیے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم انسانی تاریخ میں وحدت اور انفرادیت دونوں ساتھ ساتھ پاتے ہیں۔

اسی خیال کو ایک اور مصنف یوں ادا کرتے ہیں۔ آپ کسی عرب کے ہاں مہمان بن کر جائیے۔ اگر اس کو آپ کی غیر معمولی عزت افزائی منظور ہوگی تو جب آپ اس کے گھر کی دہلیز پر قدم رکھیں گے تو وہ ایک دنبہ لائے گا اور آپ کے پاؤں سے اُسے چھو کر وہیں آپ کے سامنے ذبح کر دے گا۔ اس کے برعکس کسی ہندو کے مہمان بننے سے اُسے چھو کر وہیں آپ کے سامنے ذبح کر دے گا۔ دونوں میں جذبہ احترام یکساں ہے، لیکن دونوں کا احترام کے اظہار کا طریقہ جدا ہے۔ ایک کو پھول عزیز ہیں۔ اس نے معزز مہمان کی تشریف آوری پر پھول نچھاور کر دیئے دوسرے کو گوشت پسند ہے اس نے ذبیحہ سے مہمان کی قدر افزائی کی۔

ان مثالوں سے مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ زمانے کے ساتھ ساتھ زندگی کے مظاہر بدلتے جاتے ہیں۔ لیکن مظاہر کی تبدیلی کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ اب اصلیت میں کوئی فرق آ گیا ہے۔ قرآن کی تعلیم کا نتیجہ ایک زمانہ میں ایک خاص مظہر میں جلوہ گر ہوا۔ اب ضروری نہیں کہ دوسرے زمانہ میں وہ

پھر بعینہ اسی صورت میں ظاہر ہو۔ صحابہ کے زمانہ میں تیر و کمان، نیزے، تلوار اور ڈھال سے جہاد ہوتا تھا اور مجاہدین اونٹوں اور گھوڑوں پر سوار ہو کر جہاد کو نکلتے تھے۔ اب قرآنی تعلیم نے اگر کبھی اپنے پیروؤں کو جہاد پر آمادہ کیا تو ضروری نہیں کہ پھر تلوار، ڈھال اور اونٹ اور گھوڑوں کی نوبت آئے۔ اسی طرح خلافت راشدہ کے دور میں انسانی مساوات و انصاف کا اصول ایک خاص نہج پر نافذ ہوا۔ اب زندگی بہت کچھ بدل گئی ہے۔ اور اس کے ساتھ زندگی کی ضرورتیں بھی بدل گئی ہیں۔ اس لیے انسانی مساوات و انصاف کا دائرہ کار بھی بہت وسیع ہوگا۔ یعنی مقاصد تو وہی رہیں گے لیکن ان کی عملی شکل حالات و اسباب کی تبدیلی کی وجہ سے پہلی سی نہ ہوگی۔

اسی سلسلہ میں مولانا نے ایک دفعہ قرآنی حکومت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: ”جو زمانہ گزر گیا۔ وہ پھر واپس نہیں آیا کرتا۔ جو پانی بہہ جاتا ہے۔ وہ لوٹتا نہیں۔ قرآن پر عمل کر کے خلافت راشدہ کے دورِ اوّل میں صحابہ نے جو حکومت بنائی، اب بعینہ ویسی حکومت نہیں بن سکتی۔ جو لوگ قرآن کو اس طرح سمجھتے ہیں وہ حکمت قرآنی کے صحیح مفہوم کو نہیں جانتے۔ بے شک خلافت راشدہ کی حکومت قرآنی حکومت کا ایک نمونہ ہے۔ لیکن یہ نمونہ بعینہ ہر دور میں منتقل نہیں ہو سکتا۔ ہاں اس کے مبادی اور اصولوں پر قرآنی حکومتوں کے نئے نظام بن سکتے ہیں۔“

مولانا فرماتے ہیں کہ قرآن اب بھی اپنی حکومت قائم کر سکتا ہے۔ لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ قرآن کو عقل اور تفقہ سے سمجھا جائے اور اس کی تعلیمات کی عالمگیریت کی کنہ معلوم کی جائے۔ ورنہ اگر قرآن فہمی کی حد محض الفاظ تک ہی رہی اور انسانی فکر کی گہرائیوں اور زمانہ کے نئے تقلبات سے قرآن کے پڑھنے والے نابلد رہے تو اس کا حاصل معلوم!

علامہ اقبالؒ نے انہی مطالب کو بڑے دل نشین پیرایہ میں اس طرح بیان فرمایا ہے:

نقشِ قرآن تادریں عالم نشست	نقشبائے کاہن پاپا شکست
فاش گوئم آنچه در دل مضمر است	ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود	جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود
مثل حق پنهان وہم پیدا است این	زندہ پایندہ و گویاست این
اندر و تقدیر ہائے شرق و غرب	سرعت اندیشہ پیداکن چو برق
آفریدی شرع و آئینے دگر	اند کے بانور قرآنش نگہ

از ہم وزیر حیات آگے شوی!

ہم ز تقدیر حیات آگے شوی!

اگر قرآن کو اس طرح سمجھا جائے تو پھر واقعی قرآن کے اندر ابھی سو جہان ہیں۔

ع صد جہاں باقی است در قرآن ہنوز

لیکن اگر صرف پہلے کے بنے ہوئے شرع و آئین پر ہی سارا انحصار ہے اور قرآن محض اسی میں محدود ہو کر رہ گیا ہے تو پھر قرآن کی ابدالا آبدانک اثر آفرینی کا انجام ظاہر ہے! اگر بقول علامہ اقبالؒ قرآن حقیقتاً پڑھنے والے کی جان میں داخل ہو کر اس کی جان کو بدل دیتا ہے۔ اور جب پڑھنے والے کی جان میں تبدیلی واقع ہو جائے تو وہ عالم کو بدلنے کے درپے ہو جاتا ہے۔ اگر قرآن کی واقعی یہی تاثیر ہے تو وہ اس صورت میں ہی ممکن ہے جس صورت میں مولانا پیش کرتے ہیں۔

دوسرے لفظوں میں قرآن کا مقصود اصلی انسانیت عامہ کا تزکیہ اور اس کا ارتقاء ہے۔ وہ تمام انسانیت کو اس کے بنیادی اصول و مقاصد کی طرف لوٹانے آیا تھا۔ اس کا پیغام یہ تھا کہ سب انسان ایک ہیں۔ رنگ و نسل اور قوم کا فرق حقیقی نہیں۔ دھڑے بند یوں اور گروہ بنانے کی طبقہ دارانہ ذہنیت غلط ہے۔ قرآن نے زندگی کے یہی عالمگیر اور ناقابل تغیر اصول پیش کیے ہیں۔ ان کو اگر غور سے سمجھ لیا جائے تو ذہن وحدت انسانیت کی صحیح روح کو پالیتا ہے۔

اسی بنا پر قرآن نے اپنے عہد میں قیصریت اور کسرویت کو جو اس وقت استحصال بالجبر کا بدترین مظہر تھے ختم کرنے کی دعوت دی اور اس کی جگہ ایسا نظام قائم کیا جس میں انسانی مساوات ہر ایک سے انصاف اور اخوت بنیادی اصول تھے۔ قرآن کی تمام تعلیمات کا دار و مدار مولانا کے خیال میں انہی اعمال صالحات پر ہے اور چونکہ جب تک اعلیٰ اور بلند نصب العین انسان کے سامنے متعین نہ ہو اس سے اعمال صالحات کا ظہور ممکن نہیں ہوتا۔ اس لیے قرآن نے بار بار ایمان باللہ پر زور دیا ہے۔ یعنی ایمان باللہ نصب العین ہے اور انسانیت عامہ کی فلاح و بہبود اس نصب العین کو عمل میں لانے کا ذریعہ اور طریق۔ اگر نظر بصیرت سے دیکھا جائے تو ایمان باللہ کا عقیدہ انسانیت کے لیے ایک بلند اور اعلیٰ نصب العین کی حیثیت رکھتا ہے اور اس دنیا میں اس سے ارفع تصور ممکن نہیں۔ اللہ کے تصور میں وحدت انسانیت اور وحدت کائنات سب آجاتے ہیں اور ذہن کے سامنے لامحدود آفاق اور بے کنار وسعتیں واضح کاف ہو جاتی ہیں۔ اللہ کا صحیح تصور سب پہنائیوں کو اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے اور کوئی بلندی اور وسعت نہیں جو اس تصور سے بلند تر اور وسیع تر سوچی جاسکے۔

ایمان باللہ کی سب سے اونچی منزل یہ ہے کہ آدمی یہ مانے کہ اس زمین اور آسمان میں اگر کوئی وجود حقیقی ہے تو اسی کا ہے۔ جو کچھ ہے سب اسی کا فیضان ہے اور جو کچھ ہوتا ہے اس کا اصلی سبب وہی ہے۔ ایمان باللہ یا خدا پرستی کی ایک منزل انسانیت دوستی ہے۔ اگر آدمی یہ مانتا ہے کہ سارے انسان

اسی کے پیدا کیے ہوئے ہیں اور اس کو انسانوں کے خالق سے حقیقی محبت ہے تو لازمی ہے کہ اسے اُس کی مخلوق سے بھی محبت ہو۔ اور اگر اسے اس مخلوق سے محبت نہیں تو یہ سمجھ لو کہ وہ خدا کی محبت کے دعویٰ میں سچا نہیں۔ خدا پرستی کی پہچان اس دنیا میں تو یہی ہے کہ خدا پرست انسان کو خدا کے سارے بندوں سے محبت ہو اور وہ خدا کی خوشنودی اس کی مخلوقات کی خدمت اور اس کی بہبودی میں ڈھونڈے۔

ہمارے صوفیائے کرام نے تو خدا پرستی کی اس عملی شکل یعنی انسانیت دوستی کو اصل دین قرار دیا تھا۔ ان کا تو یہ عقیدہ ہو گیا تھا کہ جسے صرف اپنے گروہ اور جماعت سے محبت ہے اور وہ دوسروں کو جو اس کے ہم عقیدہ نہیں، نفرت سے دیکھتا ہے وہ سچا موجد اور خدا پرست ہی نہیں۔ وہ اپنی تعلیمات میں ہمیشہ اس بات پر زور دیتے رہے کہ تمام انسانوں کو ”عیال اللہ“ سمجھو۔ اور ان کا خود اپنا عمل بھی اس کا شاہد تھا لیکن اس سے یہ نہ خیال ہو کہ انہوں نے صواب و ناصواب اور ثواب و گناہ کی تمیز اٹھادی تھی۔ بے شک وہ نیکو کار کو اچھا سمجھتے تھے لیکن غلط کار کا انہیں اس نیکو کار سے زیادہ خیال رہتا تھا اور جس طرح ماں اپنے نافرمان بچے کے لیے زیادہ کڑھتی ہے اور اس کا اسے دوسروں سے زیادہ خیال ہوتا ہے۔ اسی طرح غلط کار کو سیدھے راستہ پر لگانے کے لیے یہ خدا پرست بزرگ بے قرار رہتے تھے۔ انسان دوستی خدا پرستی یا ایمان باللہ کا یہی جذبہ تھا جس نے رسول اللہ کو گھر کا آرام تہج کر مکہ والوں کو راہ راست پر لانے کے لیے بیتاب کر دیا تھا۔ گو آپ کو ہر نعمت میسر تھی اور گھر کے اندر اور گھر کے باہر سب قسم کا اطمینان حاصل تھا۔ لیکن دوسروں کا دکھ اور ان کی گمراہی تھی کہ آپ کو بے چین کیے دیتی۔ چنانچہ وہ مکہ میں اپنا پیغام سناتے پھرتے ہیں۔ طائف والوں کو جا کر حق کی دعوت دیتے ہیں۔ سختیاں ہوتی ہیں تو صبر کرتے ہیں اور جو سختیاں کرتے ہیں ان کے لیے بددعا نہیں بلکہ دعا کرتے ہیں۔ غرض گیتا، انجیل اور قرآن سب اسی انسان دوستی کے مسلک کے ترجمان ہیں اور سری کرشن جی، حضرت عیسیٰ اور رسول اللہ کی تعلیم اور عمل خدا پرستی کی اسی مادی شکل یعنی انسان دوستی کا نمونہ تھا۔ بعد والوں نے ان کی انسان دوستی کو اپنے اپنے مخصوص گروہوں کی دوستی تک محدود کر لیا۔ اور خدا پرستی جس سے مقصود یہ تھا کہ انسان کے دل میں مجموعی انسانیت کے لیے وسعت پیدا ہو جائے، اتنی مسخ ہوئی کہ خدا پرستی کے مدعی کے دل میں اپنی ذات کے سوا کسی اور کی سہائی مشکل ہو گئی۔

صوفیاء کرام کی کتابوں اور ارشادات میں بار بار اسی انسان دوستی پر زور دیا گیا ہے اور مثالوں سے یہ ذہن نشین کرانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس وقت آدمی خدا پرست نہیں ہو سکتا۔ جب تک سارے انسانوں سے بلا تمیز ملت اسے محبت نہ ہو۔ مولانا روم نے مثنوی میں اس بات کو واضح کرنے کے لیے ایک حکایت لکھی ہے۔ فرماتے ہیں :-

حضرت ابراہیم کی عادت تھی کہ جب تک کوئی مہمان دسترخوان پر موجود نہ ہوتا کھانا نہ کھاتے۔ ایک دفعہ کئی دن تک کوئی مہمان نہ آیا۔ ایک دوپہر کو آپ گھر سے نکل کر مہمان کا انتظار کر رہے تھے۔ سخت گرمی کا موسم تھا۔ لوچل رہی تھی اور تپش کے مارے ہر ذی روح کا برا حال تھا۔ دیکھتے کیا ہیں کہ دور ایک بوڑھا گر تاپڑتا چلا آ رہا ہے۔ اس کے کپڑے پھٹے ہوئے ہیں۔ اس کا جسم گرد و غبار میں اٹا پڑا ہے۔ ہونٹوں پر پڑیاں جمی ہوئی ہیں۔ حضرت ابراہیم نے بڑے شوق سے مہمان کا استقبال کیا اور خوشی خوشی اسے مکان کے اندر لے گئے۔ دسترخوان چننا گیا اور آپ نے بسم اللہ کہہ کر لقمہ توڑا۔ مہمان نے اللہ کا نام لیے بغیر کھانا شروع کر دیا۔ حضرت ابراہیم کو تعجب ہوا اور پوچھنے پر اس نے کہا کہ میں تو اللہ کو مانتا نہیں ہوں۔ حضرت ابراہیم کا اتنا سننا تھا کہ غصے سے بے تاب ہو گئے اور اسے اسی حال میں بے کھائے پئے گھر سے باہر نکال دیا۔ مولانا روم فرماتے ہیں کہ اس کے بعد فوراً ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آئی اور حضرت ابراہیم سے کہا گیا میں تو اپنے اس بندے کو ساٹھ سال تک کھانا پانی دیتا رہا اور اس کی ہر ضرورت کو پورا کیا لیکن تم سے یہ بھی نہ ہوسکا کہ میرے بندے کو ایک وقت کا کھانا ہی کھلا سکتے۔

اسی مضمون کی رسول اللہ سے ایک حدیث بھی مروی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ایک بندے سے پوچھے گا کہ میں بھوکا تھا تو نے مجھے کھانا نہ دیا۔ بندہ حیران ہو کر کہے گا کہ اے باری تعالیٰ! تو تو بھوک سے بے نیاز ہے۔ تجھے کھانے کی کیا حاجت۔ پھر ارشاد ہوگا کہ میں پیاسا تھا تو نے مجھے پانی نہ پلایا اور پھر پوچھے گا میں ننگا تھا تو نے مجھے کپڑا نہ پہنایا۔ ہر سوال کے جواب میں بندہ کہے گا کہ اے میرے رب! تجھے ان چیزوں کی کیا ضرورت؟ تو تو ان سب سے بے نیاز ہے۔ اس وقت خدا تعالیٰ فرمائے گا کہ میرا ایک بندہ بھوکا تھا تو نے اسے کھانا نہ کھلایا۔ وہ پیاسا تھا تو نے اسے پانی نہ دیا وہ ننگا تھا تو نے اسے لباس نہ پہنایا۔

مولانا کا کہنا ہے کہ صحیح خدا پرستی آگے چل کر لازماً انسانی دوستی کا موجب ہوتی ہے۔ قرآن مجید اسی خدا پرستی کی تعلیم دیتا ہے اور میں نے قرآن مجید سے بھی یہی سیکھا ہے کہ سب انسانوں کو ایک سمجھو اور جس بات کو تم جانتے ہو کہ اس میں سب کا بھلا ہے وہ بات ہر ایک سے کہو، سمجھاؤ۔ بار بار اس کے ذہن نشین کراؤ۔ اور اگر یہ بات اس کے دل میں راہ نہیں پیدا کرتی اور بیچ میں کچھ رکاوٹیں ہیں تو نرمی سے ان رکاوٹوں کو دور کرو۔ اور اگر نرمی سے کام نہیں چلتا تو تم طاقت استعمال کرو۔ یہ طاقت ان آدمیوں کے خلاف نہ ہوگی۔ جو برائی کے مرتکب ہیں اور نہ اس کا محرک ان سے نفرت کا جذبہ ہوگا بلکہ دراصل ان رکاوٹوں کے خلاف ہوگی جو انسانوں کو انسانیت دور رکھنے کا سبب ہیں۔ کلمہ حق یہی ہے اور حق کے لیے جہاد کرنے کے یہی معنی ہیں۔ جہاد بے شک بدوں کے خلاف ہوتا ہے لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو اس

سے مقصود بدی کا استیصال ہے۔ بدی سے جنگ کرنا انسانیت عامہ کی سب سے بڑی خدمت ہے۔ اکثر حق کے لیے جہاد کرنے میں اپنوں سے بھی لڑنا پڑتا ہے اور بسا اوقات تو کشت و خون تک نوبت پہنچتی ہے۔ لیکن یہ کشت و خون انسان دوستی کے منافی نہیں ہوتا۔ سری کرشن جی نے کور کشیتر کے میدان میں ارجن کو اسی بات کی تلقین کی تھی اور جنگ بدر میں رسول اکرم ﷺ کے صحابہ اسی یقین میں سرشار ہو کر اپنے باپوں، بھائیوں، بیٹوں اور عزیزوں کو قتل کرنے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ بہر حال اگر کشت و خون کا مقصد اپنی اپنے گروہ اور اپنی قوم کی بچک ہے تو یہ کشت و خون مردود ہے اور اسی کو اسلام نے عصیت کہا ہے۔ اور عصیت کے لیے لڑنا اس نے کفر قرار دیا ہے، لیکن اگر انسانیت عامہ کے مفاد کی خاطر دل میں خلوص رکھتے ہوئے کوئی لڑتا ہے تو وہ اشرف ترین فعل کرتا ہے۔

علامہ اقبالؒ نے مولانا رومؒ کی زبان سے حق کے لیے جہاد کرنے کی مزید توضیح فرماتی ہے۔

پیرروئیؒ سے مرید ہندیؒ سوال کرتا ہے۔
اے نگہ تیری میرے دل کی کشاد کھول مجھ پہ نکتہ حکم جہاد
اس کے جواب میں پیرروئیؒ فرماتے ہیں:

نقش حق گرہم بامر حق شکن
یعنی شکست و ریخت کا یہ عمل خالص حق کے لیے ہونا چاہیے۔ اور اگر اس میں شخصی اور جماعتی اغراض کا میل ہو گیا تو پھر یہ حق، حق نہ رہے گا بلکہ ناحق ہو جائے گا۔ عمل حق اور عمل ناحق میں فرق بیان کرتے ہوئے مولانا رومؒ نے مثنوی میں ایک واقعہ نقل کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

ایک لڑائی میں حضرت علیؑ ایک کافر کو پچھاڑ کر اس کے سینے پر چڑھ گئے۔ آپ اپنا خنجر کافر کی گردن میں پیوست کرنے کو تھے کہ اس کافر نے آپ کے چہرے پر تھوک دیا۔ اس کا تھوکنا تھا کہ آپ اس کے سینے سے اتر آئے۔ کافر نے متعجب ہو کر وجہ پوچھی تو ارشاد فرمایا کہ جب میں تمہارے سینے پر چڑھ کر خنجر بھونکنے والا تھا تو میرے دل میں تم سے کوئی ذاتی کد نہ تھی۔ لیکن تمہارے تھوکنے پر مجھے تم پر غصہ آ گیا اور میرے خلوص میں ذاتی غرض کی ملاوٹ ہو گئی۔

یہی قرآن کا ”ایمان باللہ“ اور ”جہاد فی سبیل اللہ“ ہے ایک عقیدہ ہے اور دوسرا شاہراہ عمل ایک نصب العین ہے اور دوسرا مسلک۔ اور دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ اگر ایک ناقص ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ دوسرے میں بھی کچھ کمی ہے۔

مولانا نے فرمایا کہ ”ایمان باللہ“ اور ”جہاد فی سبیل اللہ“ ان معنوں میں ایک ایسی کسوٹی ہے۔ جس پر ہر فرد ہر جماعت ہر قوم ہر نظام اور قانون پر کھا جا سکتا ہے۔ اس میں کسی کی رو رعایت کی

گنجائش ممکن نہیں۔ ایک زمانہ میں مسلمان ان دو اوصاف کے حامل تھے۔ اسی لیے قرآن نے انہیں اُمَّتٌ وَّسَطًا کا خطاب دیا۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔ وَكَذَلِكَ وَجَعَلْنَاهُمْ اُمَّتًا وَّسَطًا لَّكُوْنُوْا شٰهَدًا عَلٰی الْاِنْسَانِ مسلمانوں کا یہ امتیاز محض اسی بنا پر تھا کہ وہ ایمان باللہ اور جہاد فی سبیل اللہ کو صحیح معنوں میں مانتے تھے اور ان پر عمل کرتے تھے۔ ان معنوں میں ہی ”ایمان باللہ“ اور ”جہاد فی سبیل اللہ“ دو عالمگیر ہمہ گیر اصول حیات ہیں اور قرآن کی عالمگیریت اور ہمہ گیریت کا مطلب بھی یہی ہے کہ وہ ان دونوں اصول حیات کو نہایت واضح اور کھلے پیرایہ میں بار بار پیش کرتا ہے اور یہ بھی بتاتا ہے کہ تمام آسمانی کتابیں اور زندگی کے صالح فلسفے انہی دونوں اصولوں کی شرح ہیں۔ قرآن ان سب کتابوں کو ختم نہیں کرتا بلکہ اُن کا مُصَدِّق ہے اور ان سب کا جامع بھی۔

مولانا فرماتے ہیں کہ روس جانے سے پہلے گو میں اس حقیقت کا شعور رکھتا تھا۔ لیکن اس کو کبھی زبان پر نہ لاتا تھا، پر اب میں اسے برملا کہتا ہوں۔ آپ نے ایک دفعہ کہا کہ میرے نزدیک ایک انقلابی ہزار غیر انقلابیوں پر بھاری ہوتا ہے اور قرآن کی یہ آیت "مُسْتَفْرَّةٌ مُّزْمِرَةٌ مِّنْ قُورَةٍ" یعنی بدکنے والے گدھے ہیں جو شیر سے بھاگ نکلے ہیں اس مفہوم کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

مولانا کے اس خیال سے کسی کو غلط فہمی نہ ہو کہ درحقیقت خودی کی تکمیل سے ہی انسان کا دل خدا کا شعور حاصل کرتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے اس شعر میں اسی مطلب کی طرف اشارہ کیا ہے:

منکر حق نزد ملاً کافر است منکر خود نزد من کافر تر است

مولانا کے نزدیک انقلاب کا جذبہ ہی فرد کی خودی کو بیدار کرتا ہے اور جب انسان کی خودی بیدار ہو جائے تو وہ بلا خوف و خطر زندگی کی کش مکشوں کا مردانہ وار مقابلہ کرتا ہے۔ وہ فرسودہ اور بے کار دستوروں کو توڑ پھوڑ دیتا ہے اور زندگی کی نئی طرح ڈال دیتا ہے۔ یعنی عمل کا مظہر اتم ذوق انقلاب ہے۔ اور یہی "ذوق انقلاب" فکر اور عمل میں تعمیر و تخلیق کا باعث بنتا ہے۔ اسی ذوق انقلاب نے روسی اشتراکیوں میں اتنی ہمت اور جرات پیدا کر دی تھی کہ انہوں نے زار کی زبردست حکومت کے پر نچے اڑا دیئے۔ اور روس میں ایسا نظام قائم کیا جس کی ساری دنیا مخالف تھی اور بڑی بڑی سلطنتیں اس کو تباہ کرنے کے درپے تھیں لیکن انقلاب کا ولولہ رکھنے والوں نے کسی کی پروا نہ کی اور اپنے عزم و یقین پر برابر ثابت قدم رہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں "یہ کار خداوندان" کرنا انقلابی کا کام ہوتا ہے۔

مولانا کے نزدیک انقلاب ہی کائنات کا پیغام ہے اور زندگی میں نمو حرکت اور ارتقاء اسی جذبہ انقلاب کے رہن منت ہیں۔ جس طرح مولانا کی خود اپنی زندگی ایک نصب العین کے لیے اُن تھک اور مسلسل جدوجہد میں گزری ہے اور اس راہ میں انہوں نے کہیں قیام اور قرار گوارا نہیں کیا۔ اسی طرح وہ کائنات کے متعلق بھی یقین رکھتے ہیں کہ اس میں پیہم کش مکش جاری ہے اور ازل سے ابد تک "چراغ مصطفوی" سے "شرار بولہبی" برابر دست و گریبان رہے گا۔ زندگی میں ہر لمحہ انقلاب کا عمل ہوتا رہتا ہے۔ فرد کا لفظ بہ لفظ خوب سے خوب تر کی تلاش کرنا اسی انقلاب کا فیضان ہے۔ جماعتیں ولولہ انقلاب کھوپٹیں تو زندگی سے محروم ہو جاتی ہیں اور اگر ان میں کش مکش انقلاب رہے تو زندہ اور پابندہ رہتی ہیں۔

مولانا کسی ایسی زندگی کا تصور ہی نہیں کر سکتے جس میں انقلاب کا جذبہ سرد پڑ گیا ہو۔ اگر کسی فرد جماعت یا قوم کو یہ مرض لاحق ہو جائے تو مولانا کے نزدیک ان کو زندوں میں شمار نہیں کرنا چاہیے۔ بے عزتی کی زندگی موت سے بدتر ہوتی ہے۔ آنحضرت ﷺ کی ایک حدیث ہے کہ جس قوم نے جہاد کو

جہاد.....انقلاب

ہم پہلے لکھ آئے ہیں کہ مولانا فرمایا کرتے ہیں کہ ظلم اور استبداد کے خلاف نفرت کا جذبہ مجھ میں بچپن سے موجود تھا۔ میں مسلمان ہوا تو شاہ ولی اللہ کی حکیمانہ تعلیمات نے میرے اس جذبہ کو ایک ایجابی رنگ دیا اور اس میں وسعت اور گہرائی پیدا کی۔ ان بزرگوں کے فیض سے ہی مجھ پر یہ حقیقت روشن ہوئی کہ قرآن کا مقصد عالمگیر انقلاب برپا کرنا تھا اور آج بھی قرآن کے ماننے والوں کا فرض ہے کہ وہ اپنا نصب العین عالمگیر انقلاب کو بنائیں۔ میں اپنے ان عالی مرتبت مرشدوں کا بے حد احسان مند ہوں کہ انہوں نے میرے جذبہ نفرت کو جو ابتداء میں محض ایک سلبی حیثیت رکھتا تھا، ایک عالمگیر اور ہمہ گیر ایجابی نظریہ زندگی بنا دیا۔ چنانچہ قرآن کا یہی عالمگیر اور ہمہ گیر نظریہ میرا اب نصب العین ہے۔ اور اس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے جدوجہد کرنا میرا مسلک ایک عقیدہ ہے اور دوسرا عمل، عقیدہ اور نصب العین کی تشریح پہلے ہو چکی ہے۔ عمل کے متعلق مولانا کا نقطہ نظر ملاحظہ ہو:

مولانا کہتے ہیں کہ ایک دفعہ میرے استاد حضرت شیخ الہندؒ نے جہاد کے فضائل میں رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث بیان فرمائی۔ سنتے ہی میرے بدن میں ایک لرزہ سا پیدا ہو گیا۔ میں نے نگاہ جو اٹھائی تو کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے ہیں۔ آپ نے فوراً اپنے آپ پر قابو پالیا اور سلسلہ کلام شروع کر دیا۔ مولانا کا بیان ہے کہ ایک اور مرتبہ حضرت شیخ الہند نے مجھ سے ارشاد فرمایا کہ اگر ساری دنیا بھی تمہاری مخالف ہو جائے لیکن تم اپنے ارادے میں ثابت قدم رہو تو تم ہی کامیاب ہو گے۔ مولانا کا کہنا ہے کہ یہ اعتماد نفس ہے اور انقلاب کے لیے یہی اعتماد نفس پہلی شرط ہے۔ موصوف فرماتے ہیں کہ بزرگوں کی صحبت میں سا لہا سال تک میری اس طرح تربیت ہوئی۔ آپ کے خیال میں انقلابی کو اپنے اوپر بڑا اعتماد ہوتا ہے۔ وہ نہ دوسروں کے عائد کردہ خدا کو ماننا ہے۔ نہ ان کے اخلاق کے ٹھونسنے ہوئے معیاروں کو۔ وہ سماج کا انکار کرتا ہے۔ حکومت کا انکار کرتا ہے۔ ماں باپ کے کہنے کو نہیں مانتا۔ دوستوں اور عزیزوں کا انکار کرتا ہے۔ لیکن اگر مانتا ہے تو صرف اس بات کو جسے وہ خود حق سمجھتا ہے اور وہ اس حق کو جس پر اسے یقین ہوتا ہے، اٹل اور قطعی جانتا ہے۔ یہ عزم اور یہ ارادہ زندگی میں بڑی چیز ہے اور دراصل ہمارا اعتماد علی اللہ اسی اعتماد علی النفس کا حاصل ہے۔

چھوڑ دیا وہ ذلیل و برباد ہو گئی۔ دوسرے لفظوں میں کسی قوم کا باعزت اور با اقبال ہونا صرف اسی بناء پر ہوتا ہے کہ اس قوم میں جہاد کی روح سرگرم عمل ہے۔

ایک دفعہ روس کے اشتراکی لیڈر لینن سے کسی کامریڈ نے پوچھا تھا کہ کیا ایک زمانہ ایسا نہیں آئے گا جب کہ ہمارا انقلاب پورے طور پر کامیاب ہو چکا ہوگا اور ہمارے لیے کچھ اور کرنے کو باقی نہ رہے گا۔ لینن نے یہ سن کر کہا کہ کسی انقلابی کا یہ سوچنا کہ ایک زمانہ ایسا بھی آ سکتا ہے جب کہ ہمارے انقلاب کی کوئی ضرورت نہ رہے گی، اس بات کی دلیل ہے کہ وہ شخص پورا انقلابی نہیں۔ مولانا پیہم جدوجہد جہاد اور انقلاب کو اس طرح مانتے ہیں اور خود ان کی ساری زندگی اس پر عمل کرتے گزری ہے۔ جہاد اور انقلاب کے ضمن میں یہاں ایک بات اور واضح ہو جانی چاہیے۔ جہاد کو عام طور پر تیغ آزمائی اور کشور کشائی ہی سمجھا جاتا ہے اور انقلاب کے معنی ہم توڑنا پھوڑنا، قتل و غارت اور تخریب ہی کے لیتے ہیں۔ لیکن نہ جہاد صرف تیغ آزمائی ہے اور نہ انقلاب محض تخریب کا دوسرا نام ہے۔ حدیث و قرآن میں جہاد بڑے وسیع معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ لیکن اس سے یہ مراد نہیں کہ جہاد بالسیف کا وجود ہی نہیں۔ جہاد تلوار سے بھی ہوتا ہے، قلم سے بھی، زبان سے بھی، دل سے بھی اور اکثر تو خود اپنے نفس سے ہی جہاد کرنا پڑتا ہے۔ اسی طرح انقلاب محض تخریب نہیں۔ منفی خیالات پیش کرنا انقلابی کا کام نہیں ہوتا۔ انقلاب فرسودہ نظام حیات کی جگہ ایک نیا بہتر اور جان دار نظام پیش کرتا ہے۔ ہم نے غلطی سے یہ سمجھ لیا ہے کہ انقلاب ماضی کی ہر چیز کو مٹا دینے کا نام ہے اس لیے انقلاب اچھا نہیں، اس سے تجدید بہتر ہے۔ یہ انقلاب کی اصلی حقیقت کو نہ سمجھنے کی دلیل ہے۔ انقلاب اصولاً صرف ان چیزوں کو مٹاتا ہے جو مٹانے کے قابل ہوتی ہیں۔ وہ ماضی کا انکار نہیں کرتا بلکہ وہ انسانی تاریخ کے سارے ”باقیات صالحات“ کو برقرار رکھتا ہے جن کا باقی رکھنا ضروری ہوتا ہے اور نئے نظام کی بنیاد میں ان سے پورا کام لیتا ہے۔ زندگی کے دھارے کو اگر بہتا رہنے دیا جائے تو وہ برابر آگے بڑھتا چلا جاتا ہے، لیکن جب کسی وجہ سے اس کا راستہ رُک جائے اور پانی چڑھتا چلا جائے تو پھر یک بارگی بند ٹوٹ جاتا ہے اور ہم کہتے ہیں کہ سیلاب آ گیا۔ تجدید یا ارتقاء کے ذریعہ سے جو منزل برسوں میں طے ہوتی ہے، انقلاب کرنے والے اپنے آپ کو دوسروں سے بہت پیچھے پا کر بیک خروش اس تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ یا ان سے بڑھ جانا چاہتے ہیں۔ بے شک روس کا انقلاب مادی اور صنعتی انقلاب ہے، لیکن یہ ضروری نہیں ہوتا کہ انقلاب ہمیشہ مادی اور صنعتی ہی ہو بلکہ اب تو اس کا زیادہ امکان ہے کہ آئندہ انقلاب انسان کی نفسی اور ذہنی زندگی میں ہو۔

پروفیسر اییم جوڈیورپ کے بعض محقق اہل قلم کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

”انسانیت کی ارتقاء کی اگلی منزل طبعی نہیں بلکہ نفسی اور ذہنی ہوگی۔ پہلے پہل انسان ارتقاء کی منزلیں طے کر کے حیوانیت سے انسانیت کے مقام میں آیا۔ پھر اس نے صنعت و حرفت کی مدد سے اپنے آپ کو آلات و اسباب سے آراستہ کیا۔ ہمارے اس دور میں انسان نے صنعت و حرفت میں پورا کمال حاصل کر لیا ہے۔ اب اس کے لیے ضروری ہو گیا ہے کہ وہ اس منزل سے آگے بڑھے اور جس طبعی ارتقاء نے اُسے مجبور کر دیا تھا کہ وہ حیوان سے ترقی کر کے انسان کے درجے میں قدم رکھے۔ پھر اس کی جبلی ضرورتوں نے اس سے اوزار اور آلات بنائے اور وہ مشین اور اسٹیم کا خالق بنا۔ اسی طرح آج وہ مجبور ہے کہ اپنا قدم آگے بڑھائے اور اس کا یہ قدم مادی نہیں بلکہ نفسی اور ذہنی ترقی کی طرف ہوگا۔“

مولانا فرماتے ہیں کہ یورپ کا یہ مادی انقلاب آگے چل کر لامحالہ انسانوں کی نفسی اور ذہنی ترقی کا محرک ہوگا اور یورپ کے وہ طبقے جو اب تک صرف مادہ ہی کو مقصد حیات اور حاصل حیات سمجھتے ہیں، زندگی کو ماورائے مادہ بھی ماننے پر مجبور ہو جائیں گے۔ بے شک مولانا موجودہ مادی انقلاب کی برکات کا دل و جان سے اعتراف کرتے ہیں اور ان کا کہنا یہ ہے کہ اگر ہم یورپ کی اس دو سو سال کی جدوجہد اور سائنس نے دنیائے اسباب کی تخیل میں جو معجزات دکھائے ہیں، ان کا انکار کریں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم ترقی کی اس منزل سے بہت پیچھے چلے جائیں گے اور ہمیں اس مقام پر آنے کے لیے صدیاں درکار ہوں گی۔ خود مولانا کے اپنے الفاظ میں:

”میں چاہتا ہوں کہ یورپ کی اس مادی ترقی کو تسلیم کر لیا جائے۔ یعنی علم اور سائنس کی ترقی کو ہم زندگی کے اساس کی حیثیت دیں لیکن یہ نہ سمجھیں کہ سائنس نے ساری زندگی کا احاطہ کر لیا ہے۔ بے شک سائنس نے مادی دنیا میں جو انکشافات کیے ہیں، وہ سب صحیح ہیں۔ لیکن زندگی صرف مادہ تک ختم نہیں ہو جاتی، بلکہ یہ مادہ کسی اور وجود کا پر تو ہے اور اس وجود کا مرکز ایک اور ذات ہے جو خود زندگی ہے اور زندگی کا سہارا اور باعث بھی۔ وہی ذات ”الٰہی القیوم“ ہے۔ میں مادیات کے تصور کائنات کو سرے سے غلط نہیں مانتا۔ لیکن اسے ناقص ضرور سمجھتا ہوں۔ مادی فکر کا منکر نہیں ہوں۔ لیکن یہ جانتا ہوں کہ مادیت حقیقت کا صرف

ایک رُخ ہے اور یہ رُخ بے شک حقیقت کے ایک پہلو کا صحیح ترجمان ہے۔ لیکن حقیقت کا ایک اور پہلو بھی ہے جو مادہ سے ماورا اور بالاتر ہے۔ اس کو شرعی زبان میں ”آخرت“ کہا گیا ہے۔ زندگی کا مادی تصور حیات اس لحاظ سے ناقص ہے کہ وہ زندگی کے صرف ایک پہلو کی رونمائی کرتا ہے، لیکن زندگی کا صحیح اور مکمل تصور ”اتنا فی الدنیا حسنة و فی الاخرة حسنة“ ہے اور یہی تصور ہے جو زندگی کی ساری مادی اور ماورائے مادی کائنات پر حاوی ہو سکتا ہے۔“

چنانچہ مولانا ہندوستان میں یورپ کی قسم کا مادی انقلاب چاہتے ہیں، لیکن اس سے ان کا مقصود علم اور سائنس کی تمام برکات کو جن سے آج کل یورپ مستفید ہو رہا ہے اپنے ملک میں رائج کرنا ہے۔ لیکن ان کی نظر صرف اس مادی انقلاب تک محدود نہیں۔ ان کے پیش نظر تو ہر فرد انسانی کا تعلق کائنات کی رُوح کُل سے جوڑنا ہے اور اسی کو وہ اسلام سمجھتے ہیں۔ لیکن ان کے نزدیک جب تک مادی دنیا پر انسان قابو نہ پالے اور علم و سائنس کی برکتیں ہر شخص کے لیے عام نہ ہو جائیں، انسانیت بحیثیت مجموعی اسلام کے قریب نہیں آ سکتی۔ اسلام کی حکومت خدا کی حکومت ہے۔ خدا کی حکومت کے معنی یہ ہیں کہ اس کی نعمتیں اس کے سارے بندوں کے لیے عام ہو جائیں۔ اسی بنا پر مولانا اپنے اسلام کو یورپ کے مادی تصور کا مخالف نہیں بلکہ اس کا تتمہ اور تکمیل کرنے والا جانتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ جب تک ہم یورپ کے مادی انقلاب کو اپنا نہ لیں گے، اسلام کا عالمگیر انقلاب شرمندہ معنی نہ ہو سکے گا۔

ممکن ہے مولانا کے اس مادی تصور سے ارباب مذہب بدکیں اور ان کے ماورائے مادی تصور پر نام نہاد ”یورپ زدہ“ خفا ہوں، لیکن یہ یاد رہے کہ جو ارباب مذہب زندگی کے مادی رُخ کا انکار کرتے ہیں، ان کا مذہب بس ”دیوانے کا خواب“ ہے اور عمل سے انہیں کوئی تعلق نہیں ہے اور جو نام نہاد ”یورپ زدہ“ ماورائے مادی زندگی کو نہیں مانتے۔ ان کی خدمت میں صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ وہ صرف یورپ کی سطحیت کا شکار ہو گئے ہیں۔ کاش وہ جانتے کہ یورپی فکر کا ضمیر اس اعلیٰ تصور سے کبھی خالی نہیں رہا۔ بے شک ایک عرصہ سے وہاں مادی تصور کا چرچا زیادہ ہے۔ لیکن یورپ میں ارباب فکر کی ایک جماعت ہمیشہ ایسی رہی ہے جن کی نظریں اس جہان آب و گل تک محدود نہیں رہیں۔ اور اب تو یورپی اذہان خاص طور پر اس فکر کی طرف زیادہ مائل ہو رہے ہیں۔ علم و مذہب، مادیت و روحانیت اور بقول شخصے مغرب اور مشرق کا تضاد اہل علم کے نزدیک اب ایک خام خیالی سے زیادہ نہیں۔ یورپ کی اس دور کی مادیت تو دراصل رد عمل تھی۔ قرون وسطیٰ کی عیسائیت کی جو ترک دنیا اور اوہام و توہمات کی تعلیم دیتی

تھی۔ یورپ کی یہ بغاوت مذہب کے خلاف نہ تھی بلکہ ان توہمات کے خلاف تھی، جن سے نبرد آزما ہوئے بغیر انسانیت کا ترقی کرنا ناممکن ہو گیا تھا۔

برطانیہ کی انجمن فلاسفہ کے صدر و سکونٹ سوئیل نے (Belief and Action) کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے اس میں مذہب کا ذکر کرتے ہوئے صاحب موصوف لکھتے ہیں:-

”مذہب۔۔۔ زمانہ ماضی میں اپنی پاک زندگیاں بسر کرنے والے پیغمبروں و لیوں اور شہداء سے ہمارا ربط قائم رکھتا ہے۔ ان بزرگ لوگوں سے ہماری ملاقات کراتا ہے۔ جنہوں نے روحانی امور کی تکمیل کے لیے اپنی جانیں تک قربان کر دی تھیں۔ اس طرح مذہب ہمیں ہزار ہا سال کی روایات سے جو اثرات مترتب ہو سکتے ہیں، اُس کے ماتحت لے آتا ہے۔ ہمارے حاضر کو شاندار ماضی سے اور مستقبل کو ہمارے حاضر سے جوڑ کر مذہب انسانیت کی تاریخ میں ایک ربط پیدا کر دیتا ہے۔“

زندگی عمل کا نام ہے اور عمل نصب العین کے بغیر ممکن نہیں اور صالح عمل وہ ہے جس کا نصب العین اعلیٰ اور بلند ہو۔ مذہب کا کام اسی نصب العین کا تعین اور انسانوں کے دلوں میں اس کو رچانا اور اس سے محبت پیدا کرنا ہے۔ ”یقین و عمل“ کا مصنف لکھتا ہے:-

”فلسفہ کی نئی اصطلاحات انسانی جذبات کو چھیڑنے میں بالکل ناکام ہیں۔ ان کی آواز ہماری رُوح کی دنیا تک نہیں پہنچتی، اور نہ کوئی گونج پیدا ہوتی ہے۔“

مذہب فلسفہ کی اس کمزوری کی تلافی کرتا ہے۔ بے شک اب تک مذہب کی رُوح پر اوہام اور تعصبات کا رنگ چڑھا رہا لیکن سائنس اور علم کی کٹھالی میں پڑ کر مذہب بہت حد تک نکھر چکا ہے۔ مذہب کے مستقبل کے متعلق و سکونٹ سوئیل کی رائے سننے کے قابل ہے وہ لکھتے ہیں:-

”تاریخ شاہد ہے کہ تمام مذاہب میں ضروریات زمانہ کے مطابق ترمیمیں ہوتی رہی ہیں۔ اگرچہ ترمیمیں اصول میں نہ ہوں، مگر فروع اور اعمال میں یہ ترمیمیں ہوتی ہیں اور ہوتی رہیں گی، اور سچ تو یہ ہے کہ دنیا کے مختلف مذاہب

یہ اقتباسات اس کتاب کے اردو ترجمہ ”یقین و عمل“ از عبد القدوس ہاشمی سے لیے گئے ہیں۔

میں آج بھی ایسی ترمیمیں جاری ہیں۔

ان ترمیموں کے بعد یہ موقع نہیں رہے گا کہ محض اوہام کی بنا پر انسانی اخلاق کی ترقی رک جائے۔ یادین کے نام سے پیشہ ور مذہبی جماعتیں برسراقتدار نظر آئیں اور معاشرتی ترقی میں خارج ہوں۔ مذہب اُس وقت انسان کے لیے ایون نہیں بلکہ ایک مقوی دوا ہوگا۔ بلکہ ایک حقیقت سمجھا جائے گا۔ تقدیر پر تکیہ کر کے بیٹھ رہنے والے ختم ہو جائیں گے۔ بنی نوح انسان کو عظمت و سر بلندی حاصل ہوگی۔ اس وقت انسان دنیا میں اس قدرت کے نظام العمل کو دیکھنے والا ہی نہ ہوگا۔ بلکہ قدرت کا نظام العمل خود اسی کے ہاتھوں سے تکمیل پائے گا۔ مذہب آج کی طرح روزانہ کی زندگی سے غیر متعلق چیز نہ ہوگا بلکہ ہر انسان گھر اور حکومت میں بھی پھر سے واپس آ جائے گا۔

مذہب کا انکار جسے اب تک ہمارے ہاں روشن خیالی کی دلیل سمجھا جاتا ہے اور ہر شخص ”صاحب نظر“ بننے کے لیے بزم خویش مذہب کی تردید ضروری جانتا ہے یورپ کے اعلیٰ حلقوں میں اسے اب کورینی سے تعبیر کیا جا رہا ہے۔ یورپ میں مذہب کی ضرورت کا آج کل اہل فکر کو اساس ہو رہا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ اگر انسانیت کو بچنا ہے تو اس کی یہی صورت ہے کہ وہ اپنے لیے کوئی مذہب تلاش کرے۔ اور ظاہر ہے یہ مذہب وسیع ترین مفہوم انسانیت کا ہی حامل ہو سکتا ہے۔ اس پر بحث کرتے ہوئے پروفیسر جوڈ لکھتے ہیں:-

”اس زمانہ میں مشین نے انسان کو بے پناہ قوت دے دی ہے اور اس قوت سے وہ تعمیر اور تخریب کے بے حد و حساب کام کر سکتا ہے۔ وہ چاہے تو سمندروں کو پھاڑ دے۔ پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کر دے۔ آسمان اس کے سامنے گرد ہے اور کائنات سرنگوں، لیکن انسان اتنی قوت پا کر بھی سکھی نہیں ہوا بلکہ وہ اور دکھی ہے۔ آج مشین کی طاقت انسانوں کو مطمئن کرنے کے کام نہیں آ رہی۔ بلکہ اس سے الٹا ان کو تباہ برباد کیا جا رہا ہے۔ اس دنیا میں ہلکے کا وجود اس بات کی دلیل ہے کہ انسان نے ہزاروں برس کی کوششوں کے بعد جو طاقت حاصل کی ہے وہ طاقت اب اس کے بس میں نہیں رہی۔ بلکہ وہ طاقت آج حاکم ہے اور انسان محکوم۔ اور یہ طاقت اب بے عنان ہو کر انسان کو ہلاک کرنے کے درپے ہے۔ اگر اس

طاقت کو قابو میں رکھنے کی کوئی سبیل نہ کی گئی تو انسانیت کا انجام اچھا نظر نہیں آتا۔“

”انسان کی ہزار ہا سال کی جدوجہد کا یہ انجام کیوں ہوا؟ اور آج وہ کیوں مشین کے ہاتھوں اس طرح بے بس نظر آتا ہے؟ دراصل بات یہ ہے کہ ہم نے طاقت تو بہم کر لی اور آگ، پانی، ہوا اور دھاتوں کو اپنے کام میں لانے کے وسیلے تو ڈھونڈ لیے۔ لیکن اس طاقت کو صحیح طور پر استعمال کرنے کی عقل ہم نے حاصل نہ کی۔ اور اسی کا نتیجہ ہے کہ آج انسان اس مصیبت میں گرفتار ہے۔ ضرورت ہے کہ طاقت کو صحیح راہ پر چلانے کی عقل بہم کی جائے۔ اور اگر طاقت اور عقل میں صحیح توازن ہو جائے تو آج ہماری مصیبتیں دور ہو سکتی ہیں۔ اور انسانیت آنے والی تباہی سے بچ سکتی ہے۔“

”بے شک انسان قدرت کو مسخر کرنے میں اپنے آباؤ اجداد سے بہت آگے بڑھ گیا ہے لیکن جہاں تک اس کے اپنے رہنے سہنے اور دوسروں سے مل کر زندگی گزارنے یعنی اخلاقیات اور سیاسیات کا تعلق ہے وہ اب تک وہیں ہے جہاں ہزاروں برس پہلے یونان کے قدیم باشندے تھے۔ ہم نے گو مادی ترقی تو بہت کر لی ہے، لیکن روحانی اور اخلاقی لحاظ سے ہم ذرا بھی آگے نہیں بڑھے اور آج رونا بھی صرف اسی بات کا ہے اور ساری ضرورت بھی یہی ہے کہ ہم اپنی مادی طاقت کے مطابق اپنے اندر روحانی اور اخلاقی عقل پیدا کریں تاکہ اس طاقت کا صحیح مصرف ہو سکے۔ ورنہ یہ طاقت جان کا وبال ثابت ہوگی۔“

”اب سوال یہ ہے کہ یہ عقل ہم کیسے سیکھیں اور موجودہ اخلاقی اور روحانی مردنی کو زندگی سے کیسے بدلیں۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اس کی کہیں سے کچھ زیادہ امید نظر نہیں آتی۔ اور آثار بھی کچھ ایسے ہیں کہ نا امید ہو کر کہنا پڑتا ہے کہ مشینی طاقت کو قابو میں رکھنا اور نئی اخلاقی قدروں کو پیدا کرنا اس دور میں مشکل ہو گیا ہے۔ نوجوان روایتی مذاہب سے بالکل برگشتہ خاطر ہو چکے ہیں۔ کوئی اخلاقی ضابطہ انہیں پسند نہیں آتا۔ اعلیٰ نصب العین سے وہ بیزار ہو چکے ہیں اور زندگی کی شب و روز کی مسرتوں ہی میں راحت پاتے ہیں۔ کسی وعدہ فردا کا انتظار ان کو گراں ہے اور عشرت امر وہی اب ان کا عقیدہ بن گیا ہے۔“

”آج کھالوپی لوکل کو تمہیں مرنا ہے۔ یہ ہے اصول آج کے نوجوانوں کا۔ شاید یہ وہی دور ہو جو پننگلر کے الفاظ میں کسی کلچر کی آخری موت کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ کیا ہم یہ سمجھ لیں کہ موجودہ تمدن فنا

کے ہاتھ سے نہیں بچ سکتا اور یورپ پر اب دم نزع طاری ہے اور جو کچھ روما کے ساتھ ہوا اب بعینہ یہی حشر یورپ کا ہوگا۔

”مغربی فلسفی پر کال نے کہا ہے کہ انسانی ذہن اپنی فطرت سے مجبور ہے کہ وہ کسی نہ کسی چیز پر ایمان رکھے اور اسی طرح انسان کا ارادہ بھی کسی نہ کسی سے محبت کرنے پر مجبور ہے اور جب ایمان اور محبت کے لیے اس کو کام کی چیزیں نہیں ملتیں تو وہ بے کار اور خراب مقصدوں پر رکتا جاتا ہے۔ خلاء قدرت کے کارخانے میں محال ہے اور محض مادی دنیا میں نہیں بلکہ روحانی اور اخلاقی دنیا میں بھی خلائیا ممکن ہے۔ انسان جب خدا پر ایمان رکھنا چھوڑ دے تو شیطان کی پرستش کرنے لگتا ہے اور اچھے نصب العینوں سے دست کش ہو جائے تو برے راستے اس کو لہا لیتے ہیں۔ یورپ کو اگر اس دلدل سے نکلتا ہے تو اس کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ بے یقینی کی جگہ یقین اور ایمان لے لے بے راہ روی ختم ہو اور یورپ والے نئی قدروں پر ایمان اور نئے اخلاقی ضابطوں سے محبت پیدا کریں۔ وہ زندگی جس میں نہ ایمان کی گرمی ہو اور نہ اخلاقی ضابطہ کی کشش وہ زندگی موت سے بدتر ہوتی ہے۔ ایچ جی ویلز کی رائے میں اس دور کی سب سے بڑی لعنت طاقت اور قوت ہے لیکن اس کا کوئی مصرف موجود نہیں۔ دماغ ہے لیکن اس سے کام لینے کا کوئی ذریعہ نہیں۔ ایسا کوئی نصب العین نہیں جو نوجوانوں کی امنگوں و ولولوں اور حوصلوں کو بروئے کار لائے۔ ایک طرف اتنی زیادتی اور دوسری طرف اتنی کمی۔ یہ ہمارا سب سے بڑا روگ ہے لیکن ہمارے اندر اس نصب العین کی تلاش کا مادہ فنا نہیں ہوا۔ اور اسی سے امید ہوتی ہے کہ شاید ہم نئے دور کو پیدا کر سکیں اور اخلاقی اور مذہبی قدروں کے نہ ہونے سے ہماری زندگیوں میں جو خلا ہو گیا ہے وہ بھرا جاسکے۔ اگر یہ نہ ہو تو ہماری تہذیب آپس میں ٹکرائے کر پاش پاش ہو جائے گی۔ اگر ہمیں بچنا ہے تو اپنے لیے کوئی مذہب تلاش کرنا ہوگا۔ جس کو ہم دل سے مانیں اور اس کے اصولوں پر اپنی زندگی ڈھالیں۔“

یورپ کے اہل فکر کے ان اقتباسات سے ہمیں صرف یہ بتانا مقصود تھا کہ ہمارے ہاں کے بزرگان دین یہ نہ کہیں کہ مولانا کا یورپی انقلاب کو ماننا انہیں مادیت کے دائرے میں محصور کر دیتا ہے۔ بلکہ اس کے برعکس جیسا کہ آپ نے دیکھا۔ اب تو خود یورپ کا مادی انقلاب مجبور ہو رہا ہے کہ وہ اپنے لیے مادہ سے بالاتر مقاصد زندگی کی تلاش کرے کیونکہ بقول پروفیسر جوڈ:

”زندگی کے جادواں اور پیہم دواں کے عقیدے ہی سے انسان میں امنگیں پیدا ہوتی ہیں۔ اسی سے اس میں عدم کو وجود میں لانے اور مستور کے بے حجاب کرنے کا حوصلہ ہوتا ہے۔ وہ جدوجہد کرتا ہے۔ آگے بڑھتا ہے۔ جو معلوم نہیں

اسے معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن جب زندگی کی وسعتیں سکڑ کر محدود ہو گئیں اور اسی آب و گل کی نئی تلی دنیا کو اصل حیات سمجھ لیا گیا تو پھر اعلیٰ قدروں پر ایمان کہاں رہا۔“

اس وقت تک یورپ نے مادی دنیا کی بہت حد تک تسخیر کر لی ہے لیکن ابھی وہ تھکا نہیں۔ اس میں ابھی بڑی توانائی اور ہمت ہے۔ وہ مجبور ہے کہ اپنی توانائی کا کوئی اور مصرف ڈھونڈے۔ یہ ”چار سو“ اس کے لیے تنگ ہو چکے ہیں اور وہ ”لامکاں“ کی تلاش میں ہے۔ یورپ کی موجودہ کش مکش محض اسی لیے ہے اور تمام خون ریزیوں اور جنگوں کا سبب بھی یہی ہے۔ خود یورپ کا علم بھی اب ”چار سو“ سے ”لامکاں“ کی وسعتوں کی طرف چل پڑا ہے۔ آئن سٹائن اور برگسان اسی قافلہ علم کے سالار ہیں اور یورپ والے اب اپنے عمل میں بھی مادیت سے ماروا نصب العین ڈھونڈ رہے ہیں۔ قرون وسطیٰ میں یورپ کی بیداری فرسودہ مذہب کی بیخ کنی سے شروع ہوئی۔ پھر اس نے مستبد بادشاہوں اور جاگیرداروں کو ختم کیا۔ اس کے بعد صنعت و حرفت کا دور دورہ ہوا۔ اور قومیتوں کا زمانہ آیا۔ اس سے سامراج پیدا ہوا پھلا اور پھولا۔ اب یہ سامراج بھی پھٹے ہوئے کپڑوں کی طرح اتارا جا رہا ہے۔ اور یورپ کی قومیں مجبور ہو رہی ہیں کہ یا تو اشتراکیت قبول کریں۔ یا اپنی جمہوریت کو اشتراکیت بنا لیں۔ سامراج جس کی بنیاد محض دوسروں کی لوٹ کھسوٹ پر ہے اس کا اشتراکیت خیالات سے شکست کھانا کیا اس بات کی علامت نہیں کہ یورپ کا عمل بھی اس کے علم کی طرح وسعت پذیر ہو رہا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اشتراکیت مادی زندگی کی تنظیم کا منہجائے کمال ہے لیکن مشہور مصنف جیرالڈ ہیرڈ کے الفاظ میں انسانی ارتقاء کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا اور چونکہ مادی اور طبعی دنیا میں سلسلہ ارتقاء اپنے نقطہ کمال کو پہنچ چکا ہے۔ اس لیے اب اس کا دائرہ عمل نفسی اور ذہنی ہوگا۔ جیرالڈ کے خیال میں ارتقاء اس وقت بھی اپنا کام کر رہا ہے، گو ہم اس وقت اسے محسوس نہیں کرتے۔

لیکن نفسی اور ذہنی ارتقاء کے یہ معنی نہیں ہوں گے کہ مادی ترقی مردود قرار دی جائے گی۔ بلکہ انسانیت کی نئی عمارت اسی مادی بنیاد پر بنے گی۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا روس کے مادی انقلاب کو صحیح مانتے ہیں۔ لیکن اس انقلاب کی لادینیت کے وہ خلاف ہیں۔ ان کے نزدیک روس نے جو مادی انقلاب برپا کیا، بہت ٹھیک کیا اور بقول علامہ اقبال ”کار خدا ندان“ کیا۔ لیکن انقلاب کے اس مادی تصور میں مولانا کے الفاظ میں سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ وہ انسان کی تمام صلاحیتوں کی تکمیل نہیں کر سکتا۔ مثال کے طور پر روس میں چند بڑی بڑی شخصیتیں تھیں۔ شروع میں تو چونکہ ٹھوس سیاسی اور معاشی مسائل سے عہدہ برآ ہونا تھا اور ان کا فوری حل ڈھونڈنا ضروری تھا۔ ورنہ انقلاب کا وجود خطرہ میں پڑ جاتا۔ اس

لیے اس زمانے میں مزدوروں اور عقلاء کا طبقہ دوش بدوش لڑتا رہا لیکن جب ادھر سے کچھ اطمینان ہوا تو عقلاء مادی اغراض کے اثر میں آنے لگے اور ہر شخص اپنی ذاتی مصلحت کی بنا پر کسی خاص گروہ یا جماعت کو نوازنے لگا۔ دراصل بات یہ ہے کہ جب ”ماورائے ذات“ کوئی نصب العین نہ ہو تو انسانوں کا اغراض پرستی سے بچنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ روس میں شروع شروع میں پروپیگنڈے کے سلسلے میں بڑے بڑے غبن ہوئے۔ لوگوں نے اشتراکیت کے پروپیگنڈے کے لیے روپے لیے۔ اور انہیں دوسرے کاموں میں صرف کر دیا۔ اس پر روس میں بڑا شور ہوا اور بیرونی پروپیگنڈے کو ایک حد تک بند کرنا پڑا۔

لیکن عجیب بات یہ ہے کہ روس میں اب اشتراکیت بھی ایک مادی عقلیت نہیں رہی بلکہ اس کی حقیقت اذعان یعنی عقیدہ کی سی ہو گئی ہے۔ اسی عقیدہ نے روسیوں میں بے پناہ قوت عمل پیدا کر دی ہے اور وہ اشتراکیت اور اشتراکی روس کے لیے یوں لڑ رہے ہیں جس طرح کبھی مذہب والے اپنے مذہب کی خاطر لڑتے تھے۔ یعنی روس میں اشتراکیت ایک مذہب بن گئی ہے اور لوگ اس پر یوں ایمان لاتے ہیں جیسے مذہب پر لایا کرتے تھے اور خوشی خوشی اس کے لیے جانیں دے رہے ہیں۔

مولانا نے ایک دفعہ صحیح مذہبیت کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا کہ صحیح مذہبیت انسان کو اپنی ذات کے ماوراء کسی اور اعلیٰ مقصد کے لیے ایثار کرنا سکھاتی ہے..... خالص مذہبی آدمی وہ ہے جو اپنے اعلیٰ تصور کی خاطر اپنی ذاتی خواہشات کو خواہ وہ کسی قسم کی ہوں دبانے کی کوشش کرتا ہے اور اگر اسے اس راہ میں دوسروں کی مخالفت بھی مول لینی پڑے تو بغیر کسی خوف و ہراس کے خوشی خوشی مخالفت کو قبول کرتا ہے لیکن اگر یہ مذہب انقلابی نہ ہو تو پھر اس کی افادیت محدود ہو کر رہ جاتی ہے یہ مذہب ناقص ہوتا ہے اور کسی آدمی کا مذہبی ہونے کا پتہ اس کے خلوص اور ثبات سے چلتا ہے۔ مذہبیت کی اس کسوٹی کو غالب نے شاعرانہ رنگ میں یوں بیان کیا ہے:-

ع وفاداری بشرط استواری اصل ایمان ہے

اسی بنا پر ایک بالغ نظر بزرگ نے ایک دفعہ کہا تھا کہ خدا کو ماننے والے روس میں آج کل سب سے زیادہ ہیں۔ اس سے ان کا دراصل مقصد یہ تھا کہ ایک اعلیٰ اور بلند نصب العین کے لیے جس خلوص اور استقلال کا ثبوت وہ دے رہے ہیں اس کی مثال آج دنیا کی کسی قوم میں نہیں ملے گی۔

حاصل کلام یہ نکلا کہ موجودہ یورپی انقلاب آئندہ کے عالمگیر انسانی انقلاب کا پیش خیمہ ہے اور مولانا کے اس ارشاد سے کہ ہمیں اس انقلاب کو اپنا لینا چاہیے یہ لازم نہیں آتا کہ ان کی نظر محض مادیت تک محدود ہو گئی۔ بلکہ دیکھا جائے تو خود یورپ والے مادی انقلاب سے آگے بڑھ کر ایک نئے انقلاب

کے لیے زمین ہموار کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ مولانا کا کہنا یہ ہے کہ ہندوستانی مادی زندگی کی اس تنظیم کو بحیثیت قبول کر لیں اور عالمگیر آزادی، اخوت اور معاشی مساوات کو اپنی زندگی کا اساس بنائیں۔ لیکن یہ سب کچھ کر لینے کے باوجود مولانا کا یہ یقین ہے کہ ہمارے لیے دین سے قطع تعلق کرنا ضروری نہیں ہوگا۔ بلکہ سچ پوچھیے تو یہی سچے دین کی تمہید ہے اور ساری انسانیت اسی کو قبول کرنے پر ایک نہ ایک دن مجبور ہو گی۔

اب مولانا کے ان خیالات کا برطانیہ کی جمعیت فلاسفہ کے صدر و سکونٹ سمویل کے اس اقتباس سے موزانہ کیجئے:-

”اگر عصر حاضر کے بسنے والے چاہتے ہیں کہ ان کا مستقبل کی طرف جو قدم اٹھے وہ صحیح بصیرت اور یقین کے ساتھ اٹھے تو ضروری ہے کہ پہلے وہ اس ذہنی کھر سے باہر نکل آئیں جس نے ان کو انتشار دماغی میں مبتلا کر رکھا ہے۔

چاہیے کہ مذہب ان طبعی حقائق کو قبول کر لے جسے موجودہ علوم سے مسلم قرار دیا ہے۔ خواہ مخواہ فرسودہ خیالی کوسائنس سے نہیں ٹکرانا چاہیے جیسا کہ خود سائنس بھی ایک ایسے عالم کو ہماری آنکھوں کے سامنے منکشف کر رہی ہے جس میں خداوند تعالیٰ کی عظمت موجود ہے۔ اور اسی کا جلال پوری طرح چمک رہا ہے لیکن ترقی خود بخود نہیں ہوا کرتی بلکہ عادتاً مجبور ہوتی ہے عمل کی۔“

آگے چل کر صاحب موصوف لکھتے ہیں کہ یہ سب کچھ انسان کے اپنے عمل پر منحصر ہے۔ اس لیے ساری اہمیت عمل کو حاصل ہے لیکن ہر عمل کو نہیں۔ وہ عمل نہ قابل تعریف ہے نہ اسے کوئی اہمیت حاصل ہے جو نصب العین اور طریقہ عمل متعین کیے بغیر کیا جائے۔

عمل کے لیے نصب العین کا ہونا ضروری ہے۔ عمل وہ اچھا ہے جس کا نصب العین مفاد عمومی کا ضامن اور کفیل ہو۔ اور مفاد عمومی صرف مادی ضرورتوں تک محدود نہیں ہوتا۔ مولانا کے نزدیک صحیح مذہب سب مفادات کا نگران ہوتا ہے۔ وہ مادی ضرورتوں کا بھی خیال رکھتا ہے اور انسانیت کی ماورائے وہ حاجتیں بھی پوری کرتا ہے۔ اس خیال کو ”یقین و عمل“ کے مصنف کے الفاظ میں سنئے:-

”نصب العین فلاح نوع انسان ہے اور فلاح کا انحصار کسی ایک ہی چیز کے انحصار پر نہیں ہے۔ اس فلاح میں روحانی، دماغی، اخلاقی، مادی، اجتماعی اور انفرادی سب ہی قسم کے اجزاء آجاتے ہیں۔ یہ ہے حقیقی بھلائی جس کی تلاش انسان کا فریضہ ہے۔ عمل درست ہے یا نا درست۔ اس کا فیصلہ نتیجہ پر

چھوڑیے۔“

مستقبل میں مذہب کی کیا حیثیت ہوگی۔ اور مذہب پر عمل کرنے کا کیا مطلب ہوگا۔ اس کے متعلق ہم نے بڑی تفصیل سے یورپی محققین کے خیالات یہاں درج کر دیئے ہیں۔ اس سے ہمارا مقصد صرف یہ تھا کہ ہمارے ہاں کے ”بزرگان دین“ اور نئی پود کے ”ارباب نظر“ مولانا کے مادی تصور اور مارائے مادی تصور سے کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں۔ ”بزرگان دین“ کہیں یہ نہ سمجھ لیں کہ مولانا یورپی انقلاب کو مان کر خدا نخواستہ مذہب کو چھوڑ بیٹھے ہیں۔ اور نوجوان ”ارباب نظر“ مولانا کی مذہبیت سے انہیں رجعت پسند نہ سمجھ لیں۔ مولانا کا مادی انقلاب ان کے مذہبی عقیدہ کا ایک حصہ ہے اور مولانا کے مذہب میں مادی انقلاب کرنا لازمی اور حتمی ہے۔ مذہب اور مادی انقلاب کو باہم متضاد سمجھنے والوں سے صرف اتنا عرض کیا جائے گا کہ بے شک ان دونوں میں تضاد ہے۔ لیکن صرف ان کے لیے جو چھوٹے دل اور تنگ نظریں رکھتے ہیں لیکن گوٹے کے الفاظ میں ”بڑے دلوں کی وسعت بے کنار میں ایسے تضاد کا وجود کہاں“ جو شخص ساری کائنات کی کثرت کو ایک وحدت میں سمیٹ لیتا ہے اور اس کو سارے مظاہر قدرت ایک ہی مصدر سے ظہور پذیر ہوتے نظر آتے ہیں اس کے لیے روح و بدن مذہب و مادیت اور دنیا و آخرت کے اختلافات وہی حیثیت رکھتے ہیں جو مولانا روم کی مشہور حکایت ہاتھی کے متعلق اندھوں کی مختلف آراء کی حیثیت ایک آنکھوں والے کا پورے ہاتھی کو دیکھ لینے کے مقابل میں ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ بزرگوں کے فیض سے میرے دل پر کائنات کے یہ عقدے اس طرح کھلے ہیں کہ اس ساری مدت میں کبھی بھی میرا ایمان متزلزل نہیں ہوا۔

روس کے انقلاب کو دیکھنے کے بعد اور روسیوں سے سے بڑھ کر انقلابی ہونے کے باوجود میں مسلمان رہا اور بجز اللہ اب بھی مسلمان ہوں۔ مولانا نے فرمایا کہ یہ سب کچھ شاہ ولی اللہ کی تعلیمات کا اعجاز ہے۔

مولانا کے ان افکار اور یورپی محققین کے اوپر کے اقتباسات میں ناظرین کو بہت کچھ مماثلت نظر آئے گی۔ لیکن شاید یہ سن کر تعجب ہو کہ مولانا یورپ کی کوئی زبان نہیں جانتے اور اشتراکی انقلاب کا جتنا بھی ان کا مطالعہ ہے وہ سارے کا سارا مشاہدہ تک محدود ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ میرے تمام افکار و خیالات کا سرچشمہ شاہ ولی اللہ اور ان کے خاندان علمی کی تصانیف ہیں۔ میں نے جو کچھ سیکھا ان بزرگوں کی کتابوں سے سیکھا۔ ہمارے ”یورپ زدہ“ نوجوان شاید اسے تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ ہوں۔ لیکن ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ اکثر ایک صوفی پر زندگی کے وہ حقائق بے نقاب ہو جاتے ہیں، جن تک ایک فلسفی، فن کار اور عالم بصد مشکل کئی برسوں میں پہنچ پاتا ہے۔ اس کے ثبوت میں مشہور

انگریز مفکر ڈوس ہکسلے کا بیان ملاحظہ ہو۔ وہ اپنی ایک نئی تصنیف میں بتاتا ہے کہ موجودہ تحقیقات نے کائنات کے معمہ کو جس طرح حل کیا ہے کم و بیش وہی حل تصوف نے دیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:-
”صوفی گرد و پیش کی دنیا سے کامل تجربہ اختیار کر لیتا ہے۔ اور اس طرح وہ ایک فلسفی، فن کار اور عالم سے کہیں بڑھ کر حدود و قیود کی دنیا سے بلند تر ہو جاتا ہے۔ تجربہ کے اس عالم میں وہ کائنات کی اس روح کو پالیتا ہے جو سارے وجود میں جاری و ساری ہے۔ اور وہی سارے مظاہر فطرت کی اصل حقیقت ہے۔ جب اس روح میں صوفی اپنی ذات کو گم کر دیتا ہے تو اس میں اخلاقی اور مادی قوتیں پیدا ہو جاتی ہیں جو عام اصطلاح میں فوق البشری کہلاتی ہیں۔“

مولانا شاہ صاحب کی رہنمائی میں کائنات کی اس روح سے اتصال حاصل کر سکے۔ اور انہوں نے قرآن مجید میں اسی کی روح کو جلوہ افروز پایا۔ اور جہاد انقلاب اور عمل کا یہ کبھی ختم ہونے والا ولولہ اسی روح کی ایک جھلک کا اثر ہے۔ جس کے دل پر قرآن اس صورت میں نازل ہوا اس کو قرار اور سکون اسی میں ملتا ہے کہ وہ ہر لمحہ جہاد کرتا رہے۔ کبھی خارج میں اور کبھی خود اپنے آپ سے۔ اس کی نماز بھی ایک جہاد ہوتی ہے۔

بہر حال مولانا کی ذہنی اور عملی زندگی کا مرکزی نقطہ انقلاب ہے۔ اور اسی کے گرد ان کے افکار کی ساری کائنات گھومتی ہے۔ ان کے نزدیک عقیدہ یا یقین بھی عمل کی ابتدائی منزل ہے۔ یقین اگر پختگی کی حد کو پہنچ چکا ہے تو وہ عملی دنیا میں متشکل ہو کر رہتا ہے۔ عمل کا نہ ہونا یقین کے نقص کی دلیل ہے۔ زندگی کو عمل کی شکل میں دیکھنا مولانا کی طبیعت کا فطری رجحان ہے۔ قرآن مجید سے آپ کی غیر معمولی شیفتگی اور محبت کا سبب بھی یہی ہے کہ قرآن عمل پر سب سے زیادہ زور دیتا ہے اور روسی انقلابیوں سے ایک گونہ وابستگی کے بھی یہی معنی ہیں کہ انہوں نے اپنے جوش کردار سے دنیا کا رخ بدل دیا۔

زندگی ایک سر بستہ راز ہے اور علم و حکمت کی ان ساری ترقیوں کے باوجود یہ راز اب تک بے حجاب نہیں ہو سکا۔ ہر شخص اپنی اپنی طبیعت کے مطابق زندگی کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ کوئی علم کے زور سے اس کی تسخیر کے درپے ہوتا ہے۔ وہ پیہم سوچتا ہے۔ زندگی کی گتھیوں کو سلجھاتا ہے اور ابن رشد کی طرح حکمت و فلسفہ کی مدد سے اس سے اتصال چاہتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ غور و فکر کرتے کرتے انسان ایک نہ ایک دن اس پردہ کو چاک کر دے گا اور زندگی اس کی آنکھوں کے سامنے بے حجاب ہو جائے گی۔ بعض اس کو خام خیالی سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ یہ عقدہ صرف جذب و محبت سے حل ہو سکتا ہے۔ سرستی و محویت اور عشق و وارفتگی ایسی طبیعت والوں کا خاصہ ہے۔ لیکن ایک فریق اور ہے جس کی رائے

عمر کے ساتھ ساتھ دائرہ فکر بڑا ہوتا گیا۔ اور اس کا اثر لازمی طور پر عمل پر بھی پڑا۔ لیکن فکر یا جذبات نے کبھی عمل کی تیز گامی کا راستہ نہیں روکا۔ مولانا کی ساری بے تائیاں بے قراریاں، غصہ، جھلا اٹھنا۔ بولتے بولتے جوش میں آ جانا۔ بڑے زور اور عزم سے گفتگو کرنا، مختصر آپ کا سارا جلال محض اس لیے ہے موصوف میں عمل کی استعداد اور کردار کا جوش بے پناہ ہے۔ ان کے لیے ایک وسیع دنیا چاہیے تھی۔ جہاں وہ اپنی عملی قوتوں کو بروئے کار لاتے۔ لیکن تقدیر کی ستم ظریفی دیکھئے، اتنا بڑا دل دیا۔ قابل رشک صحت دی۔ کام کرنے کا بے حد حساب جذبہ دیا۔ اور اس کے ساتھ حوصلہ اور ہمت بھی اتنی ارزاں کی۔ یہ سب کچھ دیا لیکن نہ دنیا تو ان صلاحیتوں کو کام میں لانے کے لیے دنیا نہ دی جو اتنی وسیع ہوتی کہ اس میں ان کے جذبہ عمل کو تسکین مل جاتی۔

صاحب عقل فلسفہ کی گتھیاں سلجھا کر دماغ کو مصروف رکھ سکتا ہے۔ صاحب عشق شعر میں نغمے میں یا سرمستی و محویت میں اپنے جذبہ کی تسکین کر لیتا ہے۔ لیکن صاحب عمل کو مواقع نہ ملیں تو اندازہ کیجئے کہ اس کے جوش کردار کے سیلاب جو ہر لمحہ رہ رہ کر اس کے اندر اٹھتے ہیں، راہ نہ پا کر کتنے چڑھتے ہوں گے اور ان کی طغیانی اور طوفان خیزی کا کیا عالم ہوتا ہوگا۔

اسی بنا پر ایک دفعہ ایک حقیقت بین بزرگ نے مولانا سے ملاقات کے بعد فرمایا تھا:
 ”اگر کسی کو ”انقلاب“ مجسم دیکھنا ہو تو وہ مولوی صاحب کو دیکھے۔“

60
 میں یہ راز نہ حکمت سے کھل سکتا ہے۔ اور نہ عشق و سرمستی سے۔ بلکہ اس کو بے نقاب کرنے کا کوئی ذریعہ ہے تو وہ عمل ہے۔ اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ صاحب عمل میں عشق اور عقل سرے سے ہوتے ہی نہیں۔ یا اس طرح جو عقل و عشق سے اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کرتے ہیں وہ جذبہ عمل سے بالکل خالی ہوتے ہیں۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ کسی میں عقل، عشق اور عمل دونوں پر غالب ہوتی ہے اور کہیں عشق، عقل اور عمل پر الب ہوتا ہے اور کسی میں عمل، عشق اور عقل پر مقدم ہوتا ہے۔ عقل کے غلبہ والا غور و فکر کی طرف زیادہ رجحان رکھتا ہے۔ صاحب عشق نغمہ و ساز یا جذب و سرمستی اور خود سپردگی سے معراج کمال کو پہنچتا ہے اور عمل کا حصہ غالب رکھنے والا مرد مجاہد ہوتا ہے اور وہ زبان حال سے یہ کہتا ہے کہ:

راز ہے راز ہے تقدیر جہان تگ و تاز

جوش کردار سے کھل جاتے ہیں تقدیر کے راز

صف جنگاہ میں مردان خدا کی تکبیر

جوش کردار سے بنتی ہے خدا کی آواز

اس لحاظ سے مولانا عبید اللہ سندھی خالص عملی آدمی ہیں۔ ان کی عقل، ان کا جذب، ان کے جذبات اور فلسفیانہ کاوشیں سب کی سب عمل کے تابع ہیں۔ اس کی طبیعت کچھ ایسی واقع ہوئی کہ وہ عمل کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ آج جبکہ ان کا سن ستر سے تجاوز کر چکا ہے، اور وہ جہاں بھی جاتے ہیں، اپنے آپ کو ناسازگار حالات میں گھرا پاتے ہیں۔ لیکن ایک لمحہ کے لیے ان کو یہ گمان نہیں ہوتا کہ ماحول ناسازگار ہے وہ اس کی طرف مطلق دھیان نہیں دیتے۔ اور فوراً کام میں لگ جاتے ہیں..... کام، کام۔ یہ ان کی زندگی کا وظیفہ ہے۔ اور اگر ان کو آرام پہنچانا مقصود ہو تو ان کے لیے کام مہیا کر دیجئے، وہ مطمئن ہو جائیں گے۔ اور ان کو اس میں آرام ملے گا۔ مولانا کی ساری عقلی اور جذباتی صلاحیتوں کا اظہار بہترین طور پر عمل میں اور صرف عمل ہی میں ہوتا ہے۔

مولانا کے اس فطری رجحان کی مزید وضاحت ایک اور واقعہ سے ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں کہ جوانی میں جب میں دیوبند سے فارغ التحصیل ہو کر سندھ گیا اور اپنے مرشد کی صحبت میں ریاضتیں کرنے لگا تو کچھ عرصہ کے بعد میں نے اپنے اندر غیر معمولی جذب و کیف کے آثار پائے۔ میں چاہتا تو اس باطنی استعداد کو اور بڑھا سکتا تھا۔ لیکن یہ خیال آیا کہ اگر ادھر پڑ گیا تو اس دنیا کا ہی ہو کر رہ جاؤں گا۔ اور دوسرے کام جو پیش نظر ہیں وہ نہیں ہو سکیں گے۔ چنانچہ میں نے ریاضت کم کر دی اور مطالعہ و تدریس میں زیادہ منہمک ہو گیا۔

مولانا کی زندگی کے ہر مقام پر عمل کا جذبہ شروع ہی سے سب میں مقدم رہا ہے۔ بے شک

انسانیت کے بنیادی اخلاق

انسان کو اس دنیا پر بستے معلوم نہیں کتنی صدیاں گزر گئیں۔ اور اسے ارتقاء کی موجودہ منزل تک پہنچنے میں خبر نہیں کیا کیا مراحل طے کرنے پڑے۔ اس طویل مدت میں انسانوں نے کئی تمدن بنائے۔ بڑے بڑے فلسفوں کی بنیاد رکھی علوم وجود میں آئے اخلاق و عادات کے نئے نئے معیار بنے، نبی مبعوث ہوئے۔ ان کی زبان سے خدا تعالیٰ کے پیغامات اس کے بندوں کو ملے۔ فلسفیوں اور حکیموں نے نئی نئی باتیں سوچیں۔ الغرض اب تک اتنے تمدنی، اخلاقی، فلسفی اور دینی نظریے معرض وجود میں آچکے ہیں کہ ان کا شمار کرنا مشکل ہے۔ ہر دور ایک نیا فکر لے کر اٹھا۔ ہر قوم نے یہ دعویٰ کیا کہ جو تمدن ان کا ہے ویسا تمدن نہ کسی کا پہلے تھا اور نہ آئندہ کسی کا ہوگا۔ "انا ولا غیر" کی صدائیں ہمیں ہر قوم کی تاریخ کو دور اقبال میں سننے میں آتی ہیں۔ بہر حال اس سے انکار نہیں کہ ہر قوم کی انفرادیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ اور ہر فکر نے اپنے اپنے زمانے میں اپنے لیے نئی نئی فضا بنائی، لیکن جس طرح انسان تمام وقتی، مکانی، عارضی اور ظاہری اختلافات کے باوجود اصل میں سب ایک ہیں، خواہ کوئی آج سے دس ہزار سال پہلے کا غیر متمدن انسان ہو یا اس زمانہ میں وسط افریقہ کے جنگلوں میں بسنے والا حبشی یا آج کا ترقی یافتہ یورپین۔ جس طرح ان سب میں انسانیت کا ایک جامع نقطہ مشترک ہے اور گولاکھوں برس کے ارتقاء نے ان کو کچھ سے کچھ بنا دیا ہے، لیکن جہاں تک اصل انسانیت کا تعلق ہے، وہ اس میں اب بھی ایک دوسرے سے مشابہ ہے۔ اور ان میں بنیادی طور پر کوئی فرق نہیں آیا۔ بعینہ اسی طرح ان گونا گوں اخلاقی نظریوں، تمدنی اصولوں اور افکار و ادیان میں بھی ایک گونہ وحدت ہے۔ گو ارتقاء نے ان کو عجیب عجیب شکلیں دیں اور انہیں کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ لیکن اس کے باوجود ان تمام میں چند بنیادی باتیں ایسی ہیں جو سب میں مشترک نظر آئیں گی۔ ظاہر بینوں پر ہمیشہ یہ حقیقت مخفی رہی۔ وہ کنوئیں کے مینڈک کی طرح اپنی محدود دنیا اور اپنے طبقاتی فکر کو سب سے جدا اور الگ سمجھتے رہے۔ انہوں نے اپنے ذہن کو باقی ذہن انسانی سے الگ تھلک کر دیا۔ اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جس طرح پانی بہتے ہوئے دریا سے بے تعلق ہو جائے تو اس میں سڑاؤ پیدا ہو جاتی ہے، اسی طرح فکری اور ذہنی علیحدگی نے ایسی قوموں کے دماغوں کو مفلوج کر

دیا۔ چین کا اعلیٰ تمدن اور بلند فکر اسی ذہنی علیحدگی کا شکار ہا۔ پراچین ہند کا جو حشر ہوا، وہ دنیا جانتی ہے۔ البیرونی نے قدیم ہندو فکر کی اس بیماری کو اپنی کتابوں میں بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے۔ جس طرح کائنات کی کثرت انسانی ذہن کو پریشان کر دیتی ہے اور وہ اس کائنات میں اپنا صحیح مقام متعین کرنے کے لیے مجبور ہو جاتا ہے کہ وہ اس کثرت میں وحدت کا پتہ لگائے۔ اسی طرح صاحب نظر حکیم مظاہر انسانی کی ان رنگارنگیوں میں جنہیں ہم تمدن، کلچر اور فکر کا نام دیتے ہیں، مشترک حقائق کی تلاش کرتا ہے کہ وہ عالمگیر انسانیت کی کہنہ پا کر اپنے تمدن کی بنیاد ان اصولوں پر رکھے جو ساری انسانیت پر جامع ہوں، تاکہ قوم کا فکر اصل سرچشمہ حیات سے بے تعلق نہ ہو اور اس کا ذہن ساری انسانیت اور اس کی تمام فکری جدوجہد کی اچھی متاع کو اپنے اندر لے سکے۔

اسلام نے ایک وقت میں تاریخ انسانی کی یہ خدمت بڑی خوبی سے سرانجام دی تھی۔ قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں کس طرح مختلف قومیں اور تمدن آپس میں کھتم کھتا ہو رہے تھے۔ اور ہر قوم اپنے آپ کو کافی بالذات اور مستغنی عن الغیر سمجھتی تھی۔ عیسائی کہتے تھے کہ جو عیسائی نہیں، وہ انسان ہی نہیں۔ اسی طرح یہودیوں نے اپنے آپ کو سب سے جدا کر لیا تھا۔ ایرانی اپنی جگہ مگن تھے اور ہندوستان والوں نے تو سمندر پار دیکھنا تک ادھر م بنا رکھا تھا۔ اُس وقت دنیا کی یہ حالت تھی کہ جیسے چھوٹے چھوٹے گڑھوں میں پانی رک گیا ہو۔ ایک گڑھ دوسرے سے جدا ہو۔ اور سب الگ الگ سڑ رہے ہوں۔ عربوں کی نئی قوم ایک سیلاب کی طرح نازل ہوئی۔ انہوں نے سب گڑھوں کو ایک کر دیا۔ اور ساری نوع انسانی الگ الگ گڑھوں کے بجائے ایک ذخار سمندر بن گئی۔ سب قوموں کے ذہنی اور فکری دھارے اس میں گرنے لگے اور اس طرح مجموعی طور پر انسانیت کو آگے بڑھنے کا موقع ملا۔

عرب ان پڑھ تھے۔ انہوں نے سب قوموں کے علموں کو سر آنکھوں پر لگایا۔ ان کا بندھاؤ کا نظام تمدن نہ تھا۔ انہوں نے سب تمدنوں کو کھنگالا۔ اور "خُذْ مَا صَفَا وَ دَعْ مَا كَدَّرَ" پر عمل کرتے ہوئے سب تمدنوں کے اچھے پہلو لے لیے۔ اسی طرح انہوں نے عیسائیت، یہودیت، مجوسیت اور صابئیت سب کو ایک آنکھ سے دیکھا اور سب کو بر ملا طور پر کہہ دیا کہ انسان خواہ کوئی بھی ہو، جو انسانیت کے بنیادی اصولوں کو مان لے، وہ اچھا انسان ہے۔ نام، نسل، رنگ اور گروہوں کے امتیازات سب باطل ہیں۔ دوسرے معنوں میں عربوں نے انسانیت کو جو ٹکڑوں ٹکڑوں میں بٹ چکی تھی۔ اس کا شیرازہ پھرا سرنو باندھ دیا اور الگ الگ اور باہم مخالف اور متخاصم قومیتوں کو ایک صحیح بین الاقوامی نظام دیا۔ بقول مولانا عبید اللہ سندھی یہی اسلام کا عالمگیر انقلاب تھا۔

مسلمانوں نے اسلام کے اس عالمگیر انقلاب پر بعد میں ایک عالمگیر تمدن انسانی کی بنیاد

رکھی۔ ادھر بغداد میں اور ادھر قرطبہ میں مشرق اور مغرب کی تمام قوموں اور ان کے افکار اور مذاہب کا اجتماع ہوا۔ ہر نسل کے لوگ آپس میں ملے۔ ایک دوسرے کے خیالات سے واقف ہوئے۔ ایک زبان کے علوم دوسری زبان میں ترجمہ ہوئے۔ ہندوستان کی طب و حکمت، یونان کے فلسفے، اسکندریہ کے علوم، ایرانیوں کے ادب، یہودیوں اور عیسائیوں کی روایات مذہبی اور عربوں کی زبان اور دین سے انسانی تمدن کی ایک نئی ہیئت کی ترکیب ہوئی جو ماضی کے سارے علوم و فنون اور حکمت و فلسفہ کا نچوڑ تھا اور حال و استقبال کے لیے مشعل راہ۔ یہ تھا اسلام کا تاریخی کارنامہ۔ اور انسانیت مسلمانوں کے اس احسان کو کبھی نہیں بھولے گی۔

اسلام کے اس تاریخی کارنامہ کی روح دراصل اس کی عالمگیریت اور جامعیت تھی۔ مسلمانوں نے سب مذہبوں اور تمدنوں کو اصلاً ایک سمجھا، ان کی مذہبی کتاب نے ساری انسانیت کو مخاطب کیا۔ ان کے مفکروں نے علم و فلسفہ پر بحث کی تو سب قوموں کے ذہنی سرمایہ کو چھان ڈالا۔ ان کے مورخ تاریخ لکھنے لگے تو انہوں نے حضرت آدم سے شروع کر کے ساری قوموں کی تاریخ کو ایک زنجیر کی کڑیاں بنا کر پیش کیا۔

ہر قوم جو اپنے اپنے زمانہ تاریخ میں فکر و عمل کی دنیا میں بین الاقوامی قیادت کی مالک بنی اس کا طرہ امتیاز اس کی یہی عالمگیریت اور جامعیت تھی اور پھر جب اس قوم کے مٹنے کے دن آئے تو ان کی نظریں تنگ ہو گئیں۔ اور ان کے دماغ اور بھی تنگ ہو گئے۔ اور انسانیت کا بین الاقوامی تصور تو الگ رہا۔ ان کے ذہنوں میں اپنی پوری قوم کی سائی تک مشکل ہو گئی۔ وہ انسانیت سے قومیت پر آگئے قوم سے ان میں فرق بن گئے۔ آخر فرقوں میں بھی آپس میں دال بننے لگی۔ اور نفسی نفسی تک نوبت پہنچ گئی۔ یہودیوں کے ساتھ یہی ہوا۔ عیسائی اسی روگ میں مبتلا ہوئے اور آج مسلمانوں کا بھی یہی حال ہے۔

قومی ذہن کا انسانی تصور سے عاری ہونا زوال کی طرف اس کا پہلا قدم ہوتا ہے۔ اسلام کے حق میں دوام کا وعدہ محض اسی بنا پر تھا کہ وہ انسانیت عامہ کا تصور پیش کرتا ہے۔ مسلمان دراصل وہ ہے جس کے ذہن میں کل انسانیت کی گنجائش ہے۔ ایک لحاظ سے اللہ پر ایمان لانے کی بھی یہی معنی ہیں۔

مولانا فرماتے ہیں کہ شاہ صاحب کی حکمت آفریں طبیعت کا یہ خاص کمال ہے کہ اس دور میں انہوں نے اسلام کی اس عالمگیر روح کو بے نقاب کیا۔ اس سلسلہ میں تمام مذاہب، ادیان اور نظام ہائے اخلاق میں مشترک مبادی متعین فرمائے اور اس طرح از سر نو انہوں نے مسلمانوں کے سامنے وہ تمام ذہنی وسعتیں کھول دیں جو اسلام کے عہد اول میں دین کی روح سمجھی جاتی تھیں۔ لیکن بعد میں جب مردہ دلی اور ذہنی پس ماندگی کا دور دورہ ہوا تو مسلمان بھی گروہ بندی کا شکار ہو گئے اور وہ بین الاقوامی

قیادت کے منصب سے محروم کر دیئے گئے۔

شاہ صاحب نے جس طرح ائمہ فقہ کے چار مذاہب میں مطابقت پیدا کی۔ پھر حدیث و فقہ میں غلط فہمی سے بعض لوگوں کو جو تضاد نظر آتا تھا اس کو سلجھایا۔ اور اس کے بعد یہ بھی بتایا کہ حدیث اور قرآن میں کوئی معارضت نہیں بلکہ حدیث دراصل قرآن سے ہی مستنبط ہے۔ نیز شریعت اور طریقت میں جو نزاع چلا آتا تھا۔ اہل شریعت طریقت والوں سے بیزار تھے۔ اور اہل طریقت شریعت والوں پر خفا۔ شاہ صاحب نے طریقت کے افکار کو شریعت پر منطبق کیا اور بتایا کہ علم اور معرفت کی رقابت محض غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔ اسلامی افکار و مذاہب کے دائرہ سے شاہ صاحب کی نظر اور بلند ہوئی۔ اور آپ کی بصیرت افروز نگاہ پر یہ حقیقت واضح گف ہوئی کہ حق شناس جہاں بھی ہوئے اور جس دور میں بھی ہوئے ان سب نے حقیقت کو پایا ہے۔ بے شک انہوں نے جن الفاظ میں اس حقیقت کی تعبیر کی وہ زمانہ ماحول اور مزاج کے اعتبار سے ایک دوسرے سے جدا تھی۔ کم نگاہوں نے اس تعبیر کو اصل سمجھ لیا، اور لگے آپس میں لڑنے، نتیجہ یہ ہوا کہ انسان آپس میں ایک دوسرے کے دشمن بن گئے۔ یہی اصل ہے اختلاف عقائد کی لوگوں نے "جبل اللہ" کو چھوڑ دیا۔ اور اپنے تعصبات کو خدا سمجھ بیٹھے۔

اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے مولانا نے ایک دفعہ کہا۔ مثلاً خدا اور بندے کے تعلق کو ہی لے لیجئے۔ کسی نے بندے اور خدا کے تعلق کو بیٹے اور باپ سے تعبیر کیا اور کسی نے حلول سے۔ الغرض ہر قوم نے اپنے اپنے مزاج کے مطابق اس مافوق تعبیر تعلق کو عام فہم بنانے کی کوشش کی۔ مقصود سب کا ایک ہی تھا۔ لیکن تعبیریں جدا جدا ہو گئیں۔ اور جوں جوں زمانہ گزرتا گیا ان تعبیروں کی وجہ سے اصل حقیقت پر پردے پڑنے لگے۔ آخر میں قرآن آیا تو اس نے اسی تعلق کو اس طرح پیش کیا کہ پہلے توہمات اور گمراہیوں کا سدباب بھی ہو جائے اور ہر ملت اور ہر گروہ خالق اور مخلوق کے باہمی رشتہ کو باسانی سمجھ بھی لے۔ اس مسئلہ میں قرآن کا مقصد اصل مذاہب کی تغلیط نہ تھی بلکہ دین کا ایک ایسا عالمگیر تصور پیش کرنا تھا جو سب کی سمجھ میں آجائے اور اس سے پہلے کی طرح غلط فہمیاں بھی پیدا نہ ہوں۔

مولانا مذاہب کے ضمن میں کل انسانی فکر کی ارتقائی کشمکش کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ایک حصہ جو حضرت ابراہیم سے پہلے گزر چکا ہے اُسے صابئی دور کہتے ہیں۔ ان کے نزدیک حضرت ابراہیم سے حنیفیت کا دور شروع ہوتا ہے۔ اس ضمن میں مولانا کے خود اپنے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

"آدم علیہ السلام کے زمانے میں جو شرائع مقرر تھے وہ اسی فلسفہ (ولی اللہی) کے ماتحت تھے۔ اور اس زمانہ کی حاجتوں کو پورا کرتے تھے۔ جس طرح انسانیت ترقی کرتی گئی اسی قدر اس فلسفہ کی تفریحات میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ ابراہیم سے پہلا دور صابئین کا ہے اور "تاویل الاحادیث" میں اسی

دور کی (جس میں آدم اور لیس نوح ماقبل ابراہیم علیہ السلام داخل ہیں) پوری تشریح ملے گی۔ اور لیس علیہ السلام ہی طبیعات ریاضیات اور الہیات کے بانی سمجھے جاتے ہیں۔ حکمت کے ان اقسام کا مرکز بدلتا رہا۔ کبھی ہند، کبھی ایران، کبھی یونان۔ اس کے بعد ابراہیمی دور آیا۔ خفاء نے اس فلسفہ کی شکل کو دوسرے رنگ میں بدل دیا۔ فلسفہ وہی ہے جو دور صائبین میں تھا۔ اس کی تشریحی صورت بدلتی جاتی ہے.....

دم بدم گر شود لباس بدل
مرد صاحب لباس را چہ خلل

مولانا نے ایک دفعہ فرمایا کہ مشہور عرب مورخ ابن اثیر ہندوؤں، چینوں، یونانیوں اور دوسری قدیم اقوام کو صائبی قرار دیتا ہے۔ صائبی عقائد میں مظاہر پرستی اسناں دین ہے۔ ان کے نزدیک علوم لدنی کی تجلی کو اکب پر ہوتی ہے اور مظاہر قدرت کے آئینہ میں خالق کا جلوہ نظر آتا ہے۔ حقیقت میں اس تجلی کی جلوہ گاہ افراد کا ملین کا دل ہے۔ ان کو حنیفی ملت میں نبی کہا جاتا ہے۔ بے سمجھی سے مسلمانوں نے صرف ”حران“ میں رہنے والے ایک محدود فرقہ کو صائبی مانا۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ اسلام عیسائیت اور یہودیت کے علاوہ باقی ملتوں کے لوگوں کا شمار صائبین میں سے ہونا چاہیے تھا۔

مولانا کے نزدیک قرآن حقیقت اور صائبیت دونوں ملتوں کے افکار کا مرکز کمال ہے۔ صائبی ذہنیت بھی اس نور سے مستفید ہو سکتی ہے اور حنیفی بھی۔ آپ نے حضرت ابن عباسؓ کی ایک حدیث کا حوالہ دیتے ہوئے جس میں مروی ہے کہ ”فی کل ارض آدم مثل آدم مکم ونوح مثل نوح حکم الخ“ فرمایا کہ یہاں ارض سے مراد قوم ہے۔ اور دنیا کو سات بڑی قوموں، تہذیبوں یا عابلیں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ تورات، انجیل اور قرآن صرف اس طرح کی ایک قوم کی تاریخ ہے۔ اسی قسم کے واقعات تقریباً سب قوموں پر گزر چکے ہیں۔ لیکن ان کتابوں میں شروع سے آخر تک صرف ایک ہی قوم کی پوری تاریخ منضبط ہے۔ بہر حال اگر دیکھا جائے تو اس قوم کی تاریخ سے دوسری قوموں کی مماثلت بھی ہو سکتی ہے۔ مثلاً موسوی دور ہندوستان کے کرشن جی کے زمانے سے ملتا جلتا ہے اور عیسائیت اور بدھ مت میں ایک گونہ مشابہت ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ یہ سمجھنا کہ اللہ کے پیغمبر اور خلق کو راہ راست دکھانے والے صرف وادی دجلہ و فرات اور شام و حجاز ہی میں آئے کسی طرح قابل قبول نہیں۔ اصل انسانیت تو غیر محدود ہے۔ لیکن افہام و تفہیم کی غرض سے نمونہ کے طور پر اس کا ایک حصہ چن لیا۔ اور اس کے ذریعہ عالمگیر صداقتوں کو بیان کر دیا۔

مولانا نے فرمایا کہ شاہ صاحب کے اس فکر کی بدولت ہی میں سمجھا کہ قرآن جامع الامم ہے اور وہ صرف ایک گروہ یا قوم کی تاریخ کے بیان تک محدود نہیں۔ بے شک اس نے زیادہ تر بنی اسرائیل کے انبیاء کا ہی ذکر کیا۔ لیکن یہ مصلحت اور ضرورت وقت کا تقاضا تھا۔ یقیناً فکر بھی انسانیت کی طرح غیر

لیکن جب اسے دوسروں کو سنانے کے لیے خاص الفاظ اور حروف میں قید کرنا پڑتا ہے تو محتاطیہ ن رعایت سے اُسے ایک خاص زبان و مکان کے ساتھ مخصوص کرنا ہوتا ہے۔ قرآن کے پیرایہ بیان کی محدودیت بھی اسی بنا پر ہے۔ لیکن اس کے باوجود جا بجا بین السطور میں مفہوم کی عالمگیریت اور جامعیت نمایاں ہے۔ اور اگر آدمی قرآن کے مطالعہ میں تدبر و تعمق سے کام لے تو اس پر واضح ہو جائے گا کہ کل نوع انسانی قرآن میں اپنا مافی الضمیر اور مقصد پا سکتی ہے۔

مولانا سے ایک دفعہ پوچھا گیا کہ بعض علماء تو ”نبوت“ کے سوا اخلاق انسانی کا کوئی اور منبع اور مصدر نہیں مانتے اور ان کے نزدیک ساری ہدایت صرف ”نبوت“ میں مرکوز ہے۔ جن قوموں میں ان کے خیال کے مطابق نبی نہیں آئے وہ ہدایت سے بے بہرہ رہیں۔ اور صحیح اخلاق انسانی میں ان کا کوئی حصہ نہیں۔ ان کے جواب میں مولانا نے فرمایا کہ اس طرح کی تخصیص نبوت کی حقیقت کو نہ سمجھنے کی دلیل ہے۔ بات یہ ہے کہ ایک چیز ہے نبوت۔ اور ایک ہے استعداد نبوت..... شاہ صاحب نے بڑی وضاحت سے اس مسئلہ کو بیان کیا ہے۔ نبوت دراصل حقیقت کی ایک اصطلاح ہے جسے ہم نے ملت ابراہیمی کے لیے مخصوص کر لیا۔ استعداد نبوت عام ہے۔ جسے ہم حکمت یا صدیقیت کا نام دیتے ہیں۔ نبی میں ایک تو استعداد نبوت ہوتی ہے اور ایک اس سے اوپر کی چیز اور وہ نبوت ہے۔ مثلاً نبوت کا مظہر تو قرآن مجید ہے اور استعداد نبوت کا اظہار آپؐ کی زندگی اور آپ کے دوسرے اقوال اور افعال میں ہوتا ہے۔

استعداد نبوت رکھنے والے افراد اخلاق کا جو نظام پیش کرتے ہیں وہ انسانیت کی فوز و فلاح کے معاملے میں نبوت کے نظام سے جدا نہیں ہوتا۔ البتہ فرق مراتب اور چیز ہے۔ جو باتیں نبی نے وحی سے کہیں اس سے کم درجہ پر وہی باتیں ایک حکیم حکمت اور فطری بصیرت سے کہتا ہے۔ آفتاب نبوت سے پھوٹی ہوئی شعاعوں اور ایک حق شناس حکیم کے دماغ سے نکلے ہوئے اخلاقی نظام میں کوئی اصولی نزاع نہیں ہوتا۔ نبوت کا کلام اعلیٰ اور افضل ہوتا ہے اور اس میں عمومیت اور ہمہ گیریت زیادہ ہوتی ہے لیکن حکیم کی اس بلند مقام پر رسائی مشکل ہوتی ہے۔

مولانا نے فرمایا کہ اگر شاہ صاحب کے اس اصول کو سمجھ لیا جائے تو چینی قوم کے اعلیٰ اخلاقی تصور یونانی فلسفہ ایرانیوں کی حکمت آفرینی اور ہندو رشیوں کے بلند فکری نظام اور اسلام یہودیت اور عیسائیت میں بنیادی طور پر کوئی تضاد نہیں رہتا۔ اور کل انسانیت کے چوکھٹے میں ساری قوموں کے نظام ادیان اور اخلاق اپنی اپنی جگہ ٹھیک بیٹھ جاتے ہیں۔

مولانا نے فرمایا کہ جو لوگ ”علم الہی“ کو ایک خاص گروہ کی جاگیر سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک

ہدایت کی روشنی صرف ان تک محدود ہے باقی دنیا ہمیشہ جاہلیت کے گھپ اندھیرے میں رہی اور ان کے یہاں کسی اعلیٰ اخلاق کا وجود ممکن ہی نہیں۔ یہ لوگ طائفیت کی چاردیواری میں محبوس ہیں۔ انہوں نے تاریخ انسانی کا مجموعی طور پر کبھی مطالعہ نہیں کیا۔ اور نہ انہوں نے کبھی یہ دیکھا کہ ہر قوم کے پاس اپنے عہد اقبال میں اخلاق کا ایک تصور تھا۔ ان لوگوں نے اس تصور کے مطابق اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو مرتب کیا۔ ان کے ہاتھوں میں انسانیت کے بڑے بڑے کام بھی ہوئے۔ دراصل مختلف تمدنوں اور مذاہب کا تقابلی مطالعہ نہ کرنے کا یہ لازمی نتیجہ ہے کہ انسان کی نظر صرف ایک گروہ اور جماعت تک محدود ہو جائے اور اپنے سوا سب کو جاہل اور نعمت علم سے عاری سمجھے۔

نبوت اور استعداد نبوت کا فرق نہ کرنے والوں کے نزدیک نبی کی اپنی کوئی مستقل شخصی حیثیت نہیں ہوتی۔ ان کے خیال میں نبی کی مثال فوٹو گراف کی ہے۔ جو کچھ اس پر القاء ہوا وہ اس نے ہو۔ یہود و مسروں کو پہنچا دیا۔ یہ لوگ نبی کی ہر بات اور ہر فعل کو اصل نبوت کا جزو سمجھتے ہیں۔ اسی بنا پر ان کے ہاں عربی زبان مقدس قرآن کا دوسری زبانوں میں ترجمہ ممنوع۔ امامت قریش کی اور سیادت صرف سید کی ہے۔ اور وہ کسی "غیر مسلم" کو انسان ہی نہیں سمجھتے۔ اگرچہ وہ اپنے اعمال و اخلاق میں ان سے کتنا ہی بلند و برتر کیوں نہ ہو۔

اس میں شک نہیں کہ نبی کا مقام بہت بلند ہے۔ اس کا دل ذات الوہیت کی تجلی گاہ ہوتا ہے اور اس طرح اس کا اتصال براہ راست خداوند تعالیٰ سے ہو جاتا ہے۔ چنانچہ انسانیت کے سارے معارف اور حکمتیں اس کی چشم بصیرت کے سامنے بے حجاب ہوتی ہیں لیکن جس شخص کو استعداد نبوت سے کچھ بہرہ ملا ہو وہ بھی ان معارف اور حکمتوں سے ایک حد تک آشنا ضرور ہوتا ہے۔ البتہ نبوت کے بلند مقام اور استعداد نبوت رکھنے والے حکیم اور صدیق کے مقام پر بہت بڑا فرق ہے۔

شاہ اسماعیل شہید اپنی کتاب "العقبات" میں حکیم اور صدیق کے ذکر میں لکھتے ہیں:-

"اس کو اگر اہل تورات کے درمیان مسند قضا پر بٹھا دیا جائے تو وہ ان میں تورات کے مطابق فیصلے کر سکتا ہے۔ اہل انجیل میں انجیل کے مطابق۔ اور اہل قرآن میں قرآن کے مطابق فیصلہ کر سکتا ہے۔ بات یہ ہے کہ ہر وہ مذہب جس پر عقلاء کی ایک بہت بڑی جماعت جمع ہوئی ہو۔ اور خاص طور پر اس میں ایسے لوگ ہوں جن کا غیب سے اتصال ہو۔ مثلاً عیسائی راہب، یہودی یونانی، فلسفہ اشراق کے ماننے والے۔ ایرانی جنور و ظلمت کو الگ الگ قرار دیتے ہیں اور ہندوستان کے جوگی۔ ایسے مذہب کی حظیرۃ القدس میں اپنی مخصوص اور پائدار جگہ ہوتی ہے

اور اس کی سوت اسی سرچشمہ سے پھوٹی ہے۔

لیکن بعد میں یوں ہوتا ہے کہ اس مذہب میں برے خیالات مل جاتے ہیں۔ اور ادھر ادھر کی بیہودہ رسموں اور بے کار روایتوں کا اس میں عمل دخل ہونے لگتا ہے۔ تعبیریں و تفسیریں غلط کی جاتی ہیں اور غیب سے جس رنگ میں علم کا فیضان ہوتا ہے ذہن اس کو اصل کے مطابق اخذ نہیں کرتا۔ نیز بعد والے اپنے گزرے ہوئے بزرگوں کی باتوں کو وہ معنی پہناتے ہیں جو ان کے پیش نظر نہ تھے۔ حکیم کا کمال یہ ہوتا ہے کہ وہ ان سب مذاہب اور آراء کی اصل کو ادھر ادھر کی تمام ملاوٹوں سے پاک حظیرۃ القدس میں نمایاں طور پر دیکھ لیتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ حکیم کی روح بیدار ہوتی ہے۔"

شاہ اسماعیل شہید کے اس بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ حکیم کی نظر بڑی بلند اور گہری ہوتی ہے اور وہ

اسی بنا پر سارے مذاہب اور آراء کی اصل پالیتا ہے۔ نیز ہندوستان کے جوگی، ایران کے مجوسی، یونان کے فلسفی اور یہودی اور عیسائی راہب سب کو حظیرۃ القدس سے ہی فیضان علم ہوتا ہے۔ یعنی علم کی اصل ایک ہی ہے۔ بعد والوں نے آپس میں اختلافات پیدا کر لیے اور اس طرح مذہب کی صحیح روح سے سارے دور ہوتے چلے گئے۔ ایک مشہور قول کے مطابق بڑے لوگوں نے تمام زبانوں میں ایک ہی سی بات کہ لیکن ان کے نام لیواؤں نے جو چھوٹے دل اور دماغ رکھتے تھے ان باتوں کو توڑ مروڑ کر کچھ سے کچھ دیا۔

حکیم اور صدیق کا کام یہ ہوتا ہے کہ بقول شاہ شہید وہ تمام مذاہب اور آراء کی اصل حقیقت کو ادھر ادھر کی تمام ملاوٹوں سے پاک الگ و نمایاں دیکھ لیتا ہے۔ اس کی چشم بصیرت علم و حکمت کی ساری ندیوں، نالوں اور دریاؤں کو ایک ہی منبع سے نکلتے دیکھتی ہے۔ وہ یہ بھی جان لیتا ہے کہ یہ سب کے سب جب اپنے اصل سے پھوٹے تھے تو کتنے خالص اور شفاف تھے لیکن جوں جوں یہ آگے بڑھتے گئے ان میں آلائشیں ملنی شروع ہو گئیں۔ اور آخر کار نتیجہ یہ نکلا کہ صاف اور مصفے پانی اتنا گدلا ہو گیا کہ یہ پہچاننا مشکل ہو گیا کہ اس میں پانی کتنا ہے۔ اور گاڑ کتنی۔ لیکن حکیم اور صدیق مظاہر کے دھوکے میں نہیں آتا۔ وہ اصل حقیقت کو بے حجاب دیکھتا ہے اور پھر دوسروں کو بھی اس سے آگاہ کرتا ہے۔

مولانا فرماتے ہیں کہ شاہ ولی اللہ صاحب ایسے ہی حکیم اور صدیق تھے۔ جنہوں نے سارے ادیان، مذاہب اور شریعتوں کا اصلاً ایک ہونا ثابت کیا۔ پھر ان بنیادی اصولوں کا تعین بھی کیا۔ جو ہر دین کا مقصود حقیقی تھے۔ اور ہر مذہب اور شریعت ان کو پورا کرنا اپنا فرض سمجھتی رہی۔ شاہ صاحب "ہمعات"

میں لکھتے ہیں: ”فقیر پر یہ بات روشن کی گئی ہے کہ تہذیب نفس کے سلسلے میں جو چیز شریعت میں مطلوب ہے وہ چار خصلتیں ہیں۔ حق تعالیٰ نے انبیاء کو انہی چار خصلتوں کے لیے بھیجا۔ تمام ملل حقہ میں انہی چار خصلتوں کا ارشاد اور ان کے حاصل کرنے کی ترغیب و تحریریں ہیں۔ ”بر“ یعنی بھلائی انہی چار خصلتوں کا حاصل ہے۔ اور گناہ سے مراد وہ عقائد و اعمال و اخلاق ہیں جو انہیں چار خصلتوں کی ضد ہیں۔

ان چار خصلتوں میں ایک طہارت ہے۔ اس کی حقیقت اور اس کی طرف میلان ہر سلیم الفطرت انسان کے اندر ودیعت کیا گیا ہے۔ یہ گمان نہ کر لینا کہ یہاں طہارت سے مراد وضو اور غسل ہے بلکہ طہارت کا اصل مقصود وضو اور غسل کی روح اور ان کا نور ہے۔ جب آدمی نجاستوں میں آلودہ ہو۔ میل اوچرک اور بال اس کے بدن پر جمع ہوں اور بول و براز اور ریح نے اس کے معدہ میں گرانی پیدا کی ہو تو ضروری اور لازمی بات ہے کہ وہ انقباض تنگی اور حزن اپنے اندر پائے گا۔ اور جب وہ غسل کرے گا۔ زائد بالوں کو دور کرے گا۔ نیا لباس زیب تن کرے گا اور خوشبو لگائے گا تو اسے اپنے نفس میں انشراح سرور اور انبساط کا احساس ہوگا۔ حاصل کلام یہ ہے کہ طہارت یہی وجدانی کیفیت ہے جو انس اور نور سے تعبیر کی جاسکتی ہے۔

دوسری خصلت خدا تعالیٰ کے لیے خضوع یعنی نہایت درجہ کی عجز و نیاز مندی ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ایک سلیم الفطرت شخص جب طبعی اور خارجی تشویشوں سے فراغت کے بعد صفات الہی اس کے جلال اور اس کی کبریائی میں غور کرتا ہے تو اس پر ایک حیرت اور دہشت کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ یہی حیرت اور دہشت خشوع، خضوع، انخبات یعنی نیاز مندی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ایک سوچنے والا انسان جب کائنات کی اس گتھی کو حل کرنے سے عاجز آ جاتا ہے۔ اور اس عجز اور افتادگی کی حالت میں وہ کسی اور قوت کے سامنے اپنے آپ کو بے دست و پا پاتا ہے تو اس کی یہ بے دست و پا ہنگی اسے مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنے سے بلند تر کسی اور قوت کو مانے۔ ایک طبعی نے اسے مادہ سے تعبیر کیا۔ فلسفی نے اسے عقل کل مانا۔ اور ایک مذہبی آدمی اسے خدا کہتا ہے۔ بہر حال انسان کہیں نہ کہیں اس کائنات کے سامنے اپنے آپ کو ضرور مجبور پاتا ہے اور یہی مجبوری اسے خضوع کی طرف لے جاتی ہے۔

تیسری خصلت ساحت اور فیاضی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ نفس طلب لذت حب انتقام بخل اور حرص وغیرہ سے مغلوب نہ ہو۔ اس ذیل میں عفت، جدوجہد، صبر و عفو، سخاوت، قناعت اور تقویٰ تمام آجاتے ہیں۔ شکم اور فرج کی خواہش کے قبول نہ کرنے کا نام عفت ہے۔ آسائش اور ترک عمل کی خواہش کو قبول نہ کرنے کا نام جدوجہد ہے۔ جزع و فزع کو روکنا صبر ہے۔ انتقام کی خواہش کو دباننا عفو۔

خواہش بخل کو چھوڑ دینے کا نام سخاوت اور حرص کو قبول نہ کرنا قناعت ہے۔ شریعت کی بنائی ہوئی حدود سے تجاوز نہ کرنا تقویٰ ہے۔

چوتھی خصلت عدالت ہے۔ سیاسی اور اجتماعی نظاموں کی روح رواں یہی خصلت ہے۔ ادب، کفایت، حریت، سیاست مدینہ اور حسن معاشرت وغیرہ سب عدالت کی شاخیں ہیں۔ اپنی حرکات و سکنات پر نگاہ رکھنا، عمدہ اور بہتر وضع اختیار کرنا اور دل کو ہمیشہ اس طرف متوجہ رکھنا ادب ہے۔ جمع و خرچ، خرید و فروخت اور تمام معاملات میں عقل و تدبیر سے کام لینا کفایت ہے۔ خانہ داری کے کاموں کو بخوبی انجام دینا حریت ہے اور شہروں اور لشکروں کا اچھا انتظام کرنا سیاست مدنیہ ہے۔ بھائیوں میں نیک زندگی بسر کرنا ہر ایک کے حق کو پہچاننا اور ان سے الفت و بشاشت سے پیش آنا حسن معاشرت ہے۔

یہی چار اخلاق ہیں جن کی تکمیل سے انسانیت کو ترقی ملتی ہے اور ان کو چھوڑنے سے انسان قعر مذلت میں گرتا ہے۔ اس دنیا میں جتنے بھی تمدن بنے جس قدر بھی فکری ادارے قائم ہوئے اور جو بھی شریعتیں معرض وجود میں آئیں، اگر ان کے پیش نظر انسانوں کو اٹھانا اور ان کی حالت کو درست کرنا تھا تو انہوں نے انہی چار اخلاق کو سنوارنے کی کوشش کی۔ اس سلسلہ میں اسلام عیسائیت اور یہودیت کا معاملہ تو بالکل ظاہر ہے۔ لیکن اگر چینی فلسفہ اخلاق، ہندوؤں کے مذہبی فکر، ایرانیوں کے نظام حیات، یونانیوں کی حکمت، قدیم مصریوں کے مذہب اور اشوریوں کی روایتوں کا بغور مطالعہ کریں تو آپ کو کسی نہ کسی صورت میں ان چار اخلاق کی درستی اور ان کی ضدوں سے بچنے کی تاکید ملے گی۔ ایرانی حکیم بزرجمبر کے اقوال افلاطون کا اپنی کتاب ”ریاست“ میں عدالت کو زندگی کا اساس ثابت کرنا۔ قدیم مصریوں کے مذہبی صحیفہ ”کتاب الموتی“ کے ارشادات اور ہندوؤں کے ویدوں اور گیتا کا پر حکمت کلام اور چینیوں کے اخلاقی فلسفی کنفوشس کی تعلیمات، ان سب کا حاصل کم و بیش یہی تھا کہ انسانیت کے ان چار بنیادی اخلاق کو ترقی دی جائے۔ تمام رسول اسی لیے مبعوث ہوئے اور تمام حق شناس حکیم اور صدیق اپنی اپنی قوموں کو یہی پیغام سناتے رہے۔

قوموں اور تمدنوں کے اس تاریخی پس منظر کو سامنے رکھیے اور پھر مولانا سورہ ”والعصر“ کی جو تفسیر فرماتے ہیں وہ سنیے:

”انسانی تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ انسان ہمیشہ گھائے اور نقصان میں رہے۔ سوائے ان کے جو اللہ پر ایمان لائے۔ انہوں نے نیک کام کیے۔ ایک دوسرے کو نیک کاموں کی صلاح دی اور اس راہ میں جو مشکلات پیش آئیں انہیں برداشت کیا۔“

”ایمان باللہ۔ اعمال صالحات۔“ ”تواصی بالحق“ اور ”تواصی بالصبر۔“ انسانی تاریخ کی یہ چار صدائیں ہیں جنہوں نے اس پر عمل کیا وہ فائز و کامراں ہوئے اور جنہوں نے ان سے بے پروائی برتی۔ وہ ناکام و خاسر رہے۔ یہ بنیادی صدائیں اتنی ہی قدیم ہیں جتنی خود انسانیت۔ زمانے اور حالات کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ ان کی عملی شکلیں بھی بدلتی رہیں۔ لیکن اصل برابر قائم و دائم ہے۔ عملی شکلوں کو شریعت منہاج اور نظام کا نام دیا گیا اور اس اصل کو ہماری زبان میں ”دین“ کہتے ہیں۔ شریعت اور منہاج کا مقصود اصلی یہ ہے کہ انسان میں یہ چار اخلاق پیدا ہوں۔ شرعی احکام و قواعد جسم میں۔ اور یہ اخلاق روح۔ روح نہ ہو تو جسم بے معنی ہے۔ اور جسم کے بغیر روح کا وجود ممکن نہیں۔

کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ اس طرح سے تمام انسانیت کے بنیادی اخلاق کا تعین کرنا محض مولانا کی اُتج ہے اور ہیومنزم (Humanism) بین الاقوامیت یا انسانیت کا جو ان دنوں عام جہ چاہئے اس سے متاثر ہو کر مولانا قرآن کی یا شاہ ولی اللہ کی تعلیمات کی یوں تعبیریں کرتے ہیں۔ لیکن یہ خیال درست نہیں۔ سچ پوچھیے تو ہمارا سارا تصوف اسی روح انسانیت سے بھرا پڑا ہے۔ اور خود صوفیائے کرام کی زندگیوں اسی روح کے زندہ نمونے تھے۔ بے شک وہ اسلام کو سچا دین مانتے تھے۔ اور شریعت کے احکام کے پوری طرح پابند تھے۔ لیکن وہ غیر مذہب والوں سے بڑی محبت سے پیش آتے تھے۔ اس کا سبب ان کا یہی انسانیت کا تصور تھا اور اسی کی برکت تھی کہ ان کے ذریعہ دین اسلام کی عام اشاعت ہوئی۔ علماء کرام دراصل اسلامی سلطنت کے مقنن اور محافظ تھے۔ چنانچہ قانون کو چلانا ان کا کام تھا۔ صوفیاء اسلام کے پرچارک اور مبلغ تھے۔ چنانچہ روح اسلامی کی حفاظت اور اس کی اشاعت ان کے ذمہ تھی۔ ان صوفیاء کے متعلق ایک ہندو اہل قلم لکھتے ہیں:

”اسلام ہندوستان میں جس سرعت سے پھیلا اس کا باعث بیشتر انہی اولیاء اور صوفیوں کی امن پسند اور روادارانہ کوشش ہے۔ ان صوفیائے کرام نے محبت اور ہمدردی کے ذریعہ یہاں کے باشندوں کے دلوں کی تسخیر کی۔ ان کی نگاہ میں تمام مذاہب کے پیرو مساوی تھے۔ انہوں نے ہندوؤں کو مفتوح اور کافر نہیں سمجھا۔ بلکہ انہیں خدا کے ایسے بندے خیال کیا جنہیں نور ہدایت کی ضرورت تھی۔“

مسلمان فلسفیوں نے بھی اپنی کتابوں میں نوع انسانی کی اس خیالی وحدت کی طرف اکثر اشارہ کیا ہے۔ اندلس کے مشہور مفکر ابن طفیل نے ”حی بن یقظان“ کا قصہ لکھ کر یہ بتانے کی کوشش کی تھی کہ فلسفہ اور مذہب میں بنیادی طور پر کوئی فرق نہیں۔ دونوں ایک ہی حقیقت تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ گوان کی راہیں جدا جدا ہیں لیکن سب کا مقصود اصل ایک ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ جس طرح سارے ادیان اصلاً ایک ہیں۔ اور ان سب کا نقطہ اشتراک متعین کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح سارے ادیان اور نظامہائے تمدن کے بنیادی اخلاق بھی ایک ہیں۔ ضرورت ہے کہ اخلاق انسانی کی یہ بنیادی وحدت ذہن میں رہے تاکہ انسان مختلف ملتوں اور قوموں کی زندگیوں پر حکم لگاتے وقت بے انصافی کا مرتکب نہ ہو اور انہیں غیر نہ سمجھے۔ ”اپنائیت“ کے خیال سے جو نصیحت ہوتی ہے اس کا رنگ اور ہوتا ہے اور جس نصیحت کی بنا ”غیریت“ ہو۔ وہ اور شکل اختیار کر لیتی ہے۔

مولانا فرماتے ہیں کہ اگر ہم اس حقیقت کو سمجھ جائیں تو پھر ہندوؤں اور مسلمانوں کے نظریہ اخلاق میں اصولی نزاع نہ رہے گا اور ہم میں فراخ دلی اور رواداری بھی پیدا ہو جائے گی۔ بے شک سماج کے چھوٹے طبقوں میں تو چپقلش موجود رہے گی۔ لیکن ایسے ہی جیسا کہ ایک ہی ملت کے مختلف فرقوں میں مخصوص رجحانات اور استعدادوں کی بنا پر ذہنی اور مذہبی اختلافات ہوتے ہیں اور مسلمانوں میں تو اس قسم کے جھگڑوں کی کمی بھی نہیں۔ لیکن جہاں تک اصحاب عقل و رشد کا تعلق ہے ان کو آفتاب نبوت سے پھولی ہوئی شعاعوں اور حکیم کے دماغ سے نکلے ہوئے اخلاقی نظام میں فرق مراتب تو نظر آئے گا لیکن وہ دونوں کو ایک دوسرے کی ضد نہ سمجھیں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ صالح ہندو اور صالح مسلمان ایک دوسرے کی خوبیوں کو بحیثیت انسان کے نظر انصاف سے جانچنے کے قابل ہوں گے اور دوسرے کی اچھائیوں کو اس لیے تسلیم کرنے سے انکار نہ کر دیا جائے گا کہ وہ دوسرے مذہب ہی گروہ کا ہے۔

مولانا کے خیال میں یہ تصور صرف ہندوستان کے مذہبی تنازعات کی درستی کو کم نہیں کر سکتا بلکہ کل بنی نوع انسان اس کے طفیل موجودہ خلفشار سے نکل سکتی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ ہر قوم کے عقل مند طبقوں کا رجحان اب اس طرف ہو رہا ہے اور وہ کوشش کر رہے ہیں کہ اپنے اپنے فکری نظاموں کو عالمگیر انسانیت کا ترجمان بنا کر پیش کریں۔ لیکن کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ وہ دین جو صحیح معنوں میں ساری انسانیت کا دین تھا۔ وہ کتاب جو کل نوع انسانی کی ہدایت کی علمبردار تھی۔ وہ ملت جس نے سب قوموں کو ایک بنایا اور جس کا تمدن ساری انسانیت کی ”باقیات صالحات“ کا مرقع تھا۔ وہ دین وہ کتاب وہ ملت اور اس کا تمدن ایک فرقہ کی جاگیر بن گیا ہے اور وہ لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ اس وسعت پذیر دور میں جس میں کہہ زمین کی سب دوریاں سکڑ گئی ہیں۔ ملکوں، قوموں اور براعظموں کی حدیں سکڑتی جا رہی ہیں اور ریل، جہاز، طیاروں اور ریڈیو نے سب انسانوں کو اپنی کہنے اور دوسروں کی سننے کے لیے ایک انسانی برادری میں بدل دیا ہے۔ اس زمانے میں ایسی تعلیم کو جو صحیح معنوں میں عالمگیر اور انسانی تھی، ایک گروہ اور جماعت میں محدود کر دینا کتنا بڑا ظلم ہے۔ معلوم نہیں مسلمان اسلام کو کب سمجھیں گے اور قرآن کے اصل پیغام کو کب اپنائیں گے۔

برقی رو ہے جو انسان کے اندر دوڑ جاتی ہے۔ دھرم اور شریعت پوجا پاٹ اور نماز روزے کا نام تصوف نہیں۔ جذبہ تصوف ان کاموں کو خلوص سے عقیدت سے اور دل و جان سے کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ تصوف بذات خود زندگی میں کوئی خاص راہ عمل متعین نہیں کرتا۔ بلکہ انسان کو راہ عمل پر ہمت اور استقامت سے چلانے والا جذبہ ہے۔

یوں تو انسان سب ایک ہیں۔ سب میں قدرت نے کم و بیش ایک سے خصائص و دیعت کیے ہیں۔ اختلاف ہوتا ہے صرف ان خصائص سے کام لینے یا نہ لینے سے۔ تصوف ان انسانی خصائص کو ابھارنے، سنوارنے اور ان سے مفید کام لینے کا ذمہ لیتا ہے۔ اس لحاظ سے تصوف کا پیام سب کے لیے ہے۔ کسی دھرم یا شریعت کی اس میں تخصیص نہیں۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ انسان کو اصلاً دھرم اور شریعت کی ضرورت نہیں۔ تصوف دھرم اور شریعت کی روح کو اپنانے کی تلقین کرتا ہے۔ وہ ایمان پر زور دیتا ہے۔ اعمال نیک کی ضرورت بتاتا ہے۔ صوفی شریعت اور دھرم کے بتائے ہوئے رستوں پر چلتا ہے۔ لیکن اپنی دھن سے اور اپنے جذبہ اور امنگ سے۔ اس دھن جذبہ اور امنگ کو پیدا کرنا تصوف کا کام ہے۔

تصوف انسانی "انا" کو بیدار کرنے کی کوشش کرتا ہے اور مولانا کے الفاظ میں جب انسان میں یہ باطنی شعور بیدار ہو جاتا ہے تو وہ اس وقت یہ محسوس کرتا ہے کہ یہ "انا" کسی اور وجود برتر کا پر تو ہے۔ یا یہ انسانی "انا" کسی بڑے "انا" کا فیضان ہے۔ یہ ہے انسان کا شعور خداوند تعالیٰ کے وجود کا۔ سکندر نامہ میں نظامی نے اس حقیقت کو یوں پیش کیا ہے۔

توئی آنکہ تا من منم بامنی

یعنی تو وہ ہے کہ جب میں اپنی انسانیت کا خیال کرتا ہوں تو تیری جھلک اس میں نظر آتی ہے۔ مولانا نے اس خیال کی مزید وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ ایسی انسانیت کو بیدار کرنا انبیاء کی تعلیم کا اصل مقصد ہے۔ جب اس زندگی میں کسی فرد کی انسانیت بیدار ہو جائے۔ تو موت کے بعد جب بدن اور اس انسانیت میں مفارقت ہو جاتی ہے تو یہ انسانیت دوسری دنیا میں بلا خوف و خطر ترقی کی راہیں طے کرتی چلی جاتی ہے۔ اسے ہم فوز و فلاح اور جنت کہتے ہیں۔ اور جس کی انسانیت خوابیدہ رہی اور ظلم و کفر کی وجہ سے اس نے اپنی انسانیت کو ڈھانپنے رکھا تو اس زندگی کے بعد جہنم کا عذاب ان پر دوں کو جلا کر پھر اس کی انسانیت کو بجلی اور بیدار کر دے گا۔ اور جس دن اس شخص کی انسانیت بیدار ہوگی وہ جہنم سے نکل جائے گا۔ مولانا نے فرمایا کہ محشر نام ہے ان تمام انسانیتوں کے ایک مرکز پر جمع ہونے کا۔ انسانیت کا بیدار نہ ہونا مولانا کے نزدیک کفر ہے اور جس کی انسانیت بیدار ہو جائے گوری طور

تصوف

مولانا کی عقلی جستجو نہیں اس طرف لے گئی کہ انسانیت کا سب سے اعلیٰ اور جامع فکر اسلام ہے اور اسلام کے مطالعہ سے آپ اس نتیجہ پر پہنچے کہ جہاد یا انقلاب افضل ترین عمل ہے۔ لیکن جس چیز نے اس نصب العین اور مسلک کو مولانا کی زندگی میں ایک زندہ فعال اور موثر حقیقت بنا دیا ہے اور آپ کی ساری زندگی کو اسی رنگ میں رنگ دیا وہ آپ کی طبیعت کا رجحان تصوف ہے۔ تصوف کا یہ ذوق فطری ہوتا ہے۔ اس میں کسی مذہب یا ملت کی قید نہیں ہوتی۔ چنانچہ ہر قوم ہر مذہب اور ہر زمانہ میں صوفی ہوتے چلے آئے ہیں۔

بے شک مولانا کا بھی تصوف کا یہ ذوق قدرت کا عطیہ تھا لیکن اسلام قبول کرنے کی وجہ سے آپ کو اس ذوق کی نشوونما اور تکمیل کے لیے بہترین مواقع نصیب ہوئے۔ آپ خدا رسیدہ مرشدوں اور صاحب کمال عارفوں کی صحبتوں میں رہے اور اسلامی تصوف کی روایات میں تصوف کا جو اصل مدعا ہے اسے آپ نے منتہائے کمال پر جلوہ گر پایا۔ جس طرح اسلام دینوں کا خلاصہ اور قرآن تمام الہامی کتابوں کا حاصل ہے اسی طرح اسلامی تصوف مولانا کے نزدیک تمام قوموں اور ملتوں کے متصوفانہ کمالات کا منتخب مجموعہ ہے۔

تصوف کا رجحان انسانی ذہن کا ایک خاص جوہر ہے۔ بعض طبیعتوں کو قدرت کی طرف سے اس جوہر کا دافر حصہ ملتا ہے اور بعض کو کم۔ پھر بعض کو اس ملکہ کی نشوونما کے لیے سازگار ماحول نصیب ہو جاتا ہے اور بعض اس سے محروم رہتے ہیں۔ بہر حال یہ جذبہ کسی نہ کسی حد تک ہر انسان میں ہوتا ضرور ہے لیکن آخر یہ جذبہ تصوف ہے کیا؟ اور انسانی زندگی میں یہ کس طرح اثر انداز ہوتا ہے؟

بات یہ ہے کہ انسان محض گوشت پوست کا نام نہیں۔ اس گوشت پوست کے اندر ایک چیز ہے جو بولتی ہے سوچتی ہے اور جو ارجح سے کام لیتی ہے۔ یہ انسان کا "میں" یا "انا" ہے۔ اسے نفس کہہ لیجئے یا روح کا نام دیجیئے۔ اس "انا" یا "میں" کا کام کیا ہے؟ یہ سوچتا ہے۔ یہ کچھ کہتا ہے اور پھر اس کے لیے جدوجہد بھی کرتا ہے۔ تصوف انسان کے اس "میں" میں ایک حرکت پیدا کرتا ہے۔ اسے ایک دلولہ دیتا ہے۔ اس میں ایک تموج پیدا کرتا ہے کہ وہ سوچے مانگے اور اس کے لیے مصروف عمل ہو۔ یہ ایک

پراسے لوگ کافر کہتے ہوں وہ حقیقت میں مسلمان ہوتا ہے۔

منکر حق نزد ملا کافر است

منکر خود نزد من کافر تر است

مولانا نے فرمایا کہ میں دین کو ایسی بنا پر انسانیت کے لیے ضروری سمجھتا ہوں کہ اس پر چلنے سے ہر فرد انسان کی انسانیت بیدار ہوتی ہے۔ بد قسمتی سے لوگوں نے خاص اپنے یا اپنے خاندان یا صرف اپنے ملک کے خاص اور محدود مذہب کو دین حق مان لیا۔ جو ظاہری طور طریقوں میں ان سے مختلف ہوا اس کو کافر قرار دیا اور یہ نہ دیکھا کہ دین کا جو مقصود حقیقی ہے وہ ان کے ہاتھ آتا بھی ہے یا نہیں۔ حقیقت میں تصوف دلوں کو دین کی اس روح سے آشنا کرتا ہے۔ رسول اکرم نے اسی کو ”احسان“ سے تعبیر فرمایا ہے:

مسلم شریف میں ایک حدیث ہے: ”حضرت عمر بن الخطاب فرماتے ہیں کہ ہم لوگ ایک دن رسول اکرم کے پاس بیٹھے تھے کہ ایک شخص آیا اور آپ سے گھٹنے سے گھٹنا ملا کر بیٹھ گیا۔ رانوں پر اس نے دونوں ہاتھ رکھ لیے۔ اس شخص کے بال بہت سیاہ تھے اور کپڑے بہت سفید۔ ہم لوگوں میں اسے کوئی جانتا نہ تھا۔ اور نہ اس کے اوپر سفر کے آثار نمایاں تھے۔ اس نے کہا کہ اے محمد! ہمیں اسلام کی حقیقت بتائیے۔ آپ نے فرمایا کہ تمہارا گواہی دینا کہ کوئی معبود خدا کے علاوہ نہیں۔ محمد خدا کے رسول ہیں۔ نماز کا قائم کرنا۔ زکوٰۃ دینا۔ رمضان کے روزے رکھنا اور خدا کے گھر کا حج کرنا اگر وہاں جانے کی قدرت ہو۔ اس شخص نے کہا۔ آپ نے سچ فرمایا۔ حضرت عمر کہتے ہیں۔ ہم کو تعجب ہوا کہ یہ شخص خود ہی سوال کرتا ہے اور پھر تصدیق بھی کرتا ہے۔ پھر اس نے کہا۔ ایمان کی حقیقت مجھے بتائیے۔ آپ نے فرمایا۔ کہ تمہارا یقین کرنا خدا کا۔ اس کے فرشتوں کا۔ اس کی کتابوں کا اس کے رسول کا اور اس بات کا یقین کرنا کہ بھلائی اور برائی سب کا خالق خدا ہی ہے۔ اس شخص نے کہا کہ آپ نے سچ فرمایا۔ اور پھر کہا کہ ”احسان“ کی حقیقت مجھے بتائیے۔ آپ نے فرمایا کہ تمہارا اس طرح عبادت کرنا گویا خدا کو تم دیکھ رہے ہو یا تمہارا یہ سمجھنا کہ خدا تمہیں دیکھ رہا ہے۔“

”احسان“ کی یہ کیفیت کتابوں سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ یہ بزرگوں کی صحبت میں بیٹھنے اور ان کی توجہ سے حاصل ہو سکتی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ ایک تو میری خوش بختی یہ تھی کہ خدا نے مجھے اسلام کی نعمت سے سرفراز فرمایا۔ اور دوسرا اکرم اس نے یہ کیا کہ ایسے مرشد اور استاد عطا فرمائے جن کے فیض صحبت سے میں اپنی دلی مراد کو پہنچ گیا۔ موصوف اپنی زندگی کے ابتدائی حالات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے

سوانح حیات شاہ محمد حسین صاحب الہ آبادی۔

ہیں:-

”اللہ کی خاص رحمت سے جس طرح ابتدائی عمر میں اسلام کی سمجھ آسان ہو گئی اسی طرح خاص رحمت کا اثر یہ بھی ہوا کہ سندھ میں میں حضرت حافظ محمد صدیق صاحب بھر چونڈی والے کی خدمت میں پہنچ گیا جو اپنے وقت کے جنید اور سید العارفین تھے۔ چند ماہ میں ان کی صحبت میں رہا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ اسلامی شریعت میرے لیے طبیعت ثانیہ بن گئی جس طرح ایک پیدائشی مسلمان کی ہوتی ہے۔ حضرت نے ایک روز میرے سامنے اپنے لوگوں کو مخاطب فرمایا کہ عبید اللہ نے اللہ کے لیے ہم کو اپنا ماں باپ بنایا۔ اس کلمہ مبارک کی تاثیر خاص میرے دل میں محفوظ ہے۔ میں نے قادری راشدی طریقہ سے ان کی بیعت کی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ محسوس ہوا کہ بڑے انسان سے بہت کم مرغوب ہوتا ہوں۔“

حضرت حافظ محمد صدیق صاحب سے رخصت ہو کر مولانا دیوبند تشریف لے گئے۔ تعلیم سے فارغ ہو کر جب آپ سندھ لوٹے حافظ صاحب کا انتقال ہو چکا تھا۔ چنانچہ آپ نے دوسرے صاحب کمال بزرگوں کی صحبت اختیار کی۔ اس بارے میں مولانا لکھتے ہیں:-

”اس کے علاوہ حضرت مولانا رشید الدین صاحب العلم الثالث کی صحبت سے مستفید ہوا۔ میں نے ان کی کرامتیں دیکھیں۔ ذکر اسما الحسنی میں نے انہیں سے سیکھا۔ وہ دعوت توحید و جہاد کے ایک مجدد تھے۔ حضرت مولانا ابوتراب راشد اللہ صاحب العلم الرابع سے علمی صحبتیں رہیں۔ وہ علم حدیث کے بڑے جید عالم اور صاحب تصانیف تھے۔ ان کے ساتھ قاضی فتح محمد صاحب کی علمی صحبت بھی ہمیشہ یاد رہے گی۔ اس عرصہ میں طریقہ قادریہ اور نقشبندیہ مجددیہ کے اشغال و اذکار بھی حضرت سید العارفین کے خلیفہ اعظم مولانا ابوالسراج دین پوری سے سیکھتا رہا۔“

غرض مولانا کے دل میں اسلام تصوف کے ذریعہ رچا اور ان بزرگوں اور مرشدوں کے فیض صحبت سے انہیں ایسی طمانیت نصیب ہوئی کہ سخت سے سخت مصیبت میں بھی آپ کا دل کبھی ہراساں نہیں ہوتا۔ اتنا زمانہ گزرنے کے بعد بھی جب کبھی آپ اپنے ان بزرگوں کا ذکر کرتے ہیں تو آپ پر تاثر اور رقت کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ مولانا ذکر و اذکار کے اب تک بڑے پابند ہیں۔ آپ کا معمول یہ ہے کہ صبح کی نماز کے بعد سیر کو نکل جاتے ہیں اور سیر کے دوران میں ذکر کرتے جاتے ہیں

کوئی موسم ہو آپ کے اس معمول میں کبھی فرق نہیں آتا۔ آپ کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ ذکر و اذکار کا معاملہ پردہ اخفا ہی میں رہے۔ ایک دفعہ دسمبر اور جنوری کے مہینوں میں مولانا کا جامعہ نگر میں قیام تھا۔ دہلی میں اس دفعہ سخت کڑا کے کی سردی پڑ رہی تھی۔ بعض دفعہ صبح کو اتنی کبر چھائی ہوتی تھی کہ دن کے دس گیارہ بجے تک دھوپ دیکھنے میں نہ آتی تھی۔ مولانا حسب معمول بہت سویرے اٹھتے اور سیر کو نکل جاتے۔ جامعہ نگر سے تین چار فرلانگ پر دریائے جمنا ہے جہاں سے ایک نہر نکلتی ہے۔ موصوف نہر پر ٹھنڈے پانی سے وضو کرتے نماز پڑھتے اور وہیں چہل قدمی کرتے کرتے ذکر و اذکار سے فارغ ہو جاتے۔ اسی زمانے میں جوانوں کا یہ حال تھا کہ سردی کے مارے بستروں پر ٹھٹھا کرتے۔ جامعہ کے ارباب حل و عقد نے اس خیال سے کہ سردی حد سے بڑھ گئی ہے طلبہ کی صبح کی کسرت جو لازمی ہے چند دنوں کے لیے معاف کر دی تھی۔ لیکن مولانا تھے کہ صبح سویرے اونی جب پہنے نماز اور ذکر کے لیے ہر روز دریا پر پہنچ جاتے۔

صبح کے ان معمولات سے مولانا جب فارغ ہوتے ہیں تو ان کی طبیعت میں بڑی تازگی اور انبساط ہوتا ہے۔ اس وقت آپ کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ طلبہ موجود ہوں تاکہ آپ درس شروع کر دیں۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوا کہ مولانا بڑے پریشان نظر آئے ہیں اور آپ کے چہرے پر برہمی اور ذہنی خلجان کے آثار نمایاں ہیں اور گفتگو کے تلخ لہجے میں بھی دکھ اور باطنی اذیت کا اظہار ہوتا ہے۔ مولانا کی یہ کیفیت اس وقت ہوتی ہے جب کوئی سخت معاملہ درپیش ہو اور اس کو حل کرنے کے لیے مادی حالات نظر نہ آئیں۔ آپ کو اس طرح کی جانناہ اذیتوں سے اکثر دوچار ہونا پڑتا ہے۔ چنانچہ شام کو مولانا کی مجلس میں بیٹھے والوں میں سے ہر ایک نے محسوس بھی کیا کہ مولانا کی طبیعت پر کسی چیز کا بوجھ ہے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اس تردد اور اضطراب میں مولانا اس رات کو مطلق سونہ سکے ہوں۔ لیکن صبح ذکر و اذکار سے فارغ ہونے کے بعد مولانا کو دیکھتے تو طبیعت بالکل بحال نظر آئے گی۔ آپ کے چہرے پر پورا سکون اور قرار ملے گا۔ اور دیکھنے والا سمجھے گا کہ رات کی کوفت کا موصوف پر ذرا بھی اثر نہیں ہے۔ آپ گفتگو فرمائیں گے تو اس میں کہیں گزشتہ رات کی طرح غصہ کے آثار نہ ہوں گے بلکہ باتوں میں نئے عزم اور ولولوں کی جھلک ملے گی۔

مولانا کو مکہ معظمہ کے زمانہ قیام میں سخت معاشی پریشانیوں میں سے گزرنا پڑا۔ آمدنی کا کوئی مستقل ذریعہ نہ تھا۔ ہندوستان سے بعض احباب کچھ بھیج دیتے تھے لیکن وہ نا کافی ہوتا تھا۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوا کہ ان کے پاس صرف اللہ کا نام رہ گیا اور فاقوں تک نوبت پہنچ گئی۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ دو تین دن تک کھانے کو کچھ میسر نہ آیا۔ شاید عید الفطر کا دن تھا۔ مولانا نے اپنے عزیز سے جو زندگی بھر ان کی

خدمت میں رہے ہیں فرمایا کہ میں نماز کے لیے خانہ کعبہ جاتا ہوں۔ خدا تعالیٰ اپنے بندوں سے غافل تو نہیں ہے۔ وہ کچھ دے گا تو کھالیں گے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ اس طرح کے فاقے کئی بار آئے ہیں۔ لیکن طبیعت کبھی بد دل نہیں ہوئی۔ اور دل کو ہمیشہ یہ یقین رہا کہ ایک ذات ہے جو سب کا خیال رکھتی ہے۔ اس یقین نے سخت سے سخت مصیبتوں میں بھی مجھے اطمینان اور سکون بخشا اور میں اس کی رحمت سے اپنی زندگی میں کبھی بھی ناامید نہیں ہوا۔

یہ طمانیت یہ شر کے مقابلے میں خیر کے غالب آنے کا عقیدہ یہ یقین کہ دنیا کے ان جھنجھوں پریشانیوں، دشواریوں اور نا کامیوں کی حیثیت عارضی ہے۔ یہ یاس کو دل میں راہ نہ دینا اور یہ اپنے مقصد اور نصب العین پر اتنا مستحکم ایمان غرض مولانا کی یہ فطری رجائیت یہ سب فیوض ہیں ان کے اس عقیدے کے کہ ہماری اس مادی زندگی کے ماوراء بھی کچھ ہے۔ اس کائنات میں جو کچھ ہے۔ وہ سب اسی کا پرتو ہے اور یہ کہ ہم ایک بہت بڑے وجود کا ایک حصہ ہیں۔ یہ وجود لا انتہا ہے۔ اس کی وسعت ناپیدا کنار شہی اور گو ہم اس کے مقابلے میں بے حد حقیر اور ہیچ ہیں۔ لیکن اس بڑے وجود کو ہمارا خیال ہے اور اس کی کار سازی برابر ہم پر نگاہ رکھتی ہے۔ ہماری زندگی ایک بے معنی کھیل نہیں بلکہ ہم ایک مقصد لے کر اس دنیا میں آئے ہیں۔ اور اس مقصد کی تکمیل کے لیے جو ہم جدوجہد کرتے ہیں وہ ہمیں بعد میں ایک اور اعلیٰ اور برتر زندگی کا حق دار بنا دیتی ہے۔ یعنی زندگی کی ان تمام اعلیٰ اور ارفع قدروں پر ایمان جسے ہم آسان لفظوں میں خدا کہہ دیتے ہیں۔ یہی ایمان و عقیدہ ہے جو مولانا کی زندگی میں سب سے بڑا محرک رہا ہے۔ اس ایمان اور عقیدہ میں اس قدر پختگی اور استقامت کہ دنیا ادھر سے ادھر ہو جائے لیکن اس میں تزلزل نہ آئے۔ یہ سب تصوف کا دین ہے۔ علم کے ذریعہ تو انسان دلیل اور منطق کے زور سے اپنے مقصد پر ایمان لاتا ہے لیکن صاحب تصوف اپنے مقصد کو آنکھوں کے سامنے موجود پاتا ہے۔ چنانچہ مولانا ان معنوں میں پورے صوفی ہیں کہ وہ جن چیزوں کو مانتے ہیں وہ ان کے لیے علم الیقین اور عین الیقین نہیں بلکہ حق الیقین کا درجہ رکھتی ہیں۔ یہ چیزیں ان کی ذات میں یوں ساگئی ہیں کہ اب یہ فرق کرنا ناممکن ہو گیا ہے کہ آپ کی شخصی زندگی کی حد کہاں ختم ہوتی ہے اور مقاصد اور نصب العین کی منزل کہاں سے شروع ہوتی ہے۔

اس لحاظ سے دیکھیے تو مولانا کی زندگی عبارت ہے ان کے نصب العین سے اور ان کے نصب العین سے مراد ان کی زندگی ہے۔

جب کوئی مقصد اور نصب العین اس طرح ہمارے دلوں میں گھر کر لیتا ہے ہم اسے یوں اپنا لیتے ہیں اور جان و دل سے اس کے ہو جاتے ہیں تو پھر ہماری زندگی ہمارے تمام احساسات ہمارے دکھ

در، تکلیفیں اور راحتیں سب ثانوی حیثیت اختیار کر لیتی ہیں اور ہماری سب سے عزیز متاع ہمارا وہ نصب العین ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس راہ میں جتنی بھی مشکلات آئیں، طبیعت بخوشی برداشت کرتی ہے۔ نہ کسی صلہ کی آرزو رہتی ہے اور نہ معاوضہ کی پروا۔ کوشش یہ ہوتی ہے کہ جتنیں تو اپنے نصب العین کے لیے جتیں اور موت آئے تو اسی راہ میں آئے۔ انسان میں یہ کیفیت اس وقت تک پیدا نہیں ہوتی۔ جب تک وہ اپنے نفس کی اصلاح نہ کر لے۔ تصوف کا منصب دراصل اسی نفس کی اصلاح اور تزکیہ ہے۔

تصوف کے مقامات میں سے ایک فنا کا مقام ہے۔ فنا کا مفہوم یہ ہے کہ بندہ اپنے نفس اپنی تمام لذات یہاں تک کہ وہ اپنے اختیار یعنی ہر چیز سے دست کش ہو کر ذات الہی میں فنا ہو جائے۔ ہم اس سے پہلے لکھ آئے ہیں کہ دیوبند سے فارغ ہونے کے بعد مولانا جب سندھ پہنچے تو اپنے بزرگوں کی صحبت میں باطن کے تزکیہ اور تکمیل میں لگ گئے۔ مولانا کا بیان ہے کہ اس زمانے میں مجھ میں اتنی قوت جذب پیدا ہو گئی تھی کہ مجھے اندیشہ ہوا کہ اگر میں ان اشغال و اذکار میں منہمک رہا تو اجتماعی کام نہ کر سکوں گا۔ اس لیے میں نے ادھر توجہ کم کر دی اور درس و تدریس میں زیادہ وقت دینے لگا۔ تصوف کا یہی مقام فنا جس کا ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں، مولانا نے اپنے سیاسی اور اجتماعی نصب العینوں کے لیے وقف کر دیا ہے۔ بات یہ ہے کہ تصوف کی منازل طے کرنے سے نفس میں جو غیر معمولی صلاحیتیں پیدا ہوتی ہیں، بعض بزرگ تو انہیں صرف اپنے باطن تک محدود رکھتے ہیں یا خارج میں اگر ان سے کوئی کام لیا تو اپنے مریدوں اور عقیدتمندوں کے نفوس کو پاک کرنے اور انہیں نیک راہ چلانے تک اکتفا کیا۔ لیکن مولانا کی عمل پسند طبیعت نے انہیں دوسری راہ پر ڈال دیا۔ انہوں نے اپنے مرشدوں سے جو بھی فیض حاصل کیا اور تصوف کے طفیل جو بھی بلند مقام انہیں ملے۔ وہ ان تمام صلاحیتوں کو سیاست میں بروئے کار لائے۔ چنانچہ ان کی سیاست جیلہ جو عقل اور منفعت پسند ذہنیت والی سیاست نہیں۔

مولانا کے پیش نظر یہ نہیں کہ گودل میں کچھ اور بھرا ہوا ہو، لیکن اوپر سے دل سے عوام کے رجحانات کی تائید کی جائے اور انہیں بیوقوف بنا کر اپنی ہوس اقتدار کی تسکین کر لی جائے۔ اس کے برعکس مولانا کی سیاست ان کے دل کی آواز ہے۔ انہیں اس بات پر پورا یقین ہے کہ یہ آواز ان کی کسی نفسانی خواہش کی صدائے بازگشت نہیں بلکہ ان کے لیے دل کی یہ آواز ارادہ الہی کی کارفرمائی کا ایک مظہر ہے اور اسی آواز پر عمل کرنا مصلحت خداوندی کو زندگی میں آشکارا کرتا ہے۔

ایک صوفی باصفا کی طرح مولانا کی تمام سیاسی اجتماعی اور ذہنی سرگرمیوں کا مقصد صرف اپنے رب کی رضا جوئی ہے اور وہ جو کچھ کہتے ہیں یا جو کچھ کرتے ہیں۔ اس سے ان کا مقصد صرف اسی ذات اقدس کی خوشنودی ہے۔ انہیں اس امر کا یقین ہے کہ جو سیاسی پروگرام وہ اپنی قوم کے سامنے پیش کر رہے

ہیں ان میں قوم کی فلاح ہے اور زندگی کی جوئی قدریں وہ قوم کو دیتے ہیں، ان کا ایمان ہے کہ بدلے ہوئے زمانے میں قوم کو انہی قدروں کی ضرورت ہے۔ مولانا کا یہ عقیدہ ہے کہ زمانہ کا تقاضا خدا کی مشیت کے تابع ہوتا ہے اور زندگی کے اسباب و حالات جس نظام کے متقاضی ہوتے ہیں، خدائی مصلحت اسی نظام کو دنیا میں نافذ کرنا چاہتی ہے اور یہی اس کی مرضی ہوتی ہے۔ لیکن خدا کی یہ مرضی ہمیشہ اس کے بندوں کے ذریعہ ہی دنیا میں عملی جامہ پہنتی ہے اور اللہ کا ہاتھ ہی بندوں کے ہاتھوں کے اندر کام کرتا ہے۔ اس لیے بسا اوقات سیاسی کام بھی الہی کام ہو سکتے ہیں اور سیاست عبادت بن جاتی ہے۔

مولانا کی سیاست دراصل ان کے اسی وجدانی شعور کا مظہر ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کو اپنے سیاسی مقاصد کے صحیح اور برحق ہونے کا اتنا اٹل یقین ہے لیکن وجدان اور وجدان میں بھی فرق ہوتا ہے۔ ایک وجدان ہوتا ہے ان گھڑ اور غیر ترقی یافتہ آدمی کا اور ایک وجدان ہے اس آدمی کا جو عقل کے سب مقامات سے گزر کر فکر و خیال کی اعلیٰ منزل پر پہنچے اور پھر تصفیہ نفس کے ذریعہ اپنے دل کو آلائشوں اور کدورتوں سے بھی پاک کر لے۔ ظاہر ہے یہ وجدان اس قدر رافع ہوگا کہ اس کے لیے تقدیر کی مصلحتیں مستور نہ رہیں گی اور اس پر یہ حقیقت بھی واضح ہو جائے گی کہ خدا اپنے بندوں کے لیے کیا چاہتا ہے یا زمانہ کا کیا تقاضا ہے۔ یاد دوسرے لفظوں میں تاریخ کس امر کی متقاضی ہے۔

مولانا کی سیاست پر اعتراض کرنے والوں نے کبھی ان مسائل کو یوں سمجھنے کی طرف توجہ نہیں کی۔ ان میں سے اکثر تو سنی سنائی باتوں پر یقین کر لیتے ہیں۔ انہوں نے کبھی یہ جاننے کی کوشش بھی نہیں کی کہ مولانا کس بلند مقام سے گفتگو فرما رہے ہیں۔ علماء کے گروہ کا تو یہ حال ہے کہ وہ خدا کی مرضی کو زمانہ میں اثر انداز ہوتے نہیں دیکھتے اور نئے پڑھے ہوؤں کو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ تاریخ کے تقاضوں اور وقت کی ضرورتوں میں خدا کی مرضی کا کیا دخل..... اول الذکر جماعت ”شؤون اللہ“ کا اس زندگی میں شکل پذیر ہونا نہیں سمجھتی اور اسے یہ معلوم نہیں کہ ”کل یوم ہونی شان“ کا اظہار زمانے کے تاریخی تقاضوں ہی میں ہوتا ہے۔ ادھر نوجوان طبقہ ہے کہ وہ زمانہ کی حدود سے آگے نہیں بڑھتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ یہ تغیرات اور انقلابات خود بخود ہو رہے ہیں۔ ایک خدا کا قائل ہے لیکن خدا کی شان کا منکر ایک ”شان“ کو مانتا ہے لیکن خدا کا انکار کرتا ہے۔ مولانا کو فکر و نظر اور جذب و سلوک سے وہ مقام معرفت میسر ہے۔ جہاں سے آپ روح کائنات کو اس اسباب و حالات کی دنیا میں نازل ہوتے اور اسے تدبیر و انصرام کرتے دیکھتے ہیں۔ چنانچہ جب وہ محض تدبیر و انصرام کو ماننے والوں یعنی مادیین کی بات سنتے ہیں تو وہ اسے خلاف واقعہ نہیں سمجھتے۔ بلکہ یہ جانتے ہیں کہ انہوں نے حقیقت کا صرف ظاہری رخ دیکھا ہے لیکن ان کو یقین ہے کہ چشم بصیرت سے انہوں نے اس کا مشاہدہ کیا ہے یہ تدبیر و انصرام خود بخود نہیں

ریاضتیں کرنی پڑتی ہیں۔ ان کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔ ہمارا مقصد صرف اتنا بتانا ہے کہ مولانا نے جس طرح علوم دینیہ، فلسفہ و منطق اور زندگی کے عملی تجربوں سے عقل و فکر کی صلاحیتوں کو جلا دی۔ اسی طرح تصوف کے ذریعہ اپنے وجدان کا بھی تزکیہ کیا اور استعداد کے مطابق اسے درجہ تکمیل پر پہنچایا۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ علم و فلسفہ ہماری استدلال و فراست کی قوت کو ترقی دیتا ہے اور تصوف وجدان کی تنقیح کرتا ہے۔ اگر استدلال و فراست ہو اور وجدان نہ ہو تو زندگی میں یقین پیدا نہیں ہوتا۔ اور کام کرنے کے لیے جس اندرونی ولولہ اور باطنی امنگ کی ضرورت ہوتی ہے اس سے آدمی محروم رہتا ہے۔ لیکن اگر محض وجدان ہو۔ استدلال و فراست نہ ہو تو انسان تو ہم پرست ہو جاتا ہے وہ ہر فضول اور لالچینی چیز پر ایمان لے آتا ہے اور اپنی سادہ لوحی سے ہر مکار اور فریبی مدعی کا آلہ کار بن جاتا ہے۔ غرض زندگی میں وجدان کی بھی ضرورت ہے اور استدلال و فراست کی بھی۔ لیکن وجدان وہ صحیح ہوتا ہے جو استدلال کی بھٹی میں پڑ چکا ہو۔ اور استدلال وہ مفید ہوتا ہے جسے وجدان کی آب مل چکی ہو۔ مولانا کے نزدیک اسلام کی سب سے بڑی خصوصیت بھی یہی ہے کہ وہ ایک طرف تدبر و تفکر پر اپنے اصول و قواعد کی بنیاد رکھتا ہے اور دوسری طرف یقین اور ایمان کے لیے وجدان اور باطنی شعور کے تصفیہ پر زور دیتا ہے۔ چنانچہ تدبر و تفکر کے لیے علوم دینیہ اور علوم عقلیہ کی ضرورت ہے اور وجدان کو ترقی دینے کے لیے تصوف اور سلوک کو اختیار کرنا چاہیے۔ جس نے محض علم کو دین کا مدار قرار دیا وہ بھی گمراہ ہے۔ اور جس نے صرف وجدان کو سب کچھ سمجھ لیا وہ بھی راہ راست سے بھٹک گیا۔ یعنی امام مالکؒ کے قول کے مطابق ”جو شخص صوفی ہو اور فقیہ نہ ہو، وہ گمراہ ہو۔ اور جو فقیہ ہو اور صوفی نہ ہو، وہ فاسق رہا اور جس نے ان دونوں کو جمع کیا وہ محقق ہوا۔“ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ اپنی کتاب ”اشعۃ اللمعات میں ”احسان“ کی اس طرح تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ”جامعیت کا کمال یہ ہے۔ باقی سب زلیخ و ضلال ہے۔“ اسلام نہ عقل کا انکار کرتا ہے۔ نہ وجدان کا۔ اسلام کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے ذہن انسانی کی یہ دونوں صلاحیتیں لازم و ملزوم ہیں۔ تصوف علوم شرعیہ اور عقلیہ کا تہمتہ ہے۔ شرعی اور عقلی علوم تصوف کے تہمتہ اور دونوں کا صحیح مصرف یہ ہے کہ وہ فرد جماعت، قوم یا انسانیت کی معنوی مادی اور اجتماعی زندگی کو بہتر بنائیں۔

مولانا کا یہ طبعی رجحان خود ان کی اپنی علمی و تحقیقی زندگی میں بھی نمایاں ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ بچپن سے مجھے ریاضی اور اقلیدس سے بڑی دلچسپی رہی ہے۔ بعد میں جب میں نے منطق پڑھی تو اس میں مجھے بڑا لطف آیا اور دماغ کو ذرا بھی الجھن نہ ہوئی۔ فقہ اور حدیث میں بھی مولانا کا بڑا غائر اور وسیع مطالعہ ہے۔ چنانچہ جب آپ دیوبند میں پڑھتے تھے تو اس زمانہ میں آپ نے اصول فقہ پر ایک رسالہ

ہو رہا۔ بلکہ کوئی بالاتر صاحب الارادہ قوت ہے جس کا ہاتھ اندر ہی اندر کام کر رہا ہے۔ اسی بنا پر غلطی سے اہل مذہب یہ سمجھ لیتے ہیں کہ مولانا اشتراکیت سے متاثر ہو کر دین اسلام کو اشتراکی بنا رہے ہیں اور نئے طبقے یہ کہتے سنے جاتے ہیں کہ موصوف خواہ خواہ اشتراکیت میں مذہب کا پیوند لگانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

مولانا کے فکری اور علمی ارتقاء کا اندازہ اس سے لگائیے کہ انہوں نے اپنی ساری زندگی تحصیل علم میں گزار دی۔ کتابیں پڑھیں۔ لوگوں کی زندگیوں سے بہت کچھ سیکھا۔ خود زمانے کے بھنوروں میں پڑے اور زندگی کے نشیب و فراز کے تاثرات اور واردات کو اپنے اوپر طاری کیا۔ تاریخوں کا مطالعہ کیا۔ ہندوستان، افغانستان، روس، ترکی اور حجاز میں تاریخی قوتوں کو باہم دست و گریباں ہوتے دیکھا اور ان کے نتائج کا مشاہدہ کیا۔ آپ نے ماضی کو کتابوں میں اور حال کو زندگی کے انقلابات میں خوب آنکھ کھول کر دیکھا۔ اس تحقیق و جستجو اور تجربوں کے بعد ظاہر ہے عقل و فکر کتنی ترقی یافتہ ہوگی۔ پھر یہ عقل ایک ایسے آدمی کی عقل تھی جو خاندانی تعصبات اور قومی ادہام سے شروع سے ہی آزاد تھا۔ اس نے بچپن ہی میں عقل کی آواز پر اپنے جذبات کو تہہ دیا تھا۔ عقل اور اتنی آزاد عقل۔ پھر وہ اتنی کٹھالیوں میں پڑ چکی اور نئے نئے طرح طرح کے امتحان میں سے گزر چکی ہو۔ جو وجدان اس عقل کو ایقان اور طمانیت بخش سکتا ہے، کیا اس وجدان کی باتیں خدا خواستہ اتنی سطحی ہو سکتی ہیں کہ ہماری قوم کے سطحی آدمی بھی ان پر نہیں۔ ہماری علمی بیچارگی اور ذہنی اتھلے پن کی اس سے زیادہ اور کیا مثال ہو سکتی ہے۔

فکر و عقل کی تہذیب اور ترقی کے لیے مولانا کو جو مسلسل تنگ و دو کرنی پڑی، اس کی طرف ہم اوپر اشارہ کر آئے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ وجدان کی اصلاح اور تزکیہ کے لیے تصوف میں ایک سالک کو کن کن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ عقل کی تہذیب اور ترقی کی طرح وجدان کی اصلاح و تزکیہ میں بھی انسان کو بڑی دشواریاں اٹھانی پڑتی ہیں۔

تصوف کے مقامات کی ابتدا یہ ہے کہ آدمی کے دل میں ایک پر زور امنگ پیدا ہوتی ہے اور وہ ایمان و یقین حاصل کرنے کے لیے بے تاب ہو جاتا ہے چنانچہ اسے وراثت میں ملے ہوئے عقیدوں پر شک ہونے لگتا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ ایمان و یقین اس کے دل سے یوں پھوٹے، جس طرح چشمہ سے پانی پھوٹتا ہے۔ آہستہ آہستہ اس کے دل سے ادہام و شکوک کی ظلمت بٹتی جاتی ہے اور مرشد کی توجہ سے وہ آگے بڑھتا جاتا ہے۔ تقویٰ و زہد کے مدارج طے کر کے وہ اس مقام پر پہنچتا ہے جہاں اس کا دل تمام نفسانی آرزوؤں اور خواہشوں سے پاک ہو جاتا ہے۔ اس مقام پر اسے وجدانی ذوق کی لذت نصیب ہوتی ہے۔ اس سے آگے کئی اور مقام ہیں اور سالک کو اپنے نفس کے تصفیہ اور ترقی کے لیے بہت اور

لکھا۔ جسے حضرت شیخ الہند نے بہت پسند فرمایا۔ علم حدیث کی تحصیل میں بھی مولانا نے بڑی محنت کی۔ فرماتے ہیں کہ جامع ترمذی میں نے حضرت مولانا شیخ الہند سے پڑھی اور سنن ابوداؤد کے لیے حضرت مولانا رشید احمد صاحب کی خدمت میں گنگوہ پہنچا۔ مولانا کے شوق حدیث کا یہ حال تھا کہ فرماتے ہیں کہ میں نے نسائی اور سنن ابن ماجہ چار چار دن میں پڑھی ہیں۔

دیوبند سے فارغ التحصیل ہو کر آپ سندھ میں گوٹھ پیر جھنڈا میں قیام فرما ہوئے یہاں علوم دینیہ کا بے نظیر کتب خانہ تھا۔ مولانا فرماتے ہیں کہ میرے تکمیل مطالعہ میں اس کتب خانہ کے فیض کو بڑا دخل ہے۔ قرآن تو آپ کا خاص موضوع تھا ہی۔ اس سلسلہ میں تو آپ سے شاید ہی کوئی تفسیر چھوٹی ہو۔

مولانا ایک عرصے تک مکہ معظمہ میں رہے ہیں۔ وہابی علماء امام ابن تیمیہ اور امام شوکانی کے خاص طور پر گرویدہ ہیں۔ مولانا خفی ہیں اور ظاہر ہے ابن تیمیہ اور امام شوکانی دونوں کے مسلک سے متفق نہیں۔ لیکن مولانا کو ان دونوں بزرگوں کی کتابوں پر اتنا عبور تھا کہ شاید ہی کسی وہابی عالم کو ہو۔ امام شوکانی کی ”نیل الاوطار“ نام کی ایک اہم تصنیف ہے۔ مولانا نے ایک دفعہ فرمایا کہ معلوم نہیں میں نے کتنی بار اس کو پڑھا ہے۔ چنانچہ مکہ معظمہ کے قیام میں وہاں کے دارالحدیث کے استاد شیخ محمد عبدالرزاق بن حمزہ سے آپ کے بڑے گہرے تعلقات تھے اور ایک لحاظ سے آپس میں استاد شاگرد کا سا معاملہ تھا۔ الغرض جہاں تک ممکن تھا۔ مولانا نے تمام دینی علوم کا پورا احاطہ کیا اور ان میں غیر معمولی درجہ حاصل حاصل کیا۔ لیکن علوم فلسفہ سے ان کا شغف علوم دینیہ سے کچھ کم نہ تھا۔ آپ نے تمام مسلم فلسفیوں کی کتابوں کا بالاستیعاب مطالعہ فرمایا ہے۔ شاہ ولی اللہ کی وہ کتابیں جن میں موصوف نے علوم عقلیہ پر خالص عقل و منطق کی روشنی میں بحثیں کی ہیں۔ مولانا کو از بر یاد ہیں اور سالہا سال سے آپ ان پر غور و خوض فرما رہے ہیں۔ ان علوم سے آپ کی شیفتگی کا یہ عالم ہے کہ ایک دفعہ آپ سندھ سے دیوبند آئے تو آپ کو سونے کے لیے جو کمرہ ملا وہاں شاہ اسماعیل شہید کی کتاب ”العقبات“ کا نسخہ پڑا تھا۔ یہ کتاب فلسفہ پر ہے اور بڑی دقیق اور جامع ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ میں ساری رات اس کا مطالعہ کرتا رہا اور جب تک کتاب کو ختم نہیں کیا اسے چھوڑا نہیں۔

لیکن علم و فلسفہ کی اس تمام جستجو کے باوجود مولانا کے لیے علم و فلسفہ کبھی اصل مقصد نہیں بنے بلکہ آپ نے ہمیشہ ان کو زندگی کا ایک ذریعہ سمجھا۔ علوم کی تحصیل میں بھی آپ کے ہاں روایت پر درایت اور نقل پر عقل کو ترجیح دی۔ موصوف نے اپنی زندگی میں کبھی کسی ایسی بات کو نہیں مانا۔ جو ان کی عقل کے لیے قابل قبول نہ ہو۔ وہ مذہب جو پہلے ہی دن عقل سے دست کش ہونے کو کہے۔ مولانا اس مذہب کے

سرے سے قائل نہیں۔ اگر وہ اپنی عقل کو اتنا بے چارہ سمجھتے تو کبھی بھی اپنا آباؤی مذہب نہ چھوڑتے۔ لیکن آپ کی یہ عقل تابع ہے آپ کے وجدان کے۔ اس وجدان کو آپ نے مرشدوں کی توجہ اور تصوف اور سلوک کی ریاضتوں سے مہذب اور مصفیٰ کیا۔ پھر اس ترقی یافتہ عقل اور تصفیہ شدہ وجدان کی صلاحیتوں کو آپ نے علم و حکمت کے مقالات یا نفوس کی روحانی تسخیر تک محصور نہیں کر دیا۔ بلکہ ان کو عمل کا خادم بنایا۔ اور گرد و پیش کی زندگی کے ٹھوس مسائل کو سمجھنے اور ان کو حل کرنے میں ان سے مدد لی۔ مولانا نے نقل کو ہمیشہ عقل کی کسوٹی پر پرکھا۔ اس عقل کو وجدان سے ہم نوا کیا اور پھر عملی زندگی میں ان کو اپنا خضر راہ بنایا۔ لیکن اس سلسلے میں مولانا کی شخصیت کی بڑائی یہ ہے کہ انہوں نے نقل کا دائرہ ایک گروہ ایک قوم یا ایک مذہب کی روایات اور تاریخ تک محدود نہ رکھا بلکہ انہوں نے کوشش کی کہ انسانیت کی تمام تاریخ سے استفادہ کریں۔ اور انسانوں کے کل علمی سرمایہ کو اپنا سمجھیں۔ پھر آپ نے عقل کو صرف خیالی قیاس آرائیوں اور منطقی موشگافیوں کا پابند نہ کیا۔ بلکہ زندگی کے حقائق کی روشنی میں عقل کو جانچا۔ اس کی کوتاہیوں کو آزمایا۔ اپنے مشاہدات اور تجربات پر اس کو کسا۔ اس عقل کو وجدان کے تابع کیا اور وجدان بھی ایسا جو سلوک اور ریاضتوں کی آگ میں پڑ کر کندن ہو چکا تھا۔ اس میں یہ جوہر پیدا ہو گیا تھا کہ ایک جزو ہوتے ہوئے کل کا مشاہدہ کر سکے۔ ایک ذرہ ہو لیکن روح کائنات کو دل میں جلوہ گر پائے۔ اور فرد ہونے کے باوجود کل انسانیت کو اپنے اندر جگہ دے۔ عقل اور وجدان دونوں کی ضرورت اور ان کی ہم آہنگی پر علامہ اقبال نے بھی بڑا زور دیا ہے۔ مرحوم نے بار بار اس کی طرف توجہ دلائی ہے کہ قوموں کی زندگی کے لیے عقل اور وجدان دونوں کی ضرورت ہے۔

مرحوم نے وجدان کو کہیں ذکر سے تعبیر کیا ہے اور کہیں عشق سے اور عقل کو اکثر فکر کا نام دیا ہے۔ فرماتے ہیں ذکر ذوق و شوق کی تربیت کرتا ہے اور فکر ذکر سے ہی مکمل ہوتا ہے۔ جذب و سلوک سے جس کا حاصل ذکر ہے دل میں اتنی قوت پیدا ہو جاتی ہے کہ صاحب ذکر بادشاہوں کے سامنے ”مردہ باد شہنشاہیت“ پکاراٹھتا ہے۔ وہ علم جو ذکر و فکر دونوں کا حامل ہوں۔ اس علم میں کم بصری کا دخل نہیں ہوتا۔ وہ علم کم بصری جس میں ہم کنار نہیں تجلیات کلیم و مشاہدات حکیم

علامہ اقبال مرحوم نے اعلیٰ حضرت ظاہر شاہ کو مخاطب کرتے ہوئے ذکر و فکر کی مزید شرح فرمائی ہے کہتے ہیں۔ ہماری ساری متاع کتاب و حکمت ہے اور ہماری ملت کی قوت کا انحصار صرف ان دو پر ہے۔ ایک جہان ذوق و شوق کی فتوحات کرتی ہے اور ایک کا کام جہاں تحت و ذوق کی تسخیر ہے۔ حکمت اشیاء فرنگی کی پیدا کی ہوئی نہیں ہے۔ یہ تو محض لذت ایجاد کا جذبہ ہے۔ اگر تم سمجھو تو یہ حکمت مسلمان زادہ ہے اور ہماری ہی گم شدہ متاع ہے۔ دراصل ہم نے علم و حکمت کا بیج بویا تھا اور آج فرنگی اس

کا پھل کھا رہا ہے۔ حکمت کی اس پری کو ہمارے اسلاف نے شیشہ میں اتار رکھا تھا۔ اب تو اسے پھر دوبارہ شکار کر کے کہ یہ ہماری ہی ملک ہے۔ لیکن مرحوم کے نزدیک اس علم، حکمت، فکر یا عقل کو مسلمان کرنے کی ضرورت ہے۔ اور اس کو مسلمان کرنے کا یہ طریقہ نہیں کہ اسے مردود قرار دیا جائے۔ یا اس سے کوئی تعلق نہ رکھا جائے بلکہ اس کے ساتھ ذکر کو ملحق کیا جائے۔

مولانا اسی ذکر و فکر کو زندگی میں باہم رگ ملانے کی دعوت دیتے ہیں۔ فکر ان کی عمر بھر کی علمی، عقلی اور تجربی تنگ و دو کا حاصل ہے اور ذکر آپ نے جذب و سلوک کے ذریعہ سیکھا ہے۔ ذکر و فکر کی اس دنیا کو علامہ اقبال نے بڑے دل کش انداز میں پیش کیا ہے:

یہ ہیں سب ایک ہی سالک کی جستجو کے مقام وہ جس کی شان میں آیا ہے علم الاسماء
مقام ذکر کمالات رومی و عطار مقام فکر مقالات بو علی سینا
مقام فکر ہے پیمائش زمان و مکان مقام ذکر ہے سبحان ربی الاعلیٰ
ہندوستان میں خدا کے فضل سے صاحب فکر بھی ہیں اور ارباب ذکر بھی۔ صاحب فکر صرف مادی زندگی کی تنظیم و تشکیل کو کافی سمجھتے ہیں اور ارباب ذکر مادی زندگی سے کتراتے ہیں۔ لیکن مولانا عبید اللہ علامہ اقبال مرحوم کی طرح زندگی میں ذکر و فکر دونوں کو ضروری سمجھتے ہیں اور انہیں اس بات کا یقین ہے کہ ذکر، فکر کے بغیر محض دیوانے کی ہو ہے اور ذکر نہ ہو تو باطنی زندگی مردہ ہو جاتی ہے۔

علامہ اقبال مرحوم شاعر و فلسفی تھے۔ انہوں نے کبھی شعر میں اور کبھی نثر میں، لیکن شعر میں زیادہ اور نثر میں کم۔ اس حقیقت کو دلاویز انداز اور موثر اسلوب میں بار بار کہا۔ بہت کم اسے سمجھے۔ اور بہترے تو محض رنگ و آب شاعری پر ہی وجد کرتے رہے۔ جو تھوڑے بہت سمجھے ہیں وہ مرحوم کی اس نصیحت پر عمل کرنے کے متعلق کبھی سوچتے نہیں۔ چنانچہ وہ مرحوم کے ان اشعار کو پڑھتے ہیں لیکن ان کے ذہن میں یہ کبھی نہیں آتا کہ حکمت کو پھر فرنگ سے دیار اسلام میں لانے کے لیے کیا کرنا چاہیے۔ اگر یہ واقعی سچ ہے کہ

حکمت اشیاء فرنگی زاد نیست اصل اوجز لذت ایجاد نیست
نیک اگر بنی مسلمان زادہ است این گہراز دست ما افتادہ است
چوں عرب اندر و پا پر کشاد علم و حکمت را بنا دیگر نہاد!
دانہ آن صحرا نشیناں کاشتند حاصلش افرنگیاں برداشتند!
ایں پری از شیشہ اسلاف ماست باز صیدش کن کہ او از قاف ماست

تو پھر اس علم و حکمت کو اپنانے کے لیے کیا طریقہ اختیار کرنا ہوگا۔

مولانا کو بھی علامہ اقبال کی طرح اس بات کا شدید احساس ہے کہ اگر ہم نے اس حکمت کو اپنا نہ بنایا تو اس دنیا میں ہمارے پینے کے لیے کوئی امکان نہیں ہے۔ اور وہ بھی مرحوم کی طرح اس حکمت کے لادینی اثرات سے مطمئن نہیں۔ اقبال کی فہم و بصیرت انہیں ان حقائق کی طرف لے گئی۔ مولانا کسی اور راستہ سے ان حقائق پر پہنچے۔ اقبال شاعر تھے انہوں نے قوم کو پیغام سنایا اور اپنا فرض پورا کر دیا۔ لیکن مولانا عملی آدمی ہیں اور وہ اس حقیقت کو جو ان کے لیے اب بمنزلہ ایمان کے ہو گئی ہے زندگی میں برسر کار لانا چاہتے ہیں۔ چنانچہ وہ اس علم و حکمت کو اپنانے کے لیے ایک واضح اور معین راہ تجویز کرتے ہیں اور یہ بھی یقین دلاتے ہیں کہ اس راہ پر چل کر ہم لادینیت سے بھی محفوظ رہیں گے۔

مولانا خود اپنے متعلق فرماتے ہیں کہ میں وطن سے نکلا۔ افغانستان پہنچا وہاں مجھے نئے نئے حالات سے سابقہ پڑا۔ چنانچہ بزرگوں کی بتائی اور سوچی ہوئی باتیں سب بے کار ہو گئیں۔ روس گیا تو بالکل اور دنیا نظر آئی۔ جن مزعومات اور عقائد میں میری ساری زندگی گزری تھی روس میں ان کو ایک ایک کر کے ٹوٹتے اور مٹتے دیکھا اور نئے اصولوں پر زیادہ جان دار اور زیادہ مستحکم نظام بننے کا مشاہدہ کیا۔ پھر ترکی میں بھی کم و بیش یہی کچھ میرے سامنے ہوا۔

وہ فرماتے ہیں کہ اس تمام زمانے میں مجھے ایک لمحہ کے لیے بھی اپنے مذہب کے اساسی عقیدہ پر شک و شبہ نہیں ہوا۔ میرا دینی فکر روسی انقلابیوں کے لادینی فکر سے بلند تر رہا۔ اور ان کی تمام مادیت کو میرے الہی فکر نے اپنے اندر ہضم کر لیا۔ دوسرے لفظوں میں مولانا کا دینی عقیدہ اتنا وسیع اور ہمہ گیر تھا کہ اشتراکیوں کی مادیت کو قبول کرنے کے بعد بھی خدا تعالیٰ کے وجود پر ان کا ایمان متزلزل نہیں ہوا۔ مولانا فرماتے ہیں کہ یہ سب شاہ ولی اللہ کی تعلیمات کا فیض اور ان کے پیش کردہ وحدت الوجود کے عقیدہ کا اثر تھا۔ یعنی انقلاب کے ان طوفانوں کے مقابلے میں جن کی بڑے بڑے تاب نہ لاسکتے تھے۔ مولانا محض تصوف کی برکت سے اسلام پر ثابت قدم رہے۔

اپنے اس ذاتی تجربہ اور شخصی وجدان کی بنا پر وہ فرنگ کی علم و حکمت کو کھلے بندوں اپنانے کی دعوت دیتے ہیں۔ اور اسی کو وہ ”یورپین ازم“ کا نام دے رہے ہیں۔ وہ اس کی لاندہیت سے مطلق ہر اسال نہیں ہیں۔ وہ اس آگ میں خود پڑ چکے ہیں اور انہیں یقین ہے کہ جس طرح اس آگ میں پڑ کر اپنا ایمان سلامت نکال لایا۔ اسی طرح اگر مسلمان بھی میرے ذہن و فکر کے ساتھ اس آگ میں کودیں گے تو ان کے اسلام کو کوئی گزند نہیں پہنچے گا۔ مولانا نے اپنے ذہن و فکر کی تربیت شاہ ولی اللہ کے فلسفے سے کی تھی۔ چنانچہ ان کا کہنا یہ ہے کہ اگر ہم فلسفہ ولی اللہی سے مسلح ہو کر یورپی علم اور سائنس کو قابو میں لانے

کی ہمت کریں۔ تو ہم بے دینی سے بھی محفوظ رہیں گے اور یورپ کی مادی ترقی اور معاشی تنظیم کو بھی اپنے ہاں رائج کر سکیں گے۔

فلسفہ ولی اللہی کا مرکزی نقطہ عقیدہ وحدت الوجود ہے۔ وحدت الوجود کا عقیدہ کیا ہے؟ اس کی تشریح آپ کو آئندہ باب ملے گی۔ بد قسمتی سے اس عقیدہ کے متعلق مسلمانوں کے ایک گروہ میں بڑی غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ لیکن شاہ صاحب نے وحدت الوجود کا جو تصور پیش کیا ہے وہ قرآن اور اسلام کی تعلیمات کے منافی نہیں۔ شاہ صاحب اس تصور کے ماتحت کائنات کی اس طرح تشریح فرماتے ہیں کہ آج کا سائنس داں بھی اس سے مطمئن ہو جاتا ہے۔ نیز شاہ صاحب نے دنیا کے تمام ادیان مذاہب اور فکری نظاموں کا بھی تجزیہ کیا ہے۔ وہ ان سب کی اصل حقیقت کو متعین کرتے ہیں جو سب میں مشترک رہی ہے اور سب کے سب اس سے چلے تھے۔ لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا گیا اس سے وہ دور ہوتے چلے گئے۔ شاہ صاحب کے نزدیک خارجی علم جو ہر لمحہ متغیر ہوتا ہے اور انسانیت کا باطنی شعور جو ہر زمانے میں ایک ہی رہتا ہے، گو اس کا اظہار مختلف حالات میں مختلف طریقوں سے ہوا کرتا ہے۔ یعنی اس خارجی علم اور باطنی شعور دونوں کی ترقی سے انسانیت مکمل ہوتی ہے۔ اول الذکر کے لیے آپ تحقیق و جستجو مطالعہ و مشاہدہ اور تدبیر و تسخیر کائنات تجویز فرماتے ہیں۔ اور باطنی شعور کے لیے جذب و سلوک کی راہ بتاتے ہیں۔ جذب و سلوک کے کئی طریقے ہیں اور ہر قوم نے اپنے اپنے رنگ میں جذب و سلوک کے قواعد وضع کیے ہیں۔ مولانا کے نزدیک فلسفہ ولی اللہی کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے جذب و سلوک کی ایک ایسی راہ بتائی ہے جو سب قوموں کے طرق جذب و سلوک کی جامع ہے۔ اس میں اور اسلام میں تضاد بھی نہیں۔ نیز سارے ادیان اور مذاہب کا بھی اس پر اتفاق ہو سکتا ہے۔

مولانا کا کہنا یہ ہے کہ یورپ کے موجودہ مادی اور معاشی نظام کو ہمیں لابدی طور پر قبول کر لینا چاہیے۔ ان کے خیال میں یہ مادی نظام سارے کا سارا محض یورپ کی اپنی تخلیق نہیں۔ ہزار ہا سال سے انسان دنیائے اسباب کی تسخیر کے لیے تگ و دو کرتا چلا آ رہا ہے۔ ہر قوم نے اپنے اپنے وقت میں تسخیر کے اس عمل کو آگے بڑھایا۔ اس زمانے میں اسباب کی دنیا میں یورپ سب کا امام ہے۔ اس لیے ہمیں یورپ کی سائنس اس کی تنظیم اور صنعت کو اپنانا ہوگا۔ خدا نخواستہ اگر ہم نے یہ نہ کیا تو ہمارا وجود اس دنیا میں باقی نہیں رہ سکتا۔ اور ہم ریت کے ذروں کی طرح ہوا میں اڑتے نظر آئیں گے۔

دوسری طرف مولانا کا یہ ارشاد ہے کہ زندگی کے مادی پہلو کی طرح اس کے باطنی پہلو کی ترقی کا سلسلہ بھی ابتدائے آفرینش سے جاری ہے۔ ہر قوم نے نفس انسانی کے باطنی شعور کو تہذیب اور ترقی دینے کے لیے طریقے سوچے۔ باطنی شعور کے تصفیہ اور ترقی کے طریقہ کو ہم تصوف کہتے ہیں۔ مغربی

اسے ”سٹیزم“ کا نام دیتے ہیں۔ ہندوؤں نے اسے ویدانت کہا۔ قدیم مصری، ایرانی اور یونانی اسے دوسرے ناموں سے پکارتے تھے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ شاہ صاحب کے تصوف میں باطنی شعور کو سنوارنے اور ابھارنے کا ایک ایسا نظام ملتا ہے جو خالص اسلامی ہے۔ اور انسانیت عامہ سے بھی ہم آہنگ ہے۔ نیز شاہ صاحب کا یہ تصوف موجودہ لادینی فکر کا صحیح مصلح ہے۔ مسلمان اس کی وجہ سے ”یورپین ازم“ اختیار کرنے کے بعد بھی اپنے مذہب سے وابستہ رہ سکتے ہیں۔ چونکہ یہ فکری ساری انسانیت پر شامل ہے اس لیے ایک ہندو اور عیسائی بھی اسے قبول کر سکتا ہے اور ایسا آزاد منش آدمی بھی اسے مان سکتا ہے جو کسی خاص مذہب کا قائل نہیں۔

یہ ہے مولانا کا تصوف۔ تصوف کا لفظ سن کر عام طور پر قدامت پسندی اور رجعت پسندی کا خیال آتا ہے اور تصوف کو عموماً عمل اور اقدام کی ضد سمجھا جاتا ہے۔ لیکن مولانا کا تصوف ”نہایت اندیشہ و کمال جنوں“ کا مجموعہ ہے۔ اور ان کے عمل کی سوتیں سب اسی سے پھوٹی ہیں۔ اس تصوف ہی نے انہیں ہر خطرہ اور ہر مصیبت میں خدا کے دامن سے وابستہ رکھا۔ اسی کا احسان ہے کہ آپ کا خدا پر عقیدہ اس قدر وسیع اور ہمہ گیر تھا کہ اس میں ساری قومیں سما گئیں۔ سارے ادیان آگئے۔ کل کی کل انسانیت اس کے اندر جذب ہو گئی۔ ساری کائنات کا اس نے احاطہ کر لیا۔ اور یہ عقیدہ ان تمام قیود و حدود سے پھر بھی بلند و برتر رہا۔ تصوف نے ایک طرف تو مولانا کے ذہن و فکر میں اس قدر وسعت و ہمہ گیری پیدا کی اور دوسری طرف آپ کو اتنا یقین اور ثبات بخشا کہ آپ اپنے اس باطنی شعور کو خارج میں لانے کے لیے ہمیشہ جدوجہد کرتے رہے۔ اور ناسازگار حالات اور مادی مشکلات کی کبھی پروا نہ کی۔ بلکہ اس کے لیے جان تک دینے میں دریغ نہ فرمایا:

بے شک تصوف کا یہ ذوق مولانا میں فطری تھا لیکن اس ذوق کی تربیت اور تکمیل کے لیے آپ کو اسلامی تصوف کا سازگار ماحول اور شاہ ولی اللہ ایسے کامل مرشد ملے۔ چنانچہ ان کے فیض اثر سے ہی مولانا کا یہ جوہر اپنے کمال کو پہنچا۔ اسلامی تصوف کی اجمالی تاریخ اور اس میں شاہ ولی اللہ کا کیا مقام ہے آئندہ باب میں اس پر بحث کی جائے گی۔

مذہب ان دونوں کے مجموعے کا نام ہے۔ طریقت اور شریعت دونوں لازم و ملزوم ہیں، جو انہیں ایک دوسرے کی ضد سمجھتے ہیں، وہ غلط اور غلط کار ہیں۔ ایک روح ہے اور دوسرا جسم۔ ایک کا کام انسان کو باطنی زندگی کو سنوارنا اور ابھارنا ہے۔ دوسرے کا مقصد یہ ہے کہ ظاہری اعمال میں اس کے لیے نمونہ کا کام دے۔ جب شریعت مذہب کی روح یعنی جذبہ خدا شناسی سے محروم ہو جائے تو اس کا وجود اور عدم وجود برابر ہو جاتا ہے اور اسی طرح جب طریقت شریعت کے قواعد و ضوابط کو توڑ دے، تو وہ نراج اور انارکزم ہے۔ اور سوسائٹی اسے کبھی گوارا نہیں کر سکتی۔

ہر مذہب تصوف پر مبنی ہے۔ ان معنوں میں تصوف کا اپنا کوئی خاص مذہب نہیں۔ ہر مذہب و ملت میں تصوف کا عمل و در آمد رہا ہے۔ دہرم اور شریعت پوجا پاٹ اور نماز روزے کی تفصیلات بتانا تصوف نہیں۔ تصوف تو ان کاموں کو خلوص سے اور دل و جان سے کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ وہ انسان کو مذہب کی صحیح روح سے ہم کنار کرتا ہے۔ اس کا کام یہ ہے کہ ہر آدمی کو سچا خدا پرست بنائے۔

آدمی خدا کو کیسے پائے۔ ہمارے حواس محدود، محض جسموں کو ٹٹولنے دیکھنے۔ ان کے سننے اور ان کو سونگھنے تک محدود۔ اور وہ ذات سر تا پا مجرد ہمارے ہر خیال سے بلند۔ ایک اتنا بیچ مایہ اور کمتر۔ اور دوسرا اتنا جلیل القدر اور برتر۔ اب دونوں کا اتصال ہو تو کیسے ہو؟ کس طرح ایک ذرے میں سورج آ جائے؟ اور کیسے ایک جزو کل کا مشاہدہ کرے؟ ان مسائل پر غور کرنا نہیں سمجھنا اور سمجھنا تصوف کا موضوع ہے۔ ہر قوم نے اپنے اپنے زمانہ میں ان مسائل کو سوچا۔ ان کے متعلق اپنے نظریات بنائے۔ اور ایک بندہ کس طرح خدا تک پہنچ سکتا ہے، اس کی راہیں بتائیں۔ لیکن تصوف صرف بات کہنا یا سمجھنا نہیں۔ وہ اس پر عمل کر کے بھی دکھاتا ہے۔ چنانچہ تصوف ”قال“ نہیں ”حال“ ہے۔ وہ انسان کے اندر ایک ایسی کیفیت پیدا کرتا ہے کہ اس کا دل خدا کو خود اپنی نظروں سے دیکھ لے اور اس کی قدرت کو اپنے سامنے مجسم پائے۔

تصوف کے نزدیک خدا رسی کا راستہ بندہ کی خود اپنی ذات سے شروع ہوتا ہے۔ جب بندہ اپنے آپ پر دھیان کرتا ہے اور یہ سوچتا ہے کہ میں کیا ہوں، کہاں سے آیا ہوں، کہاں جاؤں گا۔ جب بندہ ان باتوں کو سمجھ جاتا ہے تو گویا خدا کو پالیتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں تصوف نام ہے اپنے آپ کو پانے کا۔ جس نے اپنے آپ کو پالیا اس نے خدا کو پالیا ”من عرف نفسه فقد عرف ربه“

اپنے آپ کو بندہ کیسے پائے؟ اس کے لیے صوفیائے کرام ذکر و اشغال تجویز کرتے ہیں۔ ریاضتیں بتاتے ہیں۔ مراقبہ کرواتے ہیں۔ تصور کرنا سکھاتے ہیں۔ خود اپنی توجہ اس پر ڈالتے ہیں۔ الغرض باطنی قوتوں کو بیدار کرنے کی جو بھی صورتیں ہو سکتی ہیں ان کی مشقیں کرواتے ہیں۔ صوفیاء کرام کا

اسلامی تصوف

ہر مذہب کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ بندہ جس ذات کو اپنا خدا سمجھتا ہے، اس ذات سے اس کا اتصال ہو۔ وہ اسے دیکھے اسے اپنے اندر پائے۔ وہ اس کے لیے شاہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہو۔ یہ ہے مذہب کا بنیادی جذبہ۔ اسے رسول اکرمؐ نے ”احسان“ سے تعبیر فرمایا ہے۔ چنانچہ ایک سائل کے جواب میں ارشاد ہوا۔ تمہارا اس طرح عبادت کرنا گویا تم خدا کو دیکھتے ہو۔ یا اگر یہ کیفیت طاری نہیں ہے تو تمہارا یہ سمجھنا کہ خدا تمہیں دیکھ رہا ہے۔ یہ ”احسان“ ہے۔ ”احسان“ ہی کے لیے آگے چل کر مسلمانوں میں تصوف کی علمی اصطلاح وجود میں آئی۔

مذہب جب کسی قوم کا دستور حیات بنتا ہے، تو لامحالہ اسے زندگی کے لیے قواعد اور قوانین بنانے پڑتے ہیں۔ چونکہ ہر قوم کا ماحول اور زمانہ جدا جدا ہوتا ہے۔ اس لیے لازمی طور پر ان کی زندگی کے لیے جو قواعد اور قانون بنتے ہیں وہ ایک سے نہیں ہوتے۔ لیکن یہ اختلاف محض شکل اور ظاہر کا ہوتا ہے۔ اصل جذبہ جو سب مذاہب کے اندر کام کرتا ہے وہ ایک ہی ہے۔ اور وہ ہے خدا کو جاننا اور اس تک پہنچنے کے وسائل ڈھونڈنا۔ مذہب کی ظاہری شکل اور عملی نظام کو ہم شریعت کہتے ہیں۔ اور جن ذرائع اور وسائل سے انسان میں خدا کو دیکھنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے اسے ہم نے تصوف و طریقت کا نام دے دیا۔

مولانا نے ایک دفعہ کہا کہ میرے مرشد حافظ محمد صدیق صاحب نے ایک مرید سے فرمایا کہ آخرت میں تو اللہ تعالیٰ کو انسان دیکھے گا ہی، لیکن آخرت تو آخرت اس دنیا میں بھی آدمی اپنے رب کو دیکھ سکتا ہے۔ اس شخص نے کہا کہ آپ ہمیں ذکر و اشغال تو بتاتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کو نہیں دکھاتے۔ آپ نے فرمایا: ہم تمہیں اللہ کو دیکھنے کے لیے تیار کرتے ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں کہ یہ مرید بالکل سادہ سندھی دیہاتی تھا۔ آپ نے اسے سمجھانے کے لیے مثال دی کہ دیکھو گھر والی مکھن اس برتن میں ڈالتی ہے جو پہلے گھی میں استعمال ہو چکا ہو۔

طریقت اور تصوف بندے کو اس قابل بناتے ہیں کہ وہ اس زندگی میں اپنے رب کو دیکھ سکے۔ شریعت اور قانون کا کام یہ ہے کہ وہ انسان کو اجتماعی زندگی گزارنے کے لیے لائحہ عمل دے۔

کہنا یہ ہے کہ اس طرح ریاضتوں سے انسان کا "انا" یا "میں" یا نفس باطنی بیدار ہو جاتا ہے۔ اور جب انسان کا "انا" بیدار ہو جائے تو وہ دیکھتا ہے کہ اس کا وجود ایک اور وجود کا پر تو اور فیضان ہے۔ اس کی ایک ادنیٰ مثال یہ ہے جیسے ایک قطرہ محسوس کرے کہ وہ دریا کا ایک حصہ ہے اور ایک شعاع اپنے آپ کو آفتاب کا ایک جزو سمجھے۔ بعض لوگ تو اس منزل پر رہ جاتے ہیں۔ لیکن بعض کو اتنی توفیق ہوتی ہے کہ وہ اس سے بھی بلند جاتے ہیں اور ان کی چشم بصیرت پر یہ راز کھل جاتا ہے کہ اس دریا نے وجود یا اس آفتاب حقیقت سے بہت پرے اس سے بہت اعلیٰ اور افضل ایک اور وجود ہے جس کے یہ سب مظاہر عکس ہیں۔ تصوف انسان کے دل کو یہ حقیقت سمجھاتا ہے لیکن محض سمجھاتا نہیں بلکہ وہ انسان کا رشتہ اس بلند و برتر وجود سے ملاتا بھی ہے۔ وہ انسان میں یہ صلاحیت پیدا کرتا ہے کہ وہ خدا کو دیکھے۔ یا اگر یہ نہ ہو تو کم از کم انسان یہ محسوس کرے کہ خدا سے دیکھ رہا ہے۔ اس کے ہر کام پر اس کی نگاہ ہے۔ وہ اس کے کاموں کو جو وہ دنیا میں کرتا ہے اور لوگ اسے کرتا دیکھتے ہیں جانتا ہے۔ وہ کام جو وہ کرتا ہے اور لوگ اسے نہیں دیکھتے وہ ان کا علم بھی رکھتا ہے۔ اور تو اور جو خیالات اس کے دل و دماغ میں اٹھتے ہیں خدا ان سے بھی باخبر ہے۔ یہ کیفیت پیدا کرنا مذہب کی اصل روح ہے۔ اور تصوف کا تعلق مذہب کے اس شعبے سے ہے۔

شریعت میں جو حیثیت عبادات اور احکام کی ہے۔ وہی حیثیت تصوف اور طریقت میں جذب و سلوک کے طریقوں کی ہے۔ جس طرح ایک شریعت کی عبادات اور احکام دوسری شریعت سے متمایز ہیں اسی طرح ہر طریقت نے بھی اپنے اپنے گروہ کے لیے جدا جدا جذب و سلوک کی راہیں تجویز کی ہیں۔ جیسے ہماری فقہ میں حنفیت، شافعییت، مالکییت اور حنبلیت سب ایک ہی منزل کے مختلف راستے ہیں۔ اور ان کے پیش نظر مسلمانوں کی خارجی زندگی کی تنظیم و تشکیل ہے۔ بعینہ سہروردی، نقشبندی، قادری اور چشتی طریقے نفس باطنی کے تصفیہ اور ترقی کے لیے اپنے اپنے اور ادو وظائف اور ریاضتیں بتاتے ہیں۔ ہمارے فقہی مذاہب اسلام کے قانون کی مختلف تفسیریں ہیں۔ تصوف کے یہ طریقے بھی اسلام کی اصل بنیاد "احسان" کے ذرائع اور وسائل ہیں۔ جس طرح اسلام، یہودیت، عیسائیت اور دنیا کے دوسرے مذاہب میں ظاہری اختلافات کے باوجود اصولاً یگانگت اور اشتراک ہے۔ اسی طرح تمام قوموں کے تصوف کے الگ الگ طریقوں میں بھی ایک گونہ اتحاد مماثلت ہے۔

ہم مسلمانوں کا دعویٰ یہ ہے کہ ساری انسانیت کا اصل دین ایک ہے۔ لیکن یہ دین محض تخیل تو ہے نہیں۔ یہ زندگی میں انسانوں کے لیے لائحہ عمل بھی بنتا ہے اور اس کی حیثیت ایک "مذہب" یعنی زندگی گزارنے کے لیے ایک راستہ کی ہی ہو جاتی ہے۔ لیکن زندگی عبارت ہے نفس انسانی کے خارج اور باطن

سے۔ خارج کی تنظیم اور تشکیل کے لیے شریعتیں اور قانون بنے اور باطن کی اصلاح اور ترقی کے لیے تصوف کے طرق وجود میں آئے۔ جس طرح سب شریعتیں بظاہر مختلف اور متعدد ہونے کے باوجود ایک ہی اصل کی شاخیں ہیں اور ان سب کا مقصد ایک ہی دین کو عملی زندگی میں مختلف زمانوں میں نافذ اور رائج کرنا تھا۔ اسی طرح تصوف کے سارے طرق اور مسلک خواہ وہ کسی قوم اور ملت میں ہی کیوں نہ پیدا ہوئے ہوں، اصلاً ایک ہی مقصد کے لیے تھے۔ بے شک اچھے قوانین کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ بروئے قانون گڈ مڈ ہو گئے۔ اور بعد میں شریعتوں کی صورتیں تک مسخ ہو گئیں۔ نیز ارتقاء کے عمل نے خود زندگی کو بدلا۔ اور انسانوں کے حالات پر بھی اس کا اثر پڑا۔ اور ان کی شریعتوں میں کافی کانٹ چھانٹ ہوتی چلی گئی لیکن اس کے باوجود اگر آج بھی تمام قوموں کی مقدس کتابوں کا تعمق سے مطالعہ کیا جائے تو سب کے اساسی عقائد یکساں ملیں گے۔ اس طرح اگر تمام ملتوں کے تصوفوں کو دیکھا جائے تو ان میں آپ کسی نہ کسی حد تک ضرور مشابہت پائیں گے۔ یہ ممکن ہے کہ ایک عیسائی صوفی خدا کو پانے کا راستہ اپنے قومی مذہبی مزاج اور ماحول کی روایات کے خیال سے ایک بتائے مسلمان صوفی اس کے لیے دوسرا مسلک تجویز کرے اور ہندو ویدانتی یوگ کے کچھ اور اصول اختیار کرنے کو کہے۔ لیکن اس سب کے پیش نظر مقصد ایک ہی ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ نفس باطنی کی اصلاح کی جائے۔ اور اس میں خدا کی تجلی سے فیضاب ہونے کی صلاحیت پیدا ہو۔ لیکن جس طرح ایک شریعت پرانی ہو گئی اور نئے زمانے کے مطابق نئے قوانین وضع کرنے کی ضرورت پڑی۔ اسی طرح تصوف کے طریقوں میں بھی برابر رد و بدل ہوتا رہا ہے۔ ایک قوم نے ایک طریقہ وضع کیا۔ دوسری قوم جو اس کے بعد آئی اس نے اس طریقہ کو لیا، اسے جانچا پرکھا اس کے فرسودہ اور بے کار حصوں کو الگ کیا اور اپنی طرف سے اس میں کچھ اضافہ کر کے اس کو نئی زندگی بخشی۔ جس طرح ارتقاء کا عمل نفس قانون میں ہوتا چلا آ رہا ہے اسی طرح علم تصوف میں بھی اس کا عمل دخل ہوا۔ اسلامی تصوف قوموں اور ملتوں کے تصوف کے اس سلسلہ ارتقاء کی آخری کڑی ہے۔ ایک مسلمان صوفی جو کامل اور عارف ہو ایک ہندو اور عیسائی صوفی سے تصوف کے اصل سے زیادہ قریب ہوتا ہے۔

تصوف کے افکار ہر قوم میں تھے۔ اور یہ افکار ہر قوم سے دوسری قوم میں اور ہر ملک سے دوسرے ملک میں برابر منتقل ہوتے رہے۔ قدیم مصر کے تصوف نے یونانیوں کو متاثر کیا۔ پراچین ہند کے افکار یونان تک پہنچے۔ بعض مورخ تو یہاں تک لکھتے ہیں کہ نوشیرواں اور بزرجمبر کے زمانے میں دیدانت ہندوستان سے ایران گیا۔ عباسی عہد میں مسلمان اس سے واقف ہوئے۔ انہوں نے اسے اپنایا۔ اور ایران سے یہ تصوف کی شکل میں مسلمان حملہ آوروں کے ساتھ پھر ہندوستان واپس آیا۔

ہمارے بعض مسلمان علما اس سے بہت چڑتے ہیں۔ انہیں یہ گراں گزرتا ہے کہ مسلمان صوفیانے ہندوستان کے ویدانت سے استفادہ کیا۔ چنانچہ وہ ایسے تصوف کو غیر اسلامی قرار دیتے ہیں اور اس کے خلاف جو بھی زبان قلم پر آجائے کہہ جاتے ہیں۔ ان ارباب علم و فضل کی خدمت میں گزارش ہے کہ ایک ہے جذبہ تصوف اور ایک ہے علم تصوف۔ اس جذبہ تصوف کو حدیث شریف میں ”احسان“ کا نام دیا گیا ہے۔ بعد میں جب تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ مسلمانوں میں علوم مدون ہوئے تو ”احسان“ کو بھی علمی شکل دی گئی اور علم تصوف کہلایا۔ صحابہ کبار کا ”احسان“ کسی بیرونی علم تصوف کا نتیجہ نہ تھا۔ وہ ان کی اپنی فطری امنگ تھی جسے قرآن اور رسول اکرم کی صحبت نے ابھارا اور سنوارا تھا۔ لیکن حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جس طرح ہمسایہ ملکوں کے اداری انتظامات کو تمدن اسلامی میں جگہ ملی۔ اور آخر عہد اموی اور اوائل عہد عباسی میں طب مدون ہوئی۔ صرف ونحو کے قواعد بنے۔ تاریخیں لکھی گئیں۔ علوم فلسفہ و حکمت دوسری زبانوں سے عربی میں منتقل کیے گئے اور ان میں اضافے ہوئے۔ منطق یونانیوں سے لی اور اسے اسلامی قالب پہنایا۔ طبعیات والہیات کو دوسری قوموں سے اخذ کر کے انہیں ترقی دی گئی۔ حساب و اقلیدس اوروں سے لیں اور انہیں توسیع دی۔ حکومت کے نظم و نسق کے طریقوں کو دوسروں سے اخذ کر کے ان کو اسلامی رنگ دیا گیا۔ اسی طرح تصوف کے علم کی بھی تربیت ہوئی اور جس طرح اور علوم کی تدوین میں دوسری قوموں کی تحقیقات اور تلاش و جستجو سے مسلمانوں نے فائدہ اٹھایا۔ اسی طرح تصوف کے طرق میں بھی دوسری قوموں سے استفادہ کیا گیا۔

اسلامی تصوف کی دوسری قوموں کے تصوف سے یہ مشابہت اس کی خامی کی دلیل نہیں بلکہ اس کے کمال پر ایک شہادت ہے۔ اس سے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں نے سب تصوفوں کو کھنگالا۔ ان کے کھرے کھوٹے کو پرکھا جو ردی تھا اسے رد کیا جو جزو صالح تھا اسے قبول کیا اور تمام قوموں کے تصوف کے اس نچوڑ کو اپنی قومی اور ملی زندگی میں اس طرح سمویا کہ اسلام اور اس تصوف میں کوئی تضاد نہ رہا۔ انہوں نے دنیا کے اس اعلیٰ ترین فکر اور اپنی شریعت میں مطابقت پیدا کی۔ اسلامی تصوف کے مدون کرنے والوں کا یہ بہت بڑا احسان ہے اور اس کا اعتراف نہ کرنا ظلم ہے۔

لیکن اسلامی تصوف سے ہماری مراد وہ تصوف نہیں جو اسلام کے اصل منشا کے خلاف ہو۔ ہم ان صوفیاء کے کمال کے منکر ہیں جن کے عمل سے ملت میں زندگی کے بجائے مردنی پھیلی۔ اچھے برے لوگ تو ہر گروہ میں ہوتے ہیں۔ اور ہر اسلامی علم میں گم کردہ راہ لوگ رہے ہیں لیکن بروں کو دیکھ کر اچھوں کو ٹھکرادینا عقل مندوں کا شیوہ نہیں۔

اسلامی تصوف پر سب سے زیادہ اثر ہندو ویدانتی فکر کا ہوا ہے۔ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت

ہے کہ جس طرح مسلمانوں میں ابن عربی کا وحدت الوجود کا تصور تو حید تھا۔ اور اس کے خلاف امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی نے وحدت شہود کا خیال پیش کیا۔ بعینہ ہندوؤں میں بھی تو حید کے یہ دونوں تصورات موجود تھے۔ یہاں ہمیں صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ اسلامی تصوف ویدانت کے فکر سے متاثر ہوا اور ہندوستان کے مسلمان صوفیاء نے نفس باطنی کی اصلاح اور تصفیہ کے لیے ہندو یوگیوں سے ملتے جلتے طریقے اختیار کیے۔ بہر حال تھے یہ دونوں معنا الگ الگ۔ ایک کی بنیاد قرآن حدیث شریعت رسول اکرم کی ذات اقدس اور مسلمان صوفیاء کی روایات تھیں اور دوسرے کا ذہنی پس منظر بالکل اور تھا۔

اس موضوع پر گفتگو فرماتے ہوئے ایک دفعہ مولانا کہنے لگے کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے موجودہ سیکرٹری مسٹر کرپلانی (سندھی) کے بڑے بھائی مسلمان ہو گئے تھے۔ ان کا اسلامی نام شیخ عبدالرحیم تھا۔ انہوں نے بتایا کہ میں اپنی بیوی اور بچی کو چھوڑ کر مسلمان ہو گیا تھا۔ میں ایک پیر صاحب کے ہاں چلا گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد مجھے بیوی اور بچے چھوڑنے کا بڑا اقلق ہوا۔ پیر صاحب نے میری قلبی کیفیت معلوم کر لی۔ آپ نے مجھ سے فرمایا کہ تم پھر ہندو ہو جاؤ اور اپنے بچوں کے پاس چلے جاؤ۔ میں نے ان کے حکم کی تعمیل کی اور اپنے والدین کے پاس چلا آیا۔ انہوں نے مجھے ایک ہندو یوگی کے سپرد کر دیا اس نے مجھے جو طریقے بتائے وہ کم و بیش وہی تھے جو پیر صاحب نے بتائے تھے۔ البتہ بجائے اللہ اللہ کے علاوہ رام رام جپنا پڑتا تھا۔ کچھ عرصے کے بعد پھر دوبارہ میں پیر صاحب کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ مولانا نے فرمایا کہ دراصل ہمارے مسلمان صوفیوں نے ہندو یوگ کو متفق کیا۔ بت پرستی کی وجہ سے اس یوگ میں جو آلائشیں آگئی تھیں انہیں دور کیا۔ اور پھر اسی یوگ کو صاف اور پاکیزہ شکل میں ہندوؤں کے سامنے پیش کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارا تصوف ہر سمجھ دار ہندو کو اپنی طرف کھینچ سکتا ہے۔ مولانا کا خیال ہے کہ اگر فرقہ وارانہ تعصبات نہ ہوتے اور ہندوؤں کے دلوں میں مسلمان کی ہر چیز سے نفرت پیدا نہ کردی جاتی تو کچھ بعید نہ تھا کہ مسلمان عارفین کے فیض سے ہر ہندو کے دل میں اسلامی تصوف گھر کر لیتا اور ہندوؤں کے سمجھ دار طبقے اسلام کے گرویدہ ہو جاتے۔

ہندوؤں کو اسلام سے قریب لانے میں مسلمان صوفیاء نے بہت بڑا کام کیا ہے۔ یہ صوفیاء ہی کی برکت تھی کہ ہندو جو ہر اجنبی کو پلچھ اور ناپاک سمجھتے تھے اسلام کے دائرے میں جوق در جوق داخل ہوئے۔ یہ بلند بانگ دعاوی کرنے والے علماء جن کی ساری عمریں کتابوں میں گزری ہوں۔ جنہیں انسانوں سے بہت کم پالا پڑا ہو۔ اور اگر پڑا بھی ہو تو اپنے ایسے ”با صفا مومنین“ سے ہی پڑا ہو۔ وہ کیا جانیں کہ زندگی کیا ہے؟ گمراہ کیسے ہوتے ہیں؟ گناہ گاروں اور بھولے بھٹکوں کو راہ راست پر کیسے لایا جاتا ہے؟ ان کو معلوم نہیں کہ ایک بدو عرب کے سامنے جب اسلام پیش کیا جائے گا تو اس کی اور شکل ہوگی

اور ایک یونانی اور ایرانی کے سامنے اسلام کو اور انداز میں پیش کیا جائے گا۔ اسی طرح ایک ہندو سے اسلام کا تعارف اور طریق سے ہوگا۔ بات ایک ہی ہوتی ہے لیکن مخاطب کے خیال سے بات کرنے کا ڈھنگ بدل جاتا ہے۔ ہمارے صوفیاء زندگی کے اس راز کو جانتے تھے اسی لیے انہوں نے تصوف کو ہندوؤں کے دلوں تک پہنچنے کا ذریعہ بنایا۔ بے شک یہ تصوف مسلمانوں کا تھا لیکن ہندو بھی طبعاً اس سے نا آشنا نہیں تھے۔

مولانا نے اس ضمن میں ایک دفعہ فرمایا کہ ہندوستان میں ایسے صوفیاء بھی گزرے ہیں جو بالکل ہندو یوگیوں کی طرح جنگلوں میں رہتے تھے۔ ان کا رہنا سہنا رسوم طریقت ہندوؤں کی طرح تھیں۔ لیکن تھے یہ لوگ سچے خدا پرست اور اللہ کو یاد کرنے والے۔ ان کو خدا سے سچی محبت تھی اور ان بزرگوں کی دعاؤں میں تاثیر بھی تھی۔ اکثر آس پاس کے ہندوان سے دعائیں کروانے آتے تھے۔ جب کسی ہندو کو کسی ایسے بزرگ سے انس ہو جاتا اور وہ اس بزرگ کے طریقہ میں داخل ہونا چاہتا تو مرید کو طریقت کے مختلف منازل میں سے گزرنا پڑتا تھا۔ پہلی منزل میں ہندوانی وضع کو تقریباً بحال رکھا جاتا۔ دوسری منزل میں اس کو قدرے کم کر دیا جاتا اور آخر میں مرید ٹھیکہ مسلمانوں کے حلقہ میں شریک ہو جاتا۔

بات یہ ہے کہ نئے فکر کو ذہن آسانی سے قبول نہیں کرتا اور اس کے لیے بتدریج کوشش کرنی پڑتی ہے۔ یوں بھی انسان کی افتاد طبع کچھ ایسی ہے کہ جب تک اس کا ذہن کسی بات کو سمجھ نہ لے وہ اسے ماننے کو تیار نہیں ہوتا۔ بغیر قائل کیے کسی سے کوئی بات منوانا صریحاً غلط ہے۔ بے شک ظالمانہ قانون زبردستی سے بدلا جاسکتا ہے۔ لیکن زبردستی سے کوئی بات دماغ میں ٹھونس نہیں جاسکتی۔ ہمارے بزرگوں نے زندگی کی اس حقیقت کو سمجھا تھا اور وہ اسی لیے اپنی باتوں کو ہمیشہ صلح اور آشتی کے طریقوں سے منواتے تھے۔

اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ مسلمانوں نے علم تصوف کی تدوین میں دوسری قوموں سے استفادہ کیا ہے۔ مولانا کے نزدیک یہ کہنا کہ اسلامی تصوف کو ہندو فلسفے سے کوئی تعلق نہیں ہے تو زیادتی ہے۔ اسلام سے پہلے یہ فنون موجود تھے اور دوسری قوموں نے ان میں کمال حاصل کیا تھا۔ بے شک مسلمانوں نے ان کا محض نتیجہ نہیں کیا۔ بلکہ انہیں اپنایا اور ان میں نیا پن پیدا کیا۔ کہنگی اور فرسودگی کی وجہ سے یہ بے روح ہو گئے تھے، مسلمانوں نے ان کو کھرچا۔ ان کا خول بدلا اور ان کے اندر نئی جان ڈالی۔ یہ لوگ جو اس طرح کی باتیں کرتے ہیں کہ ہمارا علم دوسروں سے الگ، ہمارا تمدن سب سے بے تعلق، ہماری حکمت سب سے نرالی، ہمارے علوم و فنون سب خود ہی زمین سے اگے، ہم نے دنیائے جہاں پر اثر

ڈالا۔ لیکن ہم ہمارا ذہن اور فکر کسی سے متاثر نہیں ہوئے۔ دراصل یہ وہ لوگ ہیں جو صرف اپنی کتابیں پڑھتے ہیں۔ اور صرف اپنے ہی خیال والوں سے ملتے ہیں۔ انہوں نے کبھی یہ زحمت گوارا نہیں فرمائی کہ دوسروں کے علوم کو بھی دیکھیں۔ اپنے سوا دوسرے خیال والوں کے نقطہ نظر کو بھی سمجھیں۔ ان کی ہمہ دانی محض اس لیے ہے کہ ان کے علم کا دائرہ بہت محدود ہے۔ ممکن ہے وہ جو کچھ کہتے ہوں اس پر انہیں پورا یقین ہوتا ہو۔ لیکن بد قسمتی یہ ہے کہ وہ بات ٹھیک نہیں ہوتی اور عقل و دانش رکھنے والوں کے لیے اس کا تسلیم کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ قصہ مختصر، اسلامی تصوف اور دوسرے تصوفوں میں اصل میں کوئی بنیادی تضاد نہیں ہے۔ اور وہ ایک دوسرے سے متاثر بھی ہوتے رہے ہیں۔ لیکن چونکہ ہر قوم کا علم تصوف اپنی مخصوص ذہنیتوں اور رجحانات کا آئینہ دار ہوتا ہے اس لیے ایک کا دوسرے سے ممتاز ہونا قدرتی بات ہے۔ باہم مشترک ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ”من کل وجہ“ سب ایک حیثیت کے ہیں۔ تصوفوں میں بھی مدارج ہیں۔ ایک تصوف دوسرے سے اعلیٰ اور ارفع ہوتا ہے۔

جولائی ۱۹۴۰ء کا واقعہ ہے کہ مولانا احمد آباد تشریف لے گئے۔ وہاں گاندھی جی کے سیکرٹری مسٹر ڈیسا سے جن کا اب انتقال ہو چکا ہے ان کی ملاقات ہوئی۔ مولانا فرماتے ہیں کہ میں نے موصوف سے وحدت الوجود اور تصوف پر گفتگو کی۔ مسٹر ڈیسا نے میری باتیں سن کر کہا کہ یہ تو ہمارے ہاں ویدانت میں بھی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ میں نے جواب دیا کہ علم تصوف اور ویدانت اصل میں دو مختلف چیزیں نہیں ہیں۔ لیکن ویدانت کی نشوونما میں صرف ہندو دماغ نے حصہ لیا۔ اور پھر اس کے اساس پر جو عملی نظام بنا، وہ ہندوستان کی چار دیواری تک ہی محدود رہا۔ اس سے یہ ہوا کہ ویدانت انسانی فکر نہ ہو سکا۔ اور یہ خالص ہندوؤں کا قومی فکر بن گیا۔ پراچین ہند کی تہذیب جب سمندروں اور پہاڑوں کے درمیان گھر کر رہ گئی اور ہندو فکر نے وطن کی حدود سے باہر دیکھنا تک گناہ قرار دیا تو ویدانت میں بھی ہمہ گیریت نہ رہی۔ اس کے برعکس اسلامی تصوف نے ایک عالمگیر انسانیت کے مزاج سے نمونہ پایا۔ اس کو پروان چڑھانے میں دنیا کے سب فکروں اور قوموں نے حصہ لیا۔ اور پھر اس سے جو عملی نظام بنا، وہ نسلوں، رنگوں اور ملکوں کی حدود سے بالاتر تھا۔ چنانچہ یہ تصوف تمام انسانیت کا ترجمان بنا۔ اور اس میں صحیح بین الاقوامیت پیدا ہوئی۔ لیکن ویدانت کا نظام تو صرف ہندوستان کی محدود ذہنیت کا پابند ہو کر رہ گیا۔

اس طول طویل تمہید کے بعد ہم اصل مطلب کی طرف آتے ہیں۔ اسلامی تصوف کی ابتدا کیسے ہوئی؟ اس کو ارتقاء کے کن مراحل سے گزرنا پڑا۔ علم تصوف کی تدوین ہوئی تو کن خارجی عناصر کا اثر اس پر پڑا؟ آخر میں اس تصوف کی تہذیب اور تکمیل میں شاہ ولی اللہ نے کیا حصہ لیا۔ آئندہ صفحات میں

مشغول نہ ہوتے تھے اور مجاہدات اور ریاضتوں کی بھی چنداں پروا نہ کرتے تھے۔ ان کی پوری ہمت کیفیت فنا کو پیدا کرنے میں صرف ہوتی تھی۔

شیخ اکبر محمد الدین ابن عربی کے زمانے میں اور کسی قدر اس سے پہلے ان کے ذہنوں کو اور وسعت ہوئی اور وہ نفس کی وجدانی کیفیت سے گزر کر زندگی کے اصل حقائق کی تحقیق پر کمر بستہ ہو گئے۔ واجب الوجود کیا ہے؟ واجب الوجود سے کس طرح کائنات کا ظہور ہوا؟ اور اس ظہور کی ترتیب کیا ہے؟ ان مسائل پر بحثیں ہونے لگیں۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ حاصل کلام یہ ہے کہ یہ سب فرقے دراصل ایک ہیں۔

مختصر الفاظ میں ابتدائے عہد اسلام میں ایک صدی تک تصوف سر تا پا عمل تھا۔ اس زمانے تک نہ اس فن کا نام تصوف ہوا تھا۔ نہ اس کے اختیار کرنے والوں کو صوفیاء کہتے تھے۔ اس دور کے بعد دوسری صدی میں اس فرقہ نے صوفیاء کا لقب اختیار کیا۔ یہی وہ زمانہ تھا جس میں مجاہدہ کے خاص خاص طریقے پیدا ہوئے۔ دراصل یہ رد عمل تھا۔ عام جاہ طلبی اور تعیش کے خلاف۔ اسی زمانے میں ارباب تصوف نے علم تصوف کی تدوین شروع کر دی۔

مسلمانوں کا عہد اقبال تھا اور ان کے قویٰ میں جان تھی تو ان کا تصوف کا جذبہ تمام تر عمل پر مرکوز رہا۔ بعد میں جب علم و تمدن کا دور آیا تو صوفیائے کرام نے تصوف کو علم اور عمل کا جامع بنایا۔ آخر میں جب قوم مضطرب ہو گئی اور علم و عمل دونوں کے سوتے اس کے اندر خشک ہو گئے تو جمہور کا تصوف محض اندھا دھند عقیدت بن کر رہ گیا۔ لیکن اس سے یہ سمجھنا کہ تصوف نہ تھا تو مسلمان برسر عروج تھے۔ تصوف کا دور دورہ ہوا تو ان میں زوال شروع ہو گیا۔ تصوف کی اصل حقیقت سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔ ارباب تصوف کی بے عملی اور مردنی کا باعث تصوف نہ تھا۔ خدا کے فضل سے سچے تصوف کی شمع اب بھی کہیں کہیں روشن ہے اور اس کی روشنی سے لوگوں میں عمل، علم اور یقین کی روح بیدار ہوتی ہے۔

مولانا نے فرمایا کہ میں نے اچھے صوفی اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔ اس لیے تصوف کو زوال کا باعث یا اس کا نتیجہ ماننا میرے لیے تو ناممکن ہے۔ مجھ میں ان بزرگوں کے فیض صحبت نے جہاں اقدام اور عمل کا جذبہ تیز کیا۔ ہاں یہ سچ ہے کہ عام جمہور کے سامنے وہ کسی اور رنگ میں جلوہ گر تھے۔ لیکن جہاں تک ان کی اپنی ذات کا تعلق ہے۔ وہ اسلام کی خالص قوت اقدام کے مظہر تھے اگر وہ جمہور کے سامنے ان کے مانوس روپ میں نہ آتے تو ان کی ذات کبھی عام جاذبیت کا متبع نہ بن سکتی۔

بڑا آدمی اگر اپنی ذات میں مست ہو۔ وہ اپنی خود مستی میں گرد و پیش کی دنیا سے بالکل بے تعلق ہو جائے اور عوام کی دسترس سے بالاتر رہے تو یہ اس کی صحیح عظمت کی دلیل نہیں۔ بڑا آدمی اپنی تمام

شاہ ولی اللہ "ہمعات" میں لکھتے ہیں کہ دین محمدی کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن ہے؟ ظاہر کی حفاظت فقہاء محدثین، غازیوں اور قاریوں نے اپنے ذمے لی۔ باطن دین و مغز دین کہ "احسان" ہے اس کی اشاعت اور اقامت کا کام اولیاء اللہ کے سپرد ہوا۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ آنحضرت اور صحابہ کرام کے زمانے میں چند قرون تک اہل کمال کی توجہ زیادہ تر ظاہر شرع کی طرف تھی۔ ان کا "احسان" یعنی تصوف یہ تھا کہ نماز، روزہ، صدقہ، ذکر، تلاوت، حج اور جہاد کو عمل میں لائیں۔ ان میں سے کوئی شخص ایک ساعت بھی سر کو جب تفکر میں نہیں ڈالتا تھا۔ نہ کوئی شخص بے ہوش ہوتا تھا۔ نہ وجد کرتا تھا نہ کپڑے پھاڑتا تھا نہ شطح یعنی خلاف شرع کوئی لفظ اس کی زبان پر آتا تھا۔ تجلی اور استتار وغیرہ سے کچھ خبر نہیں رکھتا تھا۔ بہشت کی وہ رغبت رکھتے تھے۔ دوزخ سے وہ ڈرتے تھے اور کشف و کرامات، حرق عادات، سکر اور غلبات ان سے کمتر ظاہر ہوتے تھے۔ اس قبیل سے جو باتیں ان سے ظاہر ہوئیں، غالباً وہ اتفاقی طور پر تھیں نہ کہ ان کا قصد کیا گیا تھا۔

سید الطائفہ جنید کے زمانے میں اور کسی قدر ان سے پیشتر فیضانِ غیبی سے ایک اور رنگ پیدا ہوا۔ عام لوگ تو مذکورہ عبادات ہی پر متوقف رہے۔ خواص نے مجاہدات، ریاضتوں اور ذکر و اشغال میں سخت انتہاک حاصل کیا اور دنیا سے بھی کنارہ کشی اختیار کی۔ اس سے ان کے دل میں ایک کیفیت پیدا ہوئی۔ وہ اس طرف خاص طور پر متوجہ ہو گئے اور اسے ترقی دینے لگے۔ وہ مدتوں مراقبے میں سرسبب رہے۔ اور ان پر تجلی، استتار، انس و وحشت کے احوال ظاہر ہونے لگے۔ جن کو انہوں نے نکات اور اشارات سے تعبیر کیا۔ اس طبقے میں نہایت صادق الاحوال وہ شخص تھا جو اسی حال کو بیان کرتا تھا جو خود اس میں موجود تھا۔ سماع کی رغبت، صغہ، کپڑے پھاڑنا اور رقص کرنا ان میں پیدا ہو گیا اور دلوں کی باتیں معلوم کر لینے کی بھی ان میں فراست پیدا ہو گئی۔ یہ مخلوق سے قطع تعلق کرتے تھے۔ پہاڑوں اور بیابانوں میں چلے جاتے تھے۔ صرف گھاس اور درختوں کے پتوں پر گزارا کرتے تھے۔ ملبوسات میں صرف گدڑی پہنا کرتے تھے۔ نفس و شیطان کی مکاریاں اور مہلکات دنیا کو پہچانتے تھے۔ اپنے نفس سے جہاد کرتے تھے۔ اور ان کا اخلاص یہ تھا کہ محض محبت الہی سے خدا کی عبادت کریں نہ کہ امید جنت اور خوف دوزخ سے۔

سلطان الطریقہ شیخ ابوسعید بن ابی الخیر اور ابوالحسن خرقانی کے زمانے میں ایک اور صورت کا فیضان ہوا۔ جس میں عامہ تو اعمال و عبادات پر اور خاصہ احوال پر ٹھہرے رہے اور خاصہ الخاص پر اس ذات میں جو قیوم اشیاء ہے فنا اور ضمحلال ہونے کی کیفیت طاری ہو گئی۔ یہ اور دو وظائف میں چنداں

بڑائی کے باوجود اپنے ہم جنسوں کے لیے اجنبی نہیں بن جاتا۔ وہ ان میں رہتا ان کی زندگیوں کو متاثر کرتا ان کے اندر رہ کر اور ان کے درجے پر آ کر اپنی بلند شخصیت کا پرتوان کی زندگیوں پر ڈالتا ہے۔ میرے سنی مرشد اور حضرت مولانا گنگوہی اسی پایہ کے بزرگ تھے۔ فرض کیا آج اگر ان کی مسند پر ان ایسے فیض رساں بزرگ نہ ہوں تو اس سے یہ تو لازم نہیں آتا کہ وہ حضرات بھی تصوف میں کامل نہ تھے۔ جذب و تاثیر نہ رکھتے تھے۔ ان کا فیض عمل و اقدام کا مقتضی نہ تھا اور ان سے کمزور بزدل اور ناکارہ لوگ باہمت نہ بنتے تھے۔

ایک دفعہ اس سوال کے جواب میں ”اسلام کے متصوفانہ تصور میں بظاہر ایک کمی معلوم ہوتی ہے۔ اس میں زیادہ زور آخرت پر دیا جاتا ہے۔ اور ایک مادی تصور حیات اسی دنیا کو عالمگیر جنت بنانا چاہتا ہے۔ بے شک ارتقاء دونوں میں ہے۔ لیکن ایک تو ارتقاء کا موہوم تصور پیش کرتا ہے اور دوسرا بالکل یقینی قابل فہم اور ہمت افزا۔ مولانا نے فرمایا کہ صوفیاء اور علماء جب ناکارہ ہو کر رہ گئے۔ اور ان کا دائرہ علم محض روایت پرستی اور حاشیہ نویسی تک محدود رہ گیا تو انہوں نے اس دنیا کی تحقیر اور دوسری دنیا کی تعظیم کو اپنا شعار بنالیا۔ یہ ان کی اپنی کم بینی اور کج فہمی تھی۔ اسلام کا اس سے دور کا بھی تعلق نہ تھا۔

آپ نے فرمایا کہ ہر اجتماع میں اعلیٰ سے اعلیٰ اور اسفل سے اسفل افکار اور رجحانات موجود ہوتے ہیں۔ لیکن جب زمانہ عروج ہوتا ہے تو اسفل افکار دبے رہتے ہیں اور شاذ و نادر کوئی فرد انہیں قبول کرتا ہے۔ عام جمہور ان سے بیزار ہوتے ہیں۔ لیکن جب قوم کا مزاج بگڑ جائے تو پھر اعلیٰ افکار دھندلے ہو جاتے ہیں اور اسفل خیالات کا قوم میں سکھ رواں ہوتا ہے۔ اس لیے قومی افکار اور رجحان کی صحیح تشخیص بہت غور و فکر چاہتی ہے۔

مولانا نے فرمایا کہ بے شک عہد اول میں بھی مسلمانوں میں دنیا سے متنفر ایک گروہ موجود تھا اور ہمیں اسلامی تاریخ کے ہر دور میں اس کے آثار نظر آتے ہیں لیکن اجتماع اسلامی میں اس فکر کو ایک ہزار سال ہجری کے بعد غلبہ نصیب ہوا۔ اس زمانہ میں ہمارا تمام علمی اثاثہ اس سے متاثر ہوا۔ نہ ہماری فقہ پیچی نہ تفسیر نہ فلسفہ اور نہ تصوف۔

لیکن ہمارے تصوف کا ایک دور ایسا بھی گزرا ہے کہ صوفیاء سپاہی تھے۔ سلاطین ان کے مشوروں پر چلتے تھے۔ وہ سپہ سالاروں کے دست و بازو ہوتے تھے۔ اس عہد کے صوفیاء دنیاوی مال و متاع سے بے شک متنفر تھے۔ لیکن تبلیغ، جہاد، اقدام جدوجہد اور اشاعت اسلام ان کی زندگی کا مقصد تھا۔ صوفیاء علماء سے ممتاز سمجھے جاتے تھے۔ علماء سلطنت کے ارکان تھے۔ صوفیاء سلطنت سے الگ رہتے تھے۔ لیکن سلطنت کی بے راہ رویوں کو ٹوکنے کے مجاز تھے۔ ان کی حیثیت کسی سیاسی پارٹی کے اُس گروہ کی

سی تھی جو سلطنت کے عہدے کو تو قبول نہیں کرتا۔ لیکن اپنی پارٹی کے عہدے قبول کرنے والے اشخاص پر کڑی نگرانی رکھتا ہے۔ کسی صوفی کو یہ اجازت نہ تھی کہ وہ سلطنت کا کوئی منصب قبول کرے۔ لیکن اس کو یہ حق ضرور حاصل تھا کہ بادشاہ سے لے کر عام متصدی اور سپاہی تک کے کردار کی نگرانی کرے اس عہد کے صوفیاء کو یہ سمجھنا کہ وہ محض ”اہل اللہ“ تھے۔ اور دنیا کے کاروبار سے انہیں کوئی سروکار نہ تھا، صحیح نہیں۔ اس موقع پر مولانا نے مثال کے طور پر چند بزرگوں کے نام لیے۔ آپ نے فرمایا کہ محمود غزنوی کے حملہ سومنات میں ایک بہت بڑے چشتی بزرگ شامل تھے۔ محمد غوری سے پہلے اجمیر میں حضرت معین الدین پہنچ چکے تھے۔ علاؤ الدین خلجی بڑا جبار بادشاہ تھا۔ نظام الدین اولیاء اس کے زمانے میں پایہ تخت دہلی میں سلطان الاولیاء تھے۔ اور بادشاہ و گدا ان کے سامنے دست بستہ حاضر ہوتے تھے۔ صوفیاء کے اس گروہ سے علمائے حکومت یعنی سلطنت کی قوت عادلہ بھی دیتی تھی۔ چنانچہ اس طرح ہندوستان میں اسلامی سلطنت کا نظام چلتا رہا۔

اور سچی بات تو یہ ہے کہ ہندوستان میں دراصل صوفیاء ہی اسلام کے پیش رو تھے۔ اس سلسلے میں ایک دفعہ مولانا نے فرمایا کہ صوفیاء اسلامی تحریک کے (VANGUARD) (یہ لفظ مولانا کا ہے) تھے۔ عام طور پر حاکم و محکوم کبھی صلح و آشتی سے بہم شکر نہیں ہو سکتے۔ حاکم زبردستی محکوم پر حکومت کرتا ہے اور جب محکوم میں طاقت آتی ہے تو حاکم کی حکومت اس کے مذہب اس کے کلچر اور اس کے تمدن کو مٹا دیتا ہے۔ قوموں کا آپس میں تقاضا اور تناظر ایک فطری سی بات ہے۔ آج حجاز میں ترک اور کافر ہم معنی الفاظ ہیں۔ اور عربوں کو ترک مسلمانوں سے اتنی نفرت ہے کہ شاید انگریز کافروں سے نہ ہو۔ حالانکہ استنبول کے علاوہ عثمانی ترک سب سے زیادہ روپیہ مکہ اور مدینہ پر صرف کرتے تھے۔ ہندوستان میں ہندو تو مذہب زبان تمدن بلکہ ہر چیز میں مسلمان حاکموں سے جدا تھے۔ ظاہر ہے ترک اور مغل تلوار سے اتنے بڑے ملک پر حکومت نہیں کر سکتے تھے۔ اور ہندوؤں کو اسلام سے قریب لانا ان شمشیر آزماتہ سالاروں کے بس میں نہ تھا۔ اس لیے ضرورت تھی کہ محکوم قوم کی ذہنیت کو صحیح طور پر سمجھا جائے۔ اور اسے اسی طرح ڈھالا جائے کہ اسلام ان کے لیے اجنبی نہ رہے۔ ہمارے صوفیاء اس ملک میں یہ کام کرتے تھے۔

حضرت نظام الدین اولیاء کے ایک خلیفہ حضرت سراج الدین کا جو گور میں قیام فرماتے تھے۔ ذکر ہے کہ انہوں نے اپنے تین سومرید چین بھیجے تھے اور ان لوگوں کی کوششوں سے ان نواح میں اسلام پھیلا۔

مولانا نے فرمایا کہ بہت سے لوگوں نے ہندوستان کی سیاسی تاریخیں لکھی ہیں اور بعض نے

تمدنی تاریخ بھی لکھی ہے۔ میری دعا ہے کہ خدا کسی مسلمان کو توفیق دے کہ وہ اپنی تاریخ کو اس نظر سے بھی دیکھے اور ہندوستان میں صوفیاء کے خانوادوں نے جو کچھ کیا ہے وہ اس کو دنیا کے سامنے لائے۔

عجیب بات یہ ہے کہ پرانے ہندوؤں کی تاریخ میں بھی کم و بیش ہمیں یہی نقشہ نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر تارا چند اپنی مشہور کتاب (ہندو کلچر پر اسلام کے اثرات) میں لکھتے ہیں۔ ”ہندو اپنے مذہب کو نجات یعنی مکتی کے نقطہ نظر سے دیکھنے کے عادی ہیں۔ ان کے ہاں مکتی حاصل کرنے کے لیے تین راستے ہیں۔ ایک عمل (کرم) کا راستہ۔ دوسرا علم (جتانہ) اور تیسرا عقیدت (بھگتی) کا راستہ ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ یہ تینوں راستے ایک دوسرے سے بالکل الگ تھلک ہوں بلکہ ہر فرقہ اپنی اپنی جگہ ان تینوں کی حیثیت قبول کرتا ہے۔ لیکن اتفاق یہ ہے کہ مذہب کے عملی پہلو پر ابتداء میں زیادہ زور دیا گیا۔ اس کے بعد علمی پہلو خاص تو جہات کا مرکز بنا اور آخر میں بھگتی کا غلبہ ہوا۔“

بہر حال یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا اس سے ہمارا مقصد صرف یہ بتانا تھا کہ مختلف قوموں اور ملتوں کو کس طرح تاریخ کے ایک ہی سے ادوار سے گزرنا پڑتا ہے۔ ہمارا تصوف کسی زمانے میں سر تا پا عمل تھا۔ حضرت جنیدؒ نے سب سے پہلے تصوف کی بطور ایک علم کے طرح ڈالی اور بعد میں دوسرے ارباب تصوف نے بھی اس موضوع پر مستقل کتابیں لکھیں۔ ان والا تبار شخصیتوں میں محی الدین ابن عربی کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ مسلمانوں میں یہ عقیدہ وحدت الوجود کے سب سے بڑے سرگرم مبلغ ہوئے اور انہوں ہی نے اس عقیدہ کو علمی طور پر تصوف کا اساس بنایا۔

شیخ ابن عربی حدیث کے بہت بڑے عالم اور مسلک میں ظاہری تھے۔ ان کی زندگی اتباع حدیث کا نمونہ تھی۔ دوسری طرف ان کی ذات صاحب کشف و حال ہے۔ وہ وجدانی کیفیت کی سرمستی میں جو کچھ ان کے قلب پر گزرتی ہے اسے بے دریغ لکھتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن ان کے کلام میں حکیمانہ تنظیم اور ترتیب نہیں۔ چنانچہ ان کی کتابوں کا پڑھنا بڑے صبر کا کام ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ اس کائنات سے بھی بلند تر ایک تجلی اعظم کو مانتے ہیں اور اس تجلی کو وہ ذات کا عین قرار دیتے ہیں۔ لیکن بعض دفعہ ان کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس کائنات کو ہی عین ذات سمجھ رہے ہیں۔

ابن عربی کے وحدت الوجود کے عقیدہ نے مسلمانوں کی فکری زندگی میں ایک ہلچل پیدا کر دی تھی۔ اس کا اثر قوم کی انفرادی اور اجتماعی زندگی پر پڑا اور تصوف تو سارے کا سارا اسی رنگ میں رنگا گیا۔ صوفیاء نے ابن عربی کو اپنا امام مانا اور وحدت الوجود کو تصوف کی عمارت کا سنگ بنیاد قرار دیا۔ ہر شاعر نے یہ راگ الاپا۔ ہر محفل میں اسی پر تھاپ پڑی۔ صوفی اسی دھن میں مست ہو گئے۔ یہ عقیدہ خواص تک محدود رہتا تو اس کی اور بات تھی لیکن جب عوام کو بھی اس کی مجلس میں بارل گیا تو نئے نئے

شکوے نکلنے لگے اور معاملہ یہاں تک پہنچا کہ امام ابن تیمیہ جیسے بزرگ کو وحدت الوجود کے عقیدہ پر کفر اور ابن عربی کے متعلق کافر کا فتویٰ دینا پڑا۔

وحدت الوجود کا عقیدہ بڑا دقیق ہے اور اسے سمجھنا اور سمجھانا بہت ہی مشکل ہے۔ ہم یہاں اس عقیدہ کی گہرائیوں میں پڑنے کی بجائے اس کے عام مفہوم کو بیان کرنا چاہتے ہیں۔

حضرت شاہ محمد حسین صاحب۔ الہ آباد میں ایک بزرگ اور صوفی باصفا گزرے ہیں۔ وہ اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ ”جب ہم موجودات پر نظر ڈالتے ہیں تو ان میں دو چیزیں پائی جاتی ہیں ایک اشتراک دوسرے امتیاز یعنی ایک یہ کہ وہ ایک دوسرے سے مختلف صفتوں میں مشترک ہیں۔ مثلاً انسان انسانیت میں مشترک ہے اور اپنے خاص خاص تعینات کے اعتبار سے ایک دوسرے سے ممتاز ہے۔ اسی طرح جتنے جان دار ہیں ان سب میں جان دار ہونا مشترک ہے اور انسان اور گھوڑا ہونا ان کو آپس میں ایک دوسرے سے ممتاز کرتا ہے۔ اسی طرح تمام موجودات میں جو چیز مشترک ہے وہ وجود ہے ممکن میں اور واجب میں دونوں میں وجود پایا جاتا ہے۔ اس وجود سے ہونا مراد نہیں بلکہ وہ حقیقت مراد ہے جس کی بنا پر ہم کسی چیز کو موجود کہتے ہیں۔ یہ حقیقت اپنی جگہ پر بلا کسی موجود کرانے والے کے موجود ہے۔ اس لیے کہ یہی ذریعہ وجود ہے۔ لہذا اسے خود پہلے موجود ہونا چاہئے اور یہی وجود تمام چیزوں پر حاوی ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو ہر شے معدوم ہے۔“

”اب جو چیزیں اس وجود کے علاوہ مخلوقات میں پائی جاتی ہیں وہ اعتباری ہیں۔ اس لیے اگر وجود نہ ہو تو ان سب کا خاتمہ ہے۔ لہذا یہی وجود خدا تعالیٰ کا عین ذات ہے اور دنیا کی جتنی چیزیں ہیں۔ ان سب کی حقیقت یہی وجود ہے اور ہر چیز کی علیحدہ شخصیت وجود کے صرف اعتباری ہے۔“

مطلب یہ ہوا کہ تمام موجودات میں وجود مشترک ہے۔ اگر یہ وجود نہ ہو تو یہ موجودات بھی نہ ہوں۔ اس سے بعض ارباب تصوف اس نتیجے پر پہنچے کہ خدا عبارت ہے موجودات سے۔ یعنی خدا نے ان موجودات میں اپنے آپ کو ظاہر کیا ہے۔ اس گروہ کو وجود یہ یا عینیہ کہا جاتا ہے۔ لیکن بعض صوفیاء کا کہنا یہ ہے کہ یہ وجود جو سب موجودات میں مشترک ہے اور اسی سے سب موجودات کا قیام اور مدار ہے۔ یہ وجود ایک اور برتر وجود کا فیضان اور پر تو ہے۔ اس گروہ کو رائیہ کہتے ہیں۔ ورائیہ سے مراد یہ ہے کہ وہ اس کائنات سے ماوراء ذات خداوندی کو مانتے ہیں۔

مولانا فرماتے ہیں کہ ابن عربی کے ہاں یہ دونوں خیال ملتے ہیں۔ کہیں وہ موجودات کو عین ذات کہہ جاتے ہیں اور کہیں ذات الہی کو موجودات کے مالہ اوباتتے ہیں۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے

سوانح حیات مولانا الحاج شیر عشق شاہ محمد حسین صاحب الہ آباد

ایک دفعہ مولانا نے کہا۔ انسان جب اپنے متعلق سوچتا ہے اور وہ اپنے وجود کا سراغ لگانے کی کوشش کرتا ہے تو سوچتے سوچتے اس کا خیال اس مقام پر پہنچتا ہے کہ ایک ہی وجود ہے جس سے یہ سب کائنات نکلی ہے۔ یہ وجود ایک ہے اور ساری کثرات اس کا مظہر ہیں۔ یہ عینہ کا گروہ ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ یہ خیال عوام کے ذہن میں بہت مناسب ہے۔ کیونکہ ان کے لیے خدا کا تصور ایک مطلق تجرد کے طور پر کرنا بڑا مشکل ہے۔ وہ حقیقت کو اگر وہ جسم میں متمثل ہو تو آسانی سے سمجھ لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک گنوار کو پانچ کا عدد بتانے کے لیے ایک دو تین چار پانچ کر کے انگلیوں پر گن کر دکھانا پڑتا ہے۔ اس کا ذہن پانچ کے عدد کا مجرد مفہوم ٹھوس جسم کی مثال دیکھے بغیر سمجھ ہی نہیں سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ شروع شروع میں انسان خدا کو مادی مظاہر کی شکل ہی میں پہچان سکا۔ مولانا کے نزدیک یہ صائبیت کا دور تھا۔ حضرت ابراہیم سے حنیفیت کا عہد شروع ہوتا ہے۔ حنیفیت کا اساسی عقیدہ یہ تھا کہ خدا ان موجودات سے ماوراء ہے۔ وہ ہر قسم کے جسم سے منزہ اور مجرد ہے۔ قرآن مجید میں حضرت ابراہیم کا ستارہ سے چاند اور چاند سے آفتاب اور پھر آفتاب سے ان کے خالق کی طرف رجوع کرنا یہی عینیت سے وراثیت کی طرف جانے کا واقعہ ہے۔

ابن عربی نے اپنے وحدت الوجود کے تصور میں عینیت اور وراثیت دونوں کو جمع کر لیا تھا۔ عملی لحاظ سے اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے نزدیک صائبی تو میں جو صرف مظاہر قدرت ہی میں خدا کو جلوہ گر مانتی تھیں۔ اور حنیفی ملتیں جو خدا کو مظاہر قدرت سے ماوراء جانتی تھیں۔ دونوں کا حق شناس ہونا تسلیم کر لیا گیا۔ ابن عربی کے ان اشعار سے ان کے خیال کی مزید وضاحت ہو سکے گی۔ فرماتے ہیں:

لقد كنت قبل اليوم انكوصاجي
اذالم يكن ديني الى دينه واني
وقد صار قلبي قابلا كل صورة
فرعى لغزلان وودير لرهبان
وبيت ليزان و كبتة قاصد
والواح تواراة ومصحف قرآن
ادين بدین الحب انى توجھت
رکابہ فالحب ديني وايماني

(آج کے دن سے پہلے میرا یہ حال تھا کہ جس ساتھی کا دین مجھ سے نہ ملتا۔ میں اس کا انکار کرتا اور اسے اجنبی سمجھتا۔ لیکن اب میرا دل ہر صورت کو قبول کرتا ہے۔ وہ چراگاہ بن گیا ہے غزالوں کی اور ویرا ہوں کے لیے۔ آگ پوجنے والوں کا آتش کدہ اور حج کا قصد کرنے والوں کا کعبہ۔ تورات کی الواح اور قرآن کا صحیفہ۔ میں اب مذہب عشق کا پرستار ہوں۔ عشق کا قافلہ جدھر بھی مجھے لے جائے۔ میرا دین بھی عشق ہے میرا ایمان بھی عشق ہے۔)

مجموع غزنوی کے زمانے میں اور اس کے بعد ایرانی اور ترکمانی مسلمان اسلام کا جو تصور لے کر

ہندوستان آئے وہ تصور بہت حد تک اسی تصوف سے متاثر ہو چکا تھا۔ اس تصوف کی ہیئت ترکیبی کے متعلق ڈاکٹر تارا چند اپنی کتاب ”ہندو کلچر پر اسلام کے اثرات“ میں لکھتے ہیں۔ ”اس کی مثال ایک دریا کی سی تھی جس میں ہر طرف سے ندیاں اور نالے آ کر مل جاتے ہوں۔ اس تصوف کا منبع اصلی قرآن اور رسول کی زندگی تھی۔ عیسائیت اور نوافلاطونی خیالات نے اس میں بڑا کام کیا۔ پھر ہندو اور بدھ مت سے اس میں بہت سے نئے افکار شامل ہو گئے۔ اور ایران کے قدیم مذاہب کی باقیات بھی اس میں آئیں۔“ لیکن مسلمان صوفیائے کرام نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ تصوف کے رجحانات کو شریعت اسلام کے تابع رکھیں۔ دوسرے لفظوں میں شریعت غالب تھی اور یہ سب خیالات و افکار رجحانات اس کے تابع۔ جو اہل تصوف شریعت کے خلاف جاتے، جمہور صوفیاء انہیں اچھا نہ سمجھتے تھے۔

شیخ عبدالقادر جیلانی ”غنیۃ الطالبین“ میں ارشاد فرماتے ہیں کہ صوفیوں کا ظاہر لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے، باطن اللہ عزوجل کے ساتھ۔ ان کے اعمال کلام اللہ کے حکم اور دل اللہ کے علم سے مزین ہوتا ہے۔ حضرت جنید فرماتے ہیں کہ ہدایت کے تمام راستے صرف اس کے لیے کھلے ہیں جو رسول کی پیروی کرے۔ دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ ہمارا علم تصوف کتاب و سنت کے ساتھ مقید ہے۔ ابن عربی کا ”فتوحات مکیہ“ میں ارشاد ہے کہ ہر حقیقت جو خلاف شریعت ہو، گمراہی ہے اور ہر شریعت جو حقیقت سے خالی ہو، وہ اپنے عمل کرنے والے کے لیے ایک معطل چیز ہے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی امام مالک کا ایک قول نقل فرماتے ہیں:

”جو شخص صوفی ہو اور فقیہ نہ ہو وہ گمراہ ہو۔ اور جو فقیہ ہو اور صوفی نہ ہو وہ فاسق رہا۔ جس نے ان دونوں چیزوں کو جمع کیا۔ وہ محقق ہوا۔“

ہندوستان پر اس تصوف نے جو اثر ڈالا اس کا ذکر کرتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں کہ ہندوستان میں اسلام ایرانیوں اور ترکوں کے ذریعہ پہنچا۔ خالص عربی اثر سندھ کی حدود سے آگے نہیں بڑھ سکا۔ عباسیوں کا زمانہ آیا تو ہندوستانی افکار یہاں سے بغداد پہنچے اور مسلمانوں نے انہیں اپنے نظام تصوف میں جگہ دی۔ اس ضمن میں مولانا نے بیان کیا کہ حضرت بایزید بسطامی ابوعلی سندھی سے توحید پڑھتے تھے۔ اور وہ انہیں سورت فاتحہ پڑھاتے تھے۔ توحید سے مراد مسئلہ وحدت الوجود ہے اور فاتحہ پڑھنے کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ ابوعلی سندھی نو مسلم تھے وہ عربی نہیں جانتے تھے۔ اور نماز میں پڑھنے کے لیے انہیں سورت فاتحہ کی ضرورت تھی۔ اس لیے بایزید سے سورت فاتحہ پڑھتے تھے۔

ہندوستان میں اسلام فارسی بولنے والوں کے ذریعہ آیا۔ ان کے ہاں مثنوی مولوی روم ”ہست قرآن در زبان پہلوی“ کا درجہ رکھتی تھی۔ مثنوی کی وجہ سے مسلمانوں کے اہل علم اور حکمران

طبقات میں وحدت الوجود کا خیال عام تھا۔ چونکہ موجودات کو عین ذات سمجھنے میں ویدانت اور وحدت الوجود میں ایک گونہ مشابہت تھی۔ اس لیے ہندوؤں نے اس فکر کو قبول کیا اور ان کے پڑھے لکھے طبقات میں مشنری کا چرچا رہنے لگا۔ ہندوؤں کے لیے تو وحدت الوجود کا تصور ایک طرح سے ان کا اپنا تھا۔

چنانچہ ہندوستانی صوفیاء کا چشتی سلسلہ ابن عربی کے وحدت الوجود سے زیادہ متاثر ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس سلسلے کو ہندوستان میں تبلیغ میں بھی خاص طور پر کامیابی ہوئی۔ اس کے سلوک کے طریقے ہندی طبائع سے زیادہ قریب ہیں۔ حضرت نظام الدین اولیاء کے بارے میں مشہور

مورخ۔ فرشتہ نے ابن عربی کے چند ایسے رسالوں کا نام گنایا ہے جو ان کے زیر مطالعہ رہتے تھے۔ اکبر اعظم اسی سلسلے کے ایک بزرگ حضرت سلیم چشتی کا بڑا معتقد تھا اور اس کے دین الہی کے بنیادی تصور میں بہت حد تک اسی عقیدہ وحدت الوجود کی جھلک نظر آتی ہے۔ گواکبر سے پہلے وحدت الوجود کے خیالات ہندوستان میں موجود تھے اور اس کی بنا پر اہل تصوف میں وحدت ادیان کا خیال بھی عام تھا۔ لیکن اکبر پہلا شخص ہے جس نے تصور وحدت ادیان کو سلطنت کی سیاسی حکمت عملی کا اصول بنانا چاہا اور ہندو اور مسلمان رعایا سے مذہب کی بنا پر جو عدم مساوات برتی جاتی تھی اس کو مٹانے کی کوشش کی۔

مولانا فرماتے ہیں کہ وحدت الوجود کا تصور اپنی جگہ بالکل صحیح ہے اور اس سے لازمی طور پر وحدت ادیان کا جو خیال پیدا ہوتا ہے وہ بھی اصولاً ٹھیک ہے۔ لیکن وحدت ادیان ان معنوں میں چونکہ سب دین اصلاً ایک ہی ہیں۔ اس لیے کسی ایک دین کا ماننا اور اس کے قانون پر چلنا ضروری نہیں غلط چیز ہے۔ اکبر کے دین الہی کے مفکروں سے یہ چوک ہوئی۔ یا یہ بھی ممکن ہے کہ ان کے ذہنوں میں تو یہ حقیقت موجود ہو لیکن عمل میں اس کا خیال نہ رکھا گیا ہو۔ وحدت ادیان کو اس طرح ماننا نراج اور انارکزم ہے۔ شریعت بہر حال طریقت پر مقدم ہے۔ یعنی ایک شخص کے لیے ضروری ہے کہ وہ جس جماعت میں رہے۔ اس کے اجتماعی قانون کو تسلیم کرے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ اس کے جی میں جو آئے وہ اسی کو اپنا قانون بنا لے اور اس پر چلنے کی کوشش کرے۔ اس سے زندگی میں کوئی نظم پیدا نہیں ہو سکتا اور جماعتی زندگی کا سرے سے شیرازہ ہی بکھر جاتا ہے۔

اکبر کے عہد میں وحدت ادیان کی اس غلط تعبیر سے نتیجہ یہ نکلا کہ دین الہی کے پیروؤں کے ذہنوں میں انتشار پیدا ہو گیا اور مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کے تہ و بالا ہونے کے آثار نظر آنے لگے۔

پوسٹل ڈیپارٹمنٹ، لاہور، پاکستان

اسی کا رد عمل امام ربانی مجدد الف ثانی کا ظہور ہے۔

عقیدہ وحدت الوجود وحدت ادیان اور ایک مستقل دین کی جو بالترتیب جدا جدا حیثیتیں ہیں ان کی وضاحت کرتے ہوئے ایک دفعہ مولانا نے فرمایا۔ کہ ان کی مثال انسانیت بین الاقوامیت اور قوم کی ہے۔ میں انسانیت عامہ پر عقیدہ رکھتا ہوں اور اسی بنا پر بین الاقوامیت پر بہت زور دیتا ہوں۔ لیکن انسانیت اور بین الاقوامیت پر عقیدہ رکھنے سے میرے نزدیک یہ لازم نہیں آتا کہ قوم کے مستقل وجود کو نہ مانا جائے۔ اب اگر قوم کا اپنا ایک مستقل وجود ہے تو یہ ضروری نہیں کہ نازیوں اور فاشسٹیوں کی طرح فرد کے وجود سے یکسر انکار کر دیا جائے۔ قوم بین الاقوامیت اور انسانیت ایک سلسلہ کی مختلف کڑیاں ہیں۔ بعد میں میرا شخصی عقیدہ میرا قومی اور ملی مذہب وحدت ادیان اور وحدت الوجود ذہنی ارتقاء کے مراحل ہیں۔ صالح فرد وہ ہے جو قوم کا صالح جزو بن سکے۔ صالح قوم وہ ہے جو بین الاقوامیت کی صالح جزو ہو اور صالح بین الاقوامیت وہ ہے جو انسانیت کو اپنے اندر سما سکے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کی زندگی کی ہر منزل میں انفرادیت بھی ہے اور دوسروں سے یگانگت بھی۔ اگر انفرادیت اور یگانگت ہم آہنگ ہوں تو زندگی مفید اور صالح ہوتی ہے۔ لیکن اگر یگانگت ہو اور انفرادیت نہ ہو تو یہ عدم نظام یا نراج اور انارکزم ہے۔ اور اگر انفرادیت پر سارا انحصار ہو تو اس کا مظہر شخصی تعصب، جماعتی تعصب اور قومی تعصب ہوتا ہے۔

وحدت الوجود کی غلط عملی تعبیر سے اکبر کے عہد میں بے اعتدالیاں پیدا ہوئیں۔ اور بد قسمتی سے شریعت اور شعائر کا استہزاء درباری مسلک میں داخل ہو گیا۔ امام ربانی اس کی اصلاح کے لیے اٹھے۔ ان کے والد ابن عربی کے طریقے پر تھے۔ شروع میں خود امام ربانی بھی وحدت الوجود کے قائل تھے لیکن بعد میں آپ نے ابن عربی کے اس تصور وحدت الوجود کے خلاف آواز اٹھائی اور یہ بتایا کہ کائنات میں جو وحدت ہمیں نظر آتی ہے اس کو وجود اصلی سمجھنا غلطی ہے۔ وجود حقیقی تو اس سے بہت پرے ہے۔ اور یہ کائنات اس کی تخلیق ہے جب یہ کائنات موجود نہ تھی تو اس کا وجود تھا۔ اس لیے کائنات اور یہ وجود ایک نہیں ہو سکتے۔ ایک خالق ہے ایک مخلوق ایک معبود ہے اور دوسرا بندہ۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

”ان الله سبحانه و تعالی وراء الورا ثم وراء الورا ثم وراء الورا۔“

یہ ہے عقیدہ وحدت الشہود جو امام ربانی نے ابن عربی کے عقیدہ وحدت الوجود کے رد میں پیش کیا۔

وحدت الوجود اور وحدت الشہود میں جو فرق ہے اس کو سمجھنے کے لیے Phiosophy of Faqirs

کے مصنف کے اس بیان سے بڑی مدد ملے گی۔ موصوف نے دونوں کے رجحانات کو ایک نقشہ کی صورت میں پیش کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

وحدت الوجود (ہوالکل) - وحدت الشہود (ہوالباری)

نظریہ..... ہمہ اوست یا اندر ہمہ اوست - نظریہ..... ہمہ از اوست۔

ارتقاء..... خود بخود ہوتا ہے۔ - ارتقاء..... پیدا کیا جاتا ہے۔

رجحان تصوف..... سکون کی طرف - رجحان تصوف..... جوش کی طرف

مائل - مائل

اس کے ساتھ میں - میں اور وہ جدا نہیں

اور میرے ساتھ وہ ہے - (وہ دریا تو میں قطرہ ہوں)

عشق - وصل

حقیقت..... حق - حق - حق - حقیقت..... حسن ازل - محبوب کل

اعتقاد..... میں کون؟ انا الحق - اعتقاد..... میں کون؟ انا عبدہ

(عارف) - (عاشق)

شاہ ولی اللہ ابن عربی اور امام ربانی دونوں سے مستفید ہوئے۔ آپ کے نزدیک امام ربانی جس کو وحدت الشہود کہتے ہیں یہ تصور تو حید خود ابن عربی کے ہاں موجود ہے۔ بے شک ابن عربی کے تصور سے جو غلط فہمیاں پیدا ہو گئی تھیں امام ربانی نے ان کی اصلاح فرمادی۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ابن عربی کا تصور وحدت الوجود غلط تھا۔ شاہ صاحب کے خیال میں خود ابن عربی بھی کائنات کو خالق کائنات کے مرادف نہیں سمجھتے۔ لیکن ان کا کہنا یہ ہے کہ آخر یہ کائنات جس وجود سے نکلی ہے وہ وجود اللہ کے ماسوا کوئی دوسرا وجود تو نہیں ہو سکتا ہے۔ اس کائنات اور خالق کائنات میں کیا تعلق ہے۔ شاہ صاحب نے اس کو تجلی کے ذریعہ حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ تجلی کی حقیقت سمجھ لینے سے وحدت الوجود اور وحدت الشہود میں تعارض نہیں رہتا۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اہل فکر کے نزدیک خدا ہر قسم کی جسمانیت سے اتنا مجرد ہے کہ انسانی حواس اس کا کسی طرح ادراک نہیں کر سکتے ہیں۔ اب دوسری طرف انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کو

اس کتاب کے مصنف سر احمد حسین نواب امین جنگ بہادر ہیں۔

دیکھئے۔ نبوت کا تو مطلب ہی یہی ہے کہ اس کے حامل نے خدا کی کوئی بات سنی۔ مولانا کے نزدیک شاہ صاحب کے تصوف کا یہی کمال ہے کہ وہ تجلی کے ذریعہ سمجھا دیتے ہیں کہ بندہ کس طرح خدا کی بات سن سکتا اور اسے دیکھ سکتا ہے۔ خدا کی تجلی جس مظہر پر عکس ریز ہوتی ہے وہ مظہر اس تجلی کے رنگ میں رنگا جاتا ہے اور وہ مظہر خود صاحب تجلی کے قائم مقام ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس وقت یہ کہنا صحیح ہوتا ہے کہ میں نے خدا تعالیٰ کو دیکھا یا اس کی بات سنی۔

اس کی ایک ناقص مثال یہ ہے کہ آئینہ میں ہم آفتاب کے عکس کو دیکھتے ہیں۔ اب اگر اس عکس میں ہم اتنے منہمک ہو جائیں کہ آئینہ کا تصور ہی ذہن سے محو ہو جائے۔ تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے آفتاب کو دیکھا۔ اس کے خلاف کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ تم نے جو دیکھا ہے وہ آفتاب نہیں۔ یا یہ وہی آفتاب ہے۔ اگر تجلی کی حقیقت سمجھ میں آ جائے تو کلام اللہ بیت اللہ اور رسول اللہ کا مفہوم بھی واضح ہو جاتا ہے اور مامون الرشید کے زمانے میں قرآن کے مخلوق اور غیر مخلوق ہونے کا جو نزاع تھا اس کا بھی حل نکل آتا ہے۔

ہماری کائنات آفتاب حقیقت کے لیے ایک آئینہ کے مانند ہے۔ کبھی ہم آئینہ میں آفتاب کے عکس کو آفتاب کہہ لیتے ہیں۔ یہ وحدت الوجود کا عینیت کا تصور ہے اور بعض دفعہ ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ آفتاب عکس ہے اصل آفتاب کا جو بہت دور اور بعید الحصول ہے۔ یہ ہے وحدت الوجود کا وراثیت کا تصور۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ ابن عربی کے ہاں یہ دونوں تصورات موجود ہیں اور یہ دونوں اپنی اپنی جگہ ٹھیک ہیں۔

تجلی کی ماہیت سمجھے بغیر ذات احدیت کا کائنات سے جو تعلق ہے اس کا ادراک نہیں ہو سکتا جس طرح ایک آئینہ پر آفتاب کی تجلی پڑتی ہے اسی طرح جب انبیاء کا دل خدا کی تجلی کا مقام بن جاتا ہے تو اس وقت مولانا روم کے قول کے مطابق

گفتہ او گفتہ اللہ بود - گر چہ از حلقوم عبد اللہ بود

کوہ طور پر خدا کی تجلی نازل ہوئی تو موسیٰ کو "انارٹک" کی آواز آئی۔ یہ آواز طور کی نہ تھی بلکہ خدا کی تھی۔ کائنات کو عین ذات ماننے والے کائنات کو تجلی الہی کا مصداق سمجھ لیتے ہیں لیکن صحیح ادراک رکھنے والے اس کائنات کو آئینہ سمجھتے ہیں۔ اسے اصل حقیقت نہیں مانتے۔

وحدت الوجود اور وحدت الشہود کی اس طرح تشریح کر کے شاہ صاحب نے دراصل آریائی اور سامی دونوں ذہنیوں کو ایک نقطہ خیال پر جمع کر دیا ہے۔ سامی ذہن خدا کو منزہ اور متجدد مانتا ہے اور آریائی ذہن نے ہمیشہ خدا کا جلوہ کسی ٹھوس وجود میں دیکھا۔ یہودیوں اور عربوں کے ہاں خدا کا تصور

ماورائے کائنات ہے۔ حضرت عیسیٰ کا بھی یہی تصور تھا۔ لیکن ان کے نقیبوں نے یونانی ذہن کی رعایت سے اسے آریائی رنگ دے دیا۔ سامیوں کے پیغمبر خدائی پیغام کے ترجمان ہونے کے باوجود انسان ہی رہتے ہیں لیکن آریوں کے ہاں جو ذات پیغام کی حامل بنتی ہے وہ خود پیغام بھیجنے والے کی مظہر ہو جاتی ہے۔ سامی بندے کو خدا کی طرف لے جاتا ہے اور آریائی خدا کو بندہ کی طرف کھینچ لیتا ہے۔ چنانچہ ایک میں خالص توحید ہے اور ایک اجسام اور مظاہر میں خدا کو پاتا ہے۔

مسیحیہ کی تبدیلی سے فرد یا جماعت کی ذہنیت تو نہیں بدلا کرتی۔ ایرانی اور ہندوستانی مسلمان ہوئے تو انہوں نے پیروں اور پیغمبروں کو وہ درجہ دے دیا جو قبل از اسلام وہ اپنے بزرگوں کو دیتے تھے۔ گو وہ اب اپنے پیر کو خدا تو نہیں سمجھتے تھے لیکن اس خدا تک پہنچنے کا ذریعہ ضرور جانتے تھے۔ اس لیے پیر کا حکم خدا کا حکم سمجھا جاتا۔ تصوف کی کتابیں اور بڑے بڑے صوفیاء کا کلام اس قسم کی مثالوں سے بھرا پڑا ہے۔

شاہ صاحب نے تجلی کا مسئلہ پیش کر کے ایک طرف تو آریں فلاسفی (حکمت) اور سامی نبوت میں اس اختلاف کو رفع کر دیا۔ اور دوسری طرف اس سے معرفت رکھنے والے مسلمانوں کے لیے غیر مسلموں پر اسلام کی حقانیت ثابت کرنا آسان ہو گیا۔

(شاہ صاحب کا دوسرا کمال یہ ہے کہ انہوں نے شریعت اور طریقت میں جو تضاد اور معارضت پیدا ہو گئی تھی وہ دور کر دی۔ موصوف خود بڑے محدث تھے۔ فقہ میں ان کا درجہ ایک مجتہد کا ہے۔ اور فقہ اور حدیث میں آپ نے جو کتابیں لکھی ہیں دنیائے اسلام میں ان کی نظیر نہیں مل سکتی۔ اس کے بعد علوم عقلیہ میں شاہ صاحب کا پایہ کسی سے کم نہیں۔ لیکن اتنی حدیث جاننے اور فقہ میں اتنا درک رکھنے اور منطق و فلسفہ میں اس قدر تبحر کے باوجود آپ عارف تھے اور عارف بھی ایسے جو تصوف کے علوم میں بھی کامل ہوں اور جذب و سلوک میں بھی راسخ۔ چنانچہ فقہ اور حدیث کو آپ نے ایک عارف کی نظر سے دیکھا۔ اور تصوف اور سلوک کو ایک محدث اور فقیہ کے معیار سے پرکھا۔ چنانچہ اپنے اس رجحان کو وہ ان الفاظ میں پیش فرماتے ہیں:

”وہ ہمارے گروہ میں سے نہیں جس نے کتاب اللہ پر غور نہ کیا ہو۔ یا نبی کریم کی حدیث میں فہم و بصیرت حاصل نہ کی ہو۔ وہ ہم میں سے نہیں۔ جس نے ایسے علماء کی صحبت ترک کر دی ہو جو صوفیاء ہیں اور انہیں کتاب و سنت میں درک ہے۔ یا ایسے اصحاب علم سے کنارہ کش ہو گیا ہو جو تصوف میں بہرہ رکھتے ہیں یا ان محدثین سے جو فقہ سے بھی واقف ہوں اور ان فقہاء سے جو حدیث بھی جانتے

ہوں۔ ان کے علاوہ جو جاہل صوفی اور تصوف کا انکار کرنے والے ہیں یہ دونوں کے دونوں چور اور ہرن ہیں۔ ان سے تمہیں بچنا چاہیے۔“

شاہ ولی اللہ کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے اپنے وسیع ہمہ گیر اور کل انسانیت پر جامع فکر کو شریعت رسولؐ سے مطابق کرنے کے بعد پر خاص طور پر زور دیا۔ یہاں عمل سے مراد محض عبادات نہیں بلکہ عبادات کے ساتھ ساتھ وہ عمل جو تدبیر خانہ داری، انتظام اجتماع، سیاست مدنیہ اور معاملات قومی میں بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ شاہ صاحب کے والد محترم شاہ عبدالرحیم صاحب نے اپنے عالی مقام صاحب زادے کی تعلیم و تربیت میں بھی عمل کی اس نوعیت کو جسے وہ حکمت عملی کہتے ہیں خاص طور پر ملحوظ رکھا۔ اس ضمن میں مولانا لکھتے ہیں:

”شاہ عبدالرحیم نے شاہ ولی اللہ کو حکمت عملی سکھانے میں خصوصی توجہ برتی۔ شاہ صاحب نے اس کا ذکر ”انفاس العارفین“ اور ”جزولطیف“ میں کیا ہے۔ عام متکلمین نے ارسطو کی حکمت نظریہ کو اپنا مطمح نظر بنا لیا۔ اور حکمت عملیہ سے سروکار نہ رکھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فقہاء اور متکلمین قومی زندگی کی ضرورتوں کے متعلق غور اور تدبیر کرنے سے محروم ہو گئے۔ شاہ صاحب نے اپنے والد محترم سے اس فن کی خاص طور پر تحصیل کی۔ چنانچہ آپ نے حجتہ اللہ البالغہ میں ارتقاات کے عنوان سے حکمت عملی پر بہت کچھ لکھا ہے۔“

شاہ صاحب کی کتابوں کو اگر غور سے پڑھا جائے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ ان کی طریقت اور شریعت کا حاصل مدعا یہ ہے کہ انسان پہلے اپنے نفس کی اصلاح کرے۔ نفس کی اصلاح کرنے کے بعد گھر کے نظام کو ٹھیک طرح چلائے۔ گھر سے محلہ کی طرف توجہ کرے۔ محلہ سے شہر کی طرف، شہر سے مملکت اور عام انسانیت کی طرف متوجہ ہو یہی وجہ ہے کہ وہ معاشی مساوات پر سب سے زیادہ زور دیتے ہیں اور اسی پر اخلاق کی بھی بنیاد رکھتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری تاریخ میں تصوف کی ابتداء اس کے عملی رجحان سے ہوئی تھی۔ پھر جذب و کیفیت اور تصوف کے علم و تدوین کا زمانہ آیا۔ بعد ازاں اندھی عقیدت اور بے عملی کا غلبہ ہوا۔ اب شاہ صاحب کی ذات سے تصوف کے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ صاحب تصوف متقن ہے۔ دین کی تاریخ کا شارح ہے اور پھر جماعت، قوم اور مملکت کی سیاست میں بھی ان کی رہنمائی کرتا ہے۔ قومی ضرورتوں کی طرف ان کی توجہ منعطف کراتا ہے۔ اور جب دوسروں کے ہاتھوں سیاسی امور ٹھیک طرح حل ہوتے نہیں دیکھتا، تو خود اپنی جماعت بناتا ہے۔ چنانچہ اس کی ذات ایک سیاسی تحریک اور فعال سیاسی جماعت کا منبع بنتی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائے اسلام سے جو سلسلہ شروع ہوا تھا اس کا ایک دور ختم ہو گیا ہے اور اب اسلامی تاریخ میں ایک نئے زمانے کا ظہور

ہوتا ہے۔ جس میں پھر نئے سرے سے عمل کو تقدیم اور ترجیح حاصل ہوگی۔ اسلامی ہندوستان میں شاہ صاحب اس دور عمل کے فاتح اور مفکر ہیں۔

یہ بحث نامکمل رہ جائے گی اگر ہم یہاں سراج احمد حسین مصنف ”فلسفہ فقرا“ کے ان افکار کا ایک اقتباس نہ دیں جو موصوف نے شاہ صاحب کے متعلق حیدرآباد کے انگریزی رسالہ ”اسلامک کلچر“ میں ایک مضمون کے سلسلہ میں ظاہر کئے تھے۔ سراج احمد حسین خود صوفی ہیں اور علمی اور عملی تصوف کے علاوہ یورپ کے موجودہ علوم میں بھی بڑا درک رکھتے ہیں..... شاہ صاحب کا ذکر کرتے ہوئے آپ لکھتے ہیں۔

”صاف ظاہر ہے کہ ابن عربی نے علم کے ذریعہ حقیقت کی گتھی کو سلجھانا چاہا تھا۔ چونکہ علم کثرت کو ہمیشہ وحدت کے ذیل میں جمع کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ قدرتی طور پر ابن عربی اس نتیجہ پر پہنچے کہ مظاہر کی یہ قلمونی ایک ہی وجود کا حاصل ہے اور ان سب کی اصل ایک ہی وجود ہے۔ یہ ہے ہمہ اوست یا وحدت الوجود کا تصور توحید۔ اس کے برعکس مجدد الف ثانی نے عشق و محبت کی مدد سے اس عقدہ کو حل کرنا چاہا۔ چونکہ عشق و محبت کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ ایک چاہنے والا ہو اور ایک وہ جس کو چاہا جائے۔ اور لازمی ہے کہ دونوں الگ الگ ہوں۔ کیونکہ اگر وہ ایک ہو جائیں تو محبت کا جوش و خروش نہیں ہو سکتا۔ یہی رجحان اس خیال کا باعث ہوا کہ اللہ اللہ ہے اور بندہ بندہ۔ ایک خالق و مختار اور دوسرا مخلوق و نیازمند۔ ایک مستغنی اور دوسرا محتاج۔ دونوں نہ کبھی ایک تھے اور نہ کبھی ایک ہوں گے۔ یہ ہے ہمہ از دست یا وحدت الشہود کا عقیدہ۔ یعنی خدا تعالیٰ کا پرے پرے سے پرے اور پرے سے پرے ہونا۔ لیکن حقیقت کے جو یا افراد کا ایک اور گروہ بھی ہے جن کی قیادت کا فخر شاہ ولی اللہ دہلوی کو حاصل ہے۔ ان کے نزدیک ہمہ اوست یعنی وحدت الوجود اور ہمہ زاوست یعنی وحدت الشہود میں کوئی فرق نہیں۔ یہ لوگ عمل اور خدمت کے ذریعہ جو حقیقت کے حرم ناز میں بار پانے کا تیسرا راستہ ہے خدا تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ محبت ہمیشہ ہم جنسوں میں ہی ہوتی ہے اس لیے یہ کائنات کو اصل وجود سے نکلا ہوا مانتے ہیں۔ بے شک ان کے نزدیک خدا ایک ہے۔ وہ بے مثال ہے۔ فہم و اوراک سے بالاتر ہے۔ لیکن اس کائنات کا اسی سے صدور ہوا ہو رہا ہے اور برابر ہوتا رہے گا۔ یہ کہتے ہیں کہ خدا اور کائنات کا باہمی تعلق ایسا ہے۔ جسے جسم اور روح کا ہوتا ہے۔ یا زمان و مکان کا۔ بظاہر دیکھنے میں الگ الگ لیکن حقیقت میں ایک۔“

سراج احمد حسین لکھتے ہیں کہ شاہ صاحب کا تصور کائنات کہ اصل وجود سے ہر لمحہ نمو حرکت اور ارتقاء کا عمل سرزد ہوتا رہتا ہے یورپ کے مشہور ترین فلسفی ہنری برگسان سے بہت کچھ ملتا ہے۔

اس سے پہلے بتایا جا چکا ہے کہ حقیقت تک پہنچنے کے تین راستے ہیں۔ علم و عقل جذب و محبت اور عمل۔

بے شک دونوں کے پیرایہ بیان میں فرق ہے۔ سر موصوف فرماتے ہیں کہ ضرورت ہے تصوف کے ان حقائق کو جن کی تصدیق اب یورپ کا علم اور فلسفہ کر رہے ہیں اصطلاحات اور الفاظ کے ان گورکھ دھندوں سے نکالا جائے بے شک متصوفانہ اصطلاحات میں تو ان حقائق کو سمجھنا بڑا مشکل ہے۔ لیکن شعرائے متصوفین نے ان مسائل کو آسان بنانے کی بڑی کوشش کی ہے۔

خدا اور کائنات کا تعلق روح اور بدن کا ہے۔ اس مطلب کو مندرجہ ذیل اشعار میں کس خوبی سے ادا کیا ہے۔

حق جان جہاں است و جہاں جملہ بدن اوراح و ملائکہ حواس این تن
افلاک عناصر و موالید اعضاء توحید ہمیں است و دیگر شیوہ و فن
وجود سے ہر لمحہ نمو حرکت اور ارتقاء کا عمل سرزد ہوتا ہے۔ کائنات کی ہر چیز جلد سے جلد بدلتی رہتی ہے۔ کسی کوشش یا دوام نہیں۔

بحریت نہ کاہندہ نہ افزائندہ امواج بر آورندہ و آئندہ
عالم چو عبارت از ہمیں امواج است نبود دور زماں بلکہ دواں پائندہ
بد قسمتی سے صوفیاء ہمیشہ استعاروں، کنایوں، اشارات اور خوابوں کی صورت میں اپنی بات کہتے رہے۔ ایک ان کی بات سمجھتا تو بہتیرے گمراہ ہوتے۔ تصوف سے اصل مقصود تو تھا دلوں کی پاکی اور عمل میں خلوص۔ لیکن اس ابہام اور اشتباہ سے نتیجہ یہ نکلا کہ عوام تو ہمت کے شکار ہو کر انسانیت کی سطح سے گر گئے۔ صوفیاء ایک لحاظ سے مجبور بھی تھے صاف صاف کھلے بندوں کہتے تو جان بچانی مشکل ہو جاتی۔ زمانہ استبداد کا تھا۔ بادشاہ کی مرضی حکومت کا قانون تھا۔ علماء اور قاضی اس قانون کے محافظ تھے۔ اور صوفیاء اور علماء کی تو آپس میں کشمکش رہتی ہی تھی۔

ضرورت ہے کہ تصوف کے حقائق کو جو ہمارے بزرگ پیچیدہ اصطلاحات میں کہنے کے عادی تھے اب انہیں موجودہ زمانے کے طرز میں اور آج کل کی زبان میں بیان کیا جائے۔ اور ہم علم و معرفت کے اس عظیم الشان ذخیرہ کا عملی نقطہ نظر سے جائزہ لیں۔ ناظرین کو تعجب ہوگا کہ نفس انسانی اس کی جہلی خواہشات اور اس کے رجحانات زندگی کی ابتداء حرکت نمو اور ارتقاء کائنات کے تصور زمان و مکان کے نظریے تصفیہ نفس اور وجدان اور عقل کی ترقی کے سلسلہ میں ہمارے صوفیاء جو کچھ کہتے چلے آئے ہیں آج کی سائنس اور علم اپنی نئی تحقیقات میں ان سے متفق ہیں۔

ہمارا یہ تصوف آج ہمارے عمل کی بنیاد ہو سکتا ہے۔ یہ تصوف اب محض وہمی اور خیالی نہیں رہا۔

تصوف اسلام کی حیثیت ایک سائنس کی سی ہو سکتی ہے لیکن ضرورت ایسے اہل علم کی ہے جو اپنے تصوف

سے بھی آگاہ ہوں اور نئے علوم اور سائنس میں بھی انہیں درک ہو۔ اور وہ تصوف کے ان حقائق کو سائنٹفک زبان میں ادا کر سکیں۔

جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے شاہ ولی اللہ اس تصوف کے ارتقاء کی آخری کڑی ہیں۔ وہ سب سے بعد میں آئے اس لیے وہ سب کے کمالات کے جامع ہیں۔ انہوں نے جس طرح دینی علوم کا احصاء کر کے ان کو ترتیب دی۔ ہر علم کو اس کے موزوں مقام پر رکھا۔ ایک علم کا دوسرے علم سے توافقی پیدا کیا اور ان میں نزاع اور تناقض دور کر دیا۔ اسی طرح آپ نے تصوف اسلام کے سب حقائق کا احاطہ کیا۔ انہیں جانچا پرکھا۔ حشو و زوائد کو پاک کیا۔ اور تصوف کو ایک مرتب علم اور باقاعدہ فن کی صورت میں مدون کر دیا۔ ایسا علم و فن جو دوسرے علوم و فنون سے ہم نوا اور ہم آہنگ بھی ہو۔ اور سب سے زیادہ یہ کہ وہ زندگی اور عمل کے لیے مفید اور کارآمد اساس بھی بن سکے۔

مولانا کے الفاظ میں شاہ صاحب نے ان حقائق کو واضح اور صاف پیرایہ میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ البتہ کہیں کہیں اسلوب قدیم ہے۔ یعنی وہ ان حقائق کو اپنے زمانہ کے مسلمات میں جن کو اُس وقت کی علمی دنیا مانتی تھی ادا کرتے ہیں۔ مثلاً فلکیات کے مسئلے ارسطو کے اقوال اور اس قسم کی دوسری چیزیں۔ حقیقت شناس چاہیں تو ان تعبیرات کے اندر شاہ صاحب کے بیان کردہ حقائق کو ذرا سی کاوش سے معلوم کر سکتے ہیں۔

ان تمام تفصیلات کے بعد ناظرین باسانی سمجھ سکتے ہیں کہ کس طرح مولانا کے نزدیک ”یورپین ازم“ یعنی یورپ کی مادی ترقی اور معاشی تنظیم اور فلسفہ ولی اللہی کو بیک وقت قبول کرنے سے ہندوستانی مسلمان اپنی دنیا بہتر کر سکتے ہیں۔ اور اپنے دین کو بھی بچا سکتے ہیں۔ وہ یورپ کی معاشی اور مادی تنظیم قبول نہ کریں گے تو ”حسنتہ فی الدنیا“ سے محروم ہو جائیں گے اور فلسفہ ولی اللہی ساتھ نہ ہوگا تو ”حسنتہ فی الآخرة“ کا حصول ممکن نہیں۔ اسلام نہ محض ”حسنتہ فی الدنیا“ ہے اور نہ صرف ”حسنتہ فی الآخرة“ وہ دونوں کا جامع ہے۔ یہ ہے مولانا عبید اللہ صاحب کی دعوت۔

یورپ کی مادی ترقی اور معاشی تنظیم کا مفید اور کارآمد ہونا تو اب کسی دلیل کا محتاج نہیں رہا۔ اس مادی ترقی کے طفیل افرنگ کا ہر فریہ فردوس کے مانند بن گیا ہے۔ قدرت کے سارے دینے انسان کی دسترس میں آگئے ہیں۔ اور خشکی تری اور ہوا پر اس کا سکہ رواں ہے۔ معاشی تنظیم کے سلسلہ میں بہت کچھ ہو چکا ہے اور بہت کچھ اس جنگ کے بعد لازمی طور پر ہوگا۔ مادی ترقی نے فراوانی بہم کر دی۔ اب معاشی تنظیم اس فراوانی کو سب کے لیے عام کرنے میں لگی ہوئی ہے۔

باقی رہا فلسفہ ولی اللہی۔ جہاں تک اس کے مبادی اور اصولوں کا تعلق ہے یورپ کے بڑے

بڑے اہل فکر و علم اور سائنس دانوں کے انکشافات ان کی تائید کرتے ہیں اور نفس انسانی کائنات اور زندگی کے متعلق جو فلسفہ ولی اللہی کے نظریات ہیں کم و بیش وہی نظریے آج علمی دنیا میں تسلیم کیے جاتے ہیں اور خاص بات یہ ہے کہ یہ فلسفہ ولی اللہی اسلام سے پوری مطابقت رکھتا ہے اور اس کے ثبوت شاہ صاحب کی اپنی عظیم المرتبت اور جامع علم و فضل شخصیت ہے۔

کے دن گزار چکا ہوتا ہے، ٹھکانے لگاتی ہے۔ حکمرانوں کو یہ تیج کرتی ہے۔ ملک کے انتظام کے نقشے بدل ڈالتی ہے۔ اب نئے طبقے پیدا ہوتے ہیں اور فروغ پاتے ہیں۔ نیا تمدن بنتا ہے۔ اجتماع معیشت اور سیاست کے نئے اصول وضع ہوتے ہیں۔

شاہ ولی اللہ قوموں کے عروج و زوال کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جب کسی قوم کے کمانے والے طبقوں کی کمائی پر نہ کمانے والے طبقے قبضہ کر لیں یا ان کی کمائی کا بڑا حصہ خود ہتھیالیں تو یہ حالت انقلاب کی پیش خیمہ ہوتی ہے۔ ایک گروہ تو انقلاب کا علمبردار بن کر آگے بڑھتا ہے۔ دوسرا گروہ جو تعداد میں بہت بڑا ہوتا ہے، انقلاب کا ہمدرد بن جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان ہمدردوں کے اخلاق و اطوار کا اثر انقلاب کے مظاہر پر پڑتا ہے لیکن اس کا تعلق صرف ظاہری شکل سے ہوتا ہے۔ اصل میں انقلاب کی روح کا ترجمان پہلا ہی طبقہ ہوتا ہے۔ رسول اکرمؐ کے صحابہ سابقین اولین اسلام کی انقلابی روح کے ترجمان حقیقی تھے۔ عربوں کی تقریباً ساری کی ساری آبادی اس تحریک کی ہمدرد بن کر شریک ہوئی اور انہوں نے اسلام کی ظاہری شکل و صورت کو اپنے رنگ میں رنگا بھی۔ لیکن جہاں تک تعلیمات اسلام کا جوہر اصلی ہے۔ کیونکہ رسول اللہؐ کا اسوہ اور آپؐ کے قریب ترین صحابہ کا عمل ہے۔ کیونکہ حقیقت میں اس عالمگیر انقلاب کی روح رواں یہی پاک ہستیاں تھیں۔

انقلاب کے لیے بڑی تیاری کی ضرورت ہے۔ انقلابی جماعت کو پہلے اپنے فکر کی تہذیب اور اس کا استحکام کرنا پڑتا ہے۔ تاکہ انقلابی فکر ان کے ذہن میں راسخ ہو جائے اور انقلابی عمل کے لیے ان کی تربیت بھی مکمل ہو۔ رسول اکرمؐ نے پورے تیرہ برس مکہ میں اس فکر کی تبلیغ کی۔ اور جو اس فکر کو دل و جان سے مان گئے تھے ان کی جماعت بندی کی۔ پھر اس جماعت کی تنظیم اور تربیت میں شب و روز منہمک رہے اور آخر میں آپؐ نے دیکھا کہ مکہ کی فضا ناسازگار ہے اور یہاں اس نئی جماعت کو اپنی مستقل سیاسی تشکیل میں دقتیں ہیں تو آپؐ نے ہجرت فرمائی اور مدینہ کو اپنا نیا انقلابی مرکز بنایا۔

قریش کی انقلابی جماعت رسول اللہؐ کی تعلیمات کے اثر سے خود اپنوں کو جو گو ان کے بھائی بناد اور سگے عزیز تھے لیکن وہ نئے انقلاب کی راہ میں حائل تھے، قتل نہ کرتی تو اسلام کبھی یہ حیثیت اختیار نہ کرتا اور نہ یہ ساری دنیا کو اپنا پیغام سنا سکتا۔ ضرورت ہے کہ آج مسلمان اپنے پیغمبر کے اس اسوہ حسنہ کی اہمیت کو سمجھیں اور اپنی قوم کے ان طبقوں کو جو جو تک کی طرح قوم کے خون کو پی رہے ہیں، مردود قرار دیں۔ یہ لوگ خواہ ہمارے اپنے جگر کے ٹکڑے ہوں یا ہمارے بزرگ، ان کا وجود ساری قوم کے لیے وبال بن رہا ہے۔ ہمارے یہ مفاد پرست طبقے جس کھوکھلے تمدن کو تھامے ہوئے ہیں، وہ انسانیت کے لیے ایک روگ ہے۔ ہماری قوم کے نوجوان انقلابی گروہ کا فرض ہے کہ وہ ان کے تسلط سے قوم کے عوام

نظریہ تمدن

مولانا کے نزدیک تمدن انسان کا فطری تقاضا ہے۔ اس کی سوتیں خود انسان کے اندر سے پھوٹی ہیں۔ تمدن کی تشکیل کے لیے انسان کسی باہر کی مدد کا محتاج نہیں۔ ایک جزیرے میں اگر ایک مرد اور عورت اکیلے چھوڑ دیئے جائیں تو وہ اپنی طبیعت کے تقاضے سے خود تمدن کی عمارت کھڑی کر لیں گے۔ یہ تمدن اس وقت تک اچھا رہتا ہے جب تک یہ انسانوں کی اجتماعی اور حیاتی ضروریات پورا کرتا ہے۔ لیکن جب کسی قوم میں انسانوں کا ایک مخصوص طبقہ تو تمدنی لحاظ سے بہت آگے بڑھ جائے اور دوسرے لوگ جو تعداد میں بہت زیادہ ہوں، پیچھے رہ جائیں تو پھر اس تمدن کو گھن لگ جاتا ہے اور قدرت یا زمانے کا یہ تقاضا ہوتا ہے کہ اس تمدن کو جو فرسودہ ہو گیا ہے، برباد کر دیا جائے۔ قوم کے ایک محدود طبقے کی اس طرح غیر فطری ترقی کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ لاکھوں اور کروڑوں انسان تو معمولی معاش کی ضروریات کرتے ہیں اور چند ایک کے پاس بہت دولت جمع ہو جاتی ہے۔ ان حالات میں قوم کو روگ لگ جاتا ہے۔ افراد کی صلاحیتیں بے کار ہو جاتی ہیں۔ عیش پرستی عام طور پر پھیلنے لگتی ہے۔ عمومی مفاد کا کسی کو خیال نہیں رہتا۔ نفسی نفسی کا معاملہ ہوتا ہے۔ ہر شخص کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ اپنا پیٹ بھرے۔ اپنی خواہشات کو پورا کرے۔ خواہ ہمسایہ فاقوں کے مارے مرتا مر جائے۔ جب کوئی قوم ادبار کے اس نرغے میں گرفتار ہو جاتی ہے تو پھر انقلاب کا آنا ایک حتمی امر ہوتا ہے۔

اگر قوم کے سارے طبقے اس روگ کی وجہ سے مفلوج نہ ہو گئے ہوں۔ اور قوم کے جسم عمومی میں زندگی کا گرم خون موجود نہ ہو تو زوال آمادہ طبقے کی جگہ لینے کے لیے قوم کا دوسرا طبقہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ وہ پہلوں کو زبردستی یا صلح و صفائی سے بساط سیاست سے الگ کرتا ہے اور خود قوم کی عنان اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے۔ یہ طبقہ اپنا نیا تمدن بناتا ہے اور پہلا تمدن پھٹے ہوئے لباس کی طرح ناقابل استعمال قرار پاتا ہے۔ فرانس کا انقلاب، انگلستان کی جمہوری حکومت کا ارتقاء، جرمنی روس اور ترکی کا انقلاب یہ سب اسی قسم کی اندورنی کش مکش کا نمونہ ہیں۔ لیکن اگر زوال کے جراثیم قوم کے سارے جسم میں اپنا کام کر چکے ہیں۔ کسی طبقے میں بھی اتنی جان نہ ہو کہ وہ قوم کی کشتی کا کھیون ہار ہو سکے اور زمانے کے ریلے کا مقابلہ کرنے کی ہمت رکھے۔ تو باہر سے کوئی دوسری قوم چڑھ آتی ہے۔ وہ بے جان تمدن کو جو اپنی زندگی

کو رہائی دلوائے۔ جب تک یہ نہ ہوگا ہماری قوم کی زبوں حالی ختم نہیں ہونے کی۔

یہ بات بالکل صاف اور واضح ہے۔ فرض کیجئے ایک گھر میں کمانے والے کم ہوں اور کھانے والے زیادہ۔ وہ گھر ضرور تباہ ہو جائے گا۔ اسی طرح جس تمدن میں کمانے والے کم ہوں اور کھانے والے زیادہ وہ تمدن فاسد ہو جاتا ہے۔ ہر انسان کو بغیر کسی معقول عذر کے اپنی روزی خود کمائی چاہئے۔ دوسروں کی محنت پر جینا جینا نہیں بلکہ کھڑے اڑانا یہ زوال کا راستہ ہے۔ اسی طرح اگر کمانے والے تو محنت سے کمائیں، لیکن ایک شخص یا چند اشخاص جن کے ہاتھ میں انتظام ہو وہ ان کمانے والوں کی کمائی کا بڑا حصہ اپنے انتظام کے عوض مار لیں۔ تو ایسا تمدن بہت دنوں نہیں جی سکتا اور انسانیت کو اس سے کبھی فلاح نہیں ملتی۔

انسانیت کی تباہی اور زبوں حالی کا اکثر یہ سبب ہوتا ہے کہ عام جمہور کو کھانے کو کچھ نہیں ملتا۔ وہ فاتے پر مجبور ہوتے ہیں اور اس طرح انہیں محتاج رکھ کر ان کو معاشی اور اخلاقی حیثیت سے تباہ کیا جاتا ہے۔ معاشی تباہ حالی سے یہ بھی ہوتا ہے کہ خالی پیٹ کو بھرنے کی فکر میں انسانوں کو کسی اور چیز کی سدھ بدھ نہیں رہتی۔ انسانی زندگی کی جو اعلیٰ ضرورتیں ہیں وہ سب بہم نہیں پہنچتیں اور اس طرح انسانیت ٹھٹھر کر رہ جاتی ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ انسانیت کے اعلیٰ تقاضے بہت حد تک معاشی اسباب و حالات سے متاثر ہوتے ہیں۔ مولانا نے ایک دفعہ فرمایا کہ بے شک ہم معاشی مرفہ الحالی کے سلسلے میں تو اشتراکیت کے اصولوں سے بالکل متفق ہیں اور ہم چاہتے ہیں کہ انسان کی کل معاشی ضروریات کو زیادہ سے زیادہ اہمیت دی جائے لیکن ساتھ ہی انسانیت کے اس رخ کو بھی جو اخلاق اور فکر کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے، تشنہ نہ چھوڑا جائے۔

اخلاق اور فکر کے بغیر کوئی تمدن پائیدار نہیں ہوتا۔ چنانچہ سرمایہ داروں پر جہاں یہ الزام ہے کہ انہوں نے انسانیت کے بہت بڑے حصے کو محتاج رکھ کر انہیں انسانیت کی سطح سے نیچے گرا دیا۔ ان پر دوسرا الزام یہ بھی ہے کہ اس بڑے حصے میں سے ایک گروہ ایسا بھی تھا جو انسانی اخلاق اور فکر کو اپنی صلاحیتوں سے بڑی ترقی بخش سکتا تھا لیکن سرمایہ داروں نے اسے روٹی کا محتاج بنا کر اس سے محروم کر دیا۔ چنانچہ ان کی وجہ سے انسانیت کی ترقی مجموعی طور پر رک گئی۔

جب کسی وجہ سے قوم کا ذہن طبقہ جو اخلاق اور افکار کا مالک ہوتا ہے اپنے فرض منصبی سے غفلت برتتا ہے تو اس کی یہ صلاحیتیں ذلیل کاموں میں صرف ہونے لگتی ہیں۔ ان کی ذلت کا پہلا قدم تعلق ہے یعنی حکمران طبقے کی خوشامد کر کے ان سے زیادہ سے زیادہ وصول کرنے کی کوشش۔ اور یہی

مرض ہے جو آگے چل کر ان کو غیر اللہ کی عبادت کا داعی بنا دیتا ہے یہی جذبہ بت پرستی سکھاتا ہے۔ اس منزل میں انسانیت کے اعلیٰ خصائل سارے تباہ ہو جاتے ہیں اور انسانیت فاسد ہو جاتی ہے۔ اس طرح منہ شدہ انسانیت کے برباد کرنے کے لیے قدرتی اسباب پیدا ہو جاتے ہیں پھر اس برباد شدہ انسانیت کے کھنڈرات پر صالح انسانوں کی آبادی بستی ہے۔

اس زوال آمادہ اور فرسودہ تمدن کی تباہی کے لیے انسانوں کا ایک نیا گروہ اٹھتا ہے۔ قدرتی اسباب ان کے موید ہوتے ہیں۔ اس گروہ کی قیادت ایک شخص کو ملتی ہے جو انقلاب کا امام ہوتا ہے۔

ان ائمہ انقلاب کا ایک اونچا درجہ ہے جنہیں انبیاء کا نام دیا جاتا ہے۔ انبیاء کے لائے ہوئے نظام میں انسانی فطرت کی زیادہ رعایت ہوتی ہے اس لیے یہ نظام دیر تک قائم رہتا ہے۔

قرآن مجید میں انبیاء کے جس قدر قصے ہیں وہ اسی انقلاب کا نمونہ پیش کرتے ہیں جو رسول اکرم کے مبارک ہاتھوں سے ہونے والا تھا۔ رسول اللہ انسانیت کے عالمگیر انقلاب کے داعی تھے۔ آپ کے اصحاب خلافت راشدہ کے دور میں اس کو ایک درجہ تک عالمگیر بنا دیتے ہیں۔ یعنی اس انقلابی حکومت کا دائرہ اتنا وسیع کر دیتے ہیں کہ دنیا کی ساری رجعت پسند حکومتیں جمع ہو کر بھی اس انقلابی حکومت کے مقابلہ میں نہیں ٹھہر سکتیں۔ مولانا فرماتے ہیں۔ قرآن کا یہ انقلاب ختم نہیں ہوا بلکہ یہ ہمیشہ برسرِ پرکار رہے گا۔ کیونکہ کوئی زمانہ ایسا نہیں آ سکتا جس میں رجعت پسندی کی طاقتیں بالکل معدوم ہو جائیں۔ اگر اقدام پسندی اور رجعت پسندی کی یہ کش مکش نہ رہے تو پھر انسانیت کا بھی خاتمہ ہے۔

شاہ ولی اللہ صاحب کی کتابوں میں ان نظریات کا بار بار ذکر ہے۔ آپ نے اپنے زمانے کی گری ہوئی سوسائٹی کی طرف خاص طور پر توجہ دلائی ہے اور بتایا ہے کہ قوم کی نجات اس فرسودہ نظام کو توڑنے بغیر کسی طرح ممکن نہیں۔ حجۃ اللہ البالغہ کی دوسری جلد صفحہ ۱۰۵ میں فرماتے ہیں:

”دس ہزار آدمیوں کی ایک بستی ہے۔ اگر اس کا اکثر حصہ نئی چیزیں پیدا کرنے میں مصروف نہیں رہتا تو وہ ہلاک ہو جائے گی۔ ایسے ہی اگر ان کا بڑا حصہ قعیش میں مبتلا ہو گیا تو وہ قوم کے لیے بار بن جائے گا۔ جس کا ضرر بتدریج ساری آبادی میں پھیل جائے گا۔ اور ان کی حالت ایسی ہو جائے گی جیسے انہیں دیوانے کتے نے کاٹ کھایا۔“

اسی کتاب کی پہلی جلد میں صفحہ ۳۵ پر مذکور ہے:-

”اس زمانہ میں اکثر بلاد کی بربادی کا سبب دو چیزیں ہیں۔ ایک تو سرکاری خزانہ سے بناوٹی حقوق کا نام لے کر لوگ روپیہ وصول کرتے ہیں، جس نام سے وہ روپیہ لیتے ہیں اس کے حق کو وہ کسی

کو رہائی دلوائے۔ جب تک یہ نہ ہوگا ہماری قوم کی زبوں حالی ختم نہیں ہونے کی۔

یہ بات بالکل صاف اور واضح ہے۔ فرض کیجئے ایک گھر میں کمانے والے کم ہوں اور کھانے والے زیادہ۔ وہ گھر ضرور تباہ ہو جائے گا۔ اسی طرح جس تمدن میں کمانے والے کم ہوں اور کھانے والے زیادہ وہ تمدن فاسد ہو جاتا ہے۔ ہر انسان کو بغیر کسی معقول عذر کے اپنی روزی خود کمائی چاہئے۔ دوسروں کی محنت پر جینا، جینا نہیں بلکہ چھوڑے اڑانا یہ زوال کا راستہ ہے۔ اسی طرح اگر کمانے والے تو محنت سے کمائیں، لیکن ایک شخص یا چند اشخاص جن کے ہاتھ میں انتظام ہو وہ ان کمانے والوں کی کمائی کا بڑا حصہ اپنے انتظام کے عوض مار لیں۔ تو ایسا تمدن بہت دنوں نہیں جی سکتا اور انسانیت کو اس سے کبھی فلاح نہیں ملتی۔

انسانیت کی تباہی اور زبوں حالی کا اکثر یہ سبب ہوتا ہے کہ عام جمہور کو کھانے کو کچھ نہیں ملتا۔ وہ فاقے پر مجبور ہوتے ہیں اور اس طرح انہیں محتاج رکھ کر ان کو معاشی اور اخلاقی حیثیت سے تباہ کیا جاتا ہے۔ معاشی تباہ حالی سے یہ بھی ہوتا ہے کہ خالی پیٹ کو بھرنے کی فکر میں انسانوں کو کسی اور چیز کی سدھ بدھ نہیں رہتی۔ انسانی زندگی کی جو اعلیٰ ضرورتیں ہیں وہ سب بہم نہیں پہنچتیں اور اس طرح انسانیت ٹھنڈ کر رہ جاتی ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ انسانیت کے اعلیٰ تقاضے بہت حد تک معاشی اسباب و حالات سے متاثر ہوتے ہیں۔ مولانا نے ایک دفعہ فرمایا کہ بے شک ہم معاشی مرفہ الحالی کے سلسلے میں تو اشتراکیت کے اصولوں سے بالکل متفق ہیں اور ہم چاہتے ہیں کہ انسان کی کل معاشی ضروریات کو زیادہ سے زیادہ اہمیت دی جائے لیکن ساتھ ہی انسانیت کے اس رخ کو بھی جو اخلاق اور فکر کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے، تشنہ چھوڑا جائے۔

اخلاق اور فکر کے بغیر کوئی تمدن پائدار نہیں ہوتا۔ چنانچہ سرمایہ داروں پر جہاں یہ الزام ہے کہ انہوں نے انسانیت کے بہت بڑے حصے کو محتاج رکھ کر انہیں انسانیت کی سطح سے نیچے گرا دیا۔ ان پر دوسرا الزام یہ بھی ہے کہ اس بڑے حصے میں سے ایک گروہ ایسا بھی تھا جو انسانی اخلاق اور فکر کو اپنی صلاحیتوں سے بڑی ترقی بخش سکتا تھا لیکن سرمایہ داروں نے اسے روٹی کا محتاج بنا کر اس سے محروم کر دیا۔ چنانچہ ان کی وجہ سے انسانیت کی ترقی مجموعی طور پر رک گئی۔

جب کسی وجہ سے قوم کا ذہن طبقہ جو اخلاق اور افکار کا مالک ہوتا ہے اپنے فرض منصبی سے غفلت برتتا ہے تو اس کی یہ صلاحیتیں ذلیل کاموں میں صرف ہونے لگتی ہیں۔ ان کی ذلت کا پہلا قدم تملق ہے یعنی حکمران طبقے کی خوشامد کر کے ان سے زیادہ سے زیادہ وصول کرنے کی کوشش۔ اور یہی

مرض ہے جو آگے چل کر ان کو غیر اللہ کی عبادت کا داعی بنا دیتا ہے یہی جذبہ بت پرستی سکھاتا ہے۔ اس منزل میں انسانیت کے اعلیٰ خصائل سارے تباہ ہو جاتے ہیں اور انسانیت فاسد ہو جاتی ہے۔ اس طرح مسخ شدہ انسانیت کے برباد کرنے کے لیے قدرتی اسباب پیدا ہو جاتے ہیں پھر اس برباد شدہ انسانیت کے کھنڈرات پر صالح انسانوں کی آبادی بستی ہے۔

اس زوال آمادہ اور فرسودہ تمدن کی تباہی کے لیے انسانوں کا ایک نیا گروہ اٹھتا ہے۔ قدرتی اسباب ان کے موید ہوتے ہیں۔ اس گروہ کی قیادت ایک شخص کو ملتی ہے جو انقلاب کا امام ہوتا ہے۔

ان ائمہ انقلاب کا ایک اونچا درجہ ہے، جنہیں انبیاء کا نام دیا جاتا ہے۔ انبیاء کے لائے ہوئے نظام میں انسانی فطرت کی زیادہ رعایت ہوتی ہے اس لیے یہ نظام دیر تک قائم رہتا ہے۔

قرآن مجید میں انبیاء کے جس قدر قصے ہیں وہ اسی انقلاب کا نمونہ پیش کرتے ہیں جو رسول اکرم کے مبارک ہاتھوں سے ہونے والا تھا۔ رسول اللہ انسانیت کے عالمگیر انقلاب کے داعی تھے۔ آپ کے اصحاب خلافت راشدہ کے دور میں اس کو ایک درجہ تک عالمگیر بنا دیتے ہیں۔ یعنی اس انقلابی حکومت کا دائرہ اتنا وسیع کر دیتے ہیں کہ دنیا کی ساری رجعت پسند حکومتیں جمع ہو کر بھی اس انقلابی حکومت کے مقابلہ میں نہیں ٹھہر سکتیں۔ مولانا فرماتے ہیں۔ قرآن کا یہ انقلاب ختم نہیں ہوا بلکہ یہ ہمیشہ برسر پر کار رہے گا۔ کیونکہ کوئی زمانہ ایسا نہیں آ سکتا، جس میں رجعت پسندی کی طاقتیں بالکل معدوم ہو جائیں۔ اگر اقدام پسندی اور رجعت پسندی کی یہ کش مکش نہ رہے تو پھر انسانیت کا بھی خاتمہ ہے۔

شاہ ولی اللہ صاحب کی کتابوں میں ان نظریات کا بار بار ذکر ہے۔ آپ نے اپنے زمانے کی گری ہوئی سوسائٹی کی طرف خاص طور پر توجہ دلائی ہے اور بتایا ہے کہ قوم کی نجات اس فرسودہ نظام کو توڑنے بغیر کسی طرح ممکن نہیں۔ حجۃ اللہ البالغہ کی دوسری جلد صفحہ ۱۰۵ میں فرماتے ہیں:

”دس ہزار آدمیوں کی ایک بستی ہے۔ اگر اس کا اکثر حصہ نئی چیزیں پیدا کرنے میں مصروف نہیں رہتا تو وہ ہلاک ہو جائے گی۔ ایسے ہی اگر ان کا بڑا حصہ قعیش میں مبتلا ہو گیا تو وہ قوم کے لیے بار بن جائے گا۔ جس کا ضرر بتدریج ساری آبادی میں پھیل جائے گا۔ اور ان کی حالت ایسی ہو جائے گی جیسے انہیں دیوانے کتے نے کاٹ کھایا۔“

اسی کتاب کی پہلی جلد میں صفحہ ۳۵ پر مذکور ہے:-

”اس زمانہ میں اکثر بلاد کی بربادی کا سبب دو چیزیں ہیں۔ ایک تو سرکاری خزانہ سے بناوٹی حقوق کا نام لے کر لوگ روپیہ وصول کرتے ہیں، جس نام سے وہ روپیہ لیتے ہیں اس کے حق کو وہ کسی

طرح پورا نہیں کرتے۔ دوسری چیز یہ ہے کہ کمانے والی جماعتوں یعنی کاشت کار، تاجر اور پیشہ وروں پر زیادہ سے زیادہ ٹیکس لگائے جاتے ہیں۔ ان میں سے نرم مزاج تو ٹیکس ادا کر رہے ہیں لیکن جن میں مقابلہ کی ہمت ہے وہ بغاوت اختیار کرتے ہیں۔ اس طرح ساری سلطنت کمزور ہو جاتی ہے۔“

شاہ صاحب کی تعلیمات میں معاشی مسئلہ کی اہمیت پر بڑا زور دیا گیا ہے اور نہایت وضاحت سے بتایا گیا ہے کہ اگر انسانوں کی معاشی حالت درست نہ ہو تو نہ ان کے اخلاق اچھے ہوں گے اور نہ ان کی انسانیت صالح ہو سکے گی۔ آپ نے دہلی کے محمد شاہی دور کو قیصر و کسریٰ کا مماثل ٹھہرایا ہے۔ یعنی قیصر، اسراف، زراعت و زری اور لوٹ کھسوٹ خواہ کافروں کے ہاتھ سے ہو یا نام کے مسلمانوں کے ہاتھ سے، دونوں مٹائے جانے کے قابل ہیں۔ اور مٹانے کا یہ کام صرف انقلاب کرتا ہے۔ یہ انقلاب کرنا اسلام کا مقصد اصلی ہے اور اس کو آج عملی شکل میں پیش کرنا مسلمانوں کا فرض۔

مولانا فرماتے ہیں کہ شاہ صاحب کے نزدیک رسول اکرم کی بعثت کا مقصد ہی یہی تھا کہ ان کے ذریعے خدا کے دین کو باقی سب دینوں پر غالب کر دیا جائے اور اسلام انسانوں کو ایک ایسا نظام حیات دے جو سب نظاموں سے بہتر اور اعلیٰ ہو۔ آپ کی بعثت کا یہ مقصد اس صورت میں پورا ہوا کہ قیصر و کسریٰ کا نظام جو ایک حد تک ساری دنیا پر حاوی تھا، پاش پاش ہو گیا اور انسانیت کو قیصریت اور کسریت دونوں سے نجات ملی۔

قیصر و کسریٰ کے نظام کو تباہ کرنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ اس کی بنا مفاد عامہ کے خلاف جمہور کی لوٹ کھسوٹ (Exploitation) پر تھی۔ بادشاہ اس کے امیروں اور مذہبی طبقوں کا کام یہ رہ گیا تھا کہ وہ رعیت کی خون پسینہ ایک کر کے کمائی ہوئی دولت سے عیش کریں۔ حجۃ اللہ البالغہ کے صفحہ ۱۰۵ پر شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ ”عجم اور روم کے شاہنشاہ اس قدر قیصریت میں مبتلا ہو گئے تھے کہ اگر ان کا کوئی درباری لاکھ روپے سے کم قیمت کی ٹوپی یا کمر بند پہنتا تو اسے ذلیل سمجھا جاتا تھا۔“

لوٹ کھسوٹ کی اس گرم بازاری میں عوام کی حالت حیوانوں سے بدتر ہو گئی تھی۔ پھر اوپر کے طبقوں کو جب بغیر مشقت کے ثروت ملے تو ان میں ہر قسم کے اخلاقی عیوب پیدا ہو جاتے ہیں۔ نہ ان کی صحتیں ٹھیک رہتی ہیں نہ ذہنی قوائے۔ اور چونکہ ان کی زندگی کا مقصد محض رندی و ہوس ناکی بن جاتا ہے اس لیے ان میں آپس میں پھوٹ پڑ جاتی ہے اور شاہی دربار سازشوں کا مرکز ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس طرح عوام تو بھوک سے بے جان ہو گئے اور ”اشراف“ کو ثروت نے بے کار کر دیا۔

مشہور کتاب ”کلید دمنہ“ کے مصنف ایرانی حکیم برزویہ نے رسول اکرم کی بعثت کے وقت ایران کی جو حالت تھی اس کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:

”ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں نے صداقت سے ہاتھ اٹھا لیا ہے۔ جو چیز مفید ہے وہ موجود نہیں ہے اور جو موجود ہے وہ مضرب ہے۔ جو چیز اچھی ہے وہ مرجھائی ہوئی ہے۔ اور جو بری ہے وہ سرسبز ہے۔ دروغ کو فروغ ہے اور نیکی بے رونق ہے۔ علم پستی کے درجہ میں ہے اور بے عقلی کا درجہ بلند ہے۔ بدی کا بول بالا ہے۔ اور شرافت نفسی پامال ہے۔ محبت متروک ہے اور نفرت مقبول ہے۔ فیض و کرم کا دروازہ نیکیوں پر بند ہے اور شریروں پر کھلا ہے۔ حکام کا فرض صرف عیاشی کرنا اور قانون کو توڑنا ہے۔ مظلوم اپنی ذلت پر قانع ہے اور ظالم کو اپنے ظلم پر فخر ہے۔ حرص اپنا منہ کھولے ہوئے ہے اور دور و نزدیک کی ہر چیز کو نگل رہی ہے۔ تسلط لائقوں سے نالائقوں کی طرف منتقل ہو گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا مسرت کے نشے میں یہ کہہ رہی ہے کہ میں نے نیکی کو مقفل اور بدی کو ہا کر دیا ہے۔“

کم و بیش یہی حالت روم کی تھی۔ شاہ صاحب کے الفاظ میں ان کا یہ روگ بڑھتا ہی چلا گیا۔ آخر یہ ہوا کہ خدا اور اس کے مقرب فرشتوں کی آتش غضب بھڑکی۔ اور نبی امی (صلعم) مبعوث ہوئے۔ جن کی زبان سے قیصر و کسریٰ کی عادات کی مذمت فرمائی گئی۔ ان کے ذریعہ دونوں سلطنتوں کا خاتمہ کر دیا گیا۔ اور ان کی جگہ ایک اور نظام نافذ ہوا جو عدل و مساوات پر مبنی تھا۔ چنانچہ اوپر کے لوٹ کھسوٹ کرنے والے طبقے یا تو سرے سے ناپید ہو گئے یا ان کے ہاتھوں سے اقتدار چھن گیا۔ قدرتی طور پر اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہر ملک کے عوام کو سر اٹھانے کا موقع ملا۔ اور اس واقعہ پر زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ مصر، شام، افریقہ اور ایران میں وہاں کے عوام جماعتی زندگی میں پیش پیش نظر آنے لگے۔

قیصریت اور کسریت کی عادات کی مذمت ان کے نظام کی تخریب اور ایک صالح اور مفید نظام کا نفاذ، قرآن کی تنزیل کا مقصد تھا۔ جو گروہ اور قوم قیصریت کو اپنا شعار بنالے اور عوام کی لوٹ کھسوٹ پر ان کی گزران ہو، قرآن ان کے خلاف دعوت جہاد دیتا ہے۔ مولانا کے نزدیک قرآن کا یہ پیغام کسی جماعت یا قوم کے لیے مخصوص نہیں۔ قرآن ہر ظلم کا انکار کرتا اور ہر مظلوم کے دل میں یہ ولولہ اور حوصلہ پیدا کرتا ہے کہ وہ ظلم کو مٹانے اور ظالم کو ظلم سے باز رکھنے اور اس کے اصرار پر اس کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لیے اٹھ کھڑا ہو۔

مولانا فرماتے ہیں کہ شاہ صاحب نے اپنے وقت میں قرآن کے ماننے والوں کو قرآن کا یہی پیغام یاد دلایا تھا۔ اس وقت ہندوستانی مسلمان زوال کی طرف بے تحاشا لڑھکتے پئے جا رہے تھے۔

ان کے عوام بے حس تھے اور خواص دولت و عشرت کے ہاتھوں اپنا جین بن گئے تھے۔ شاہ صاحب نے قوم کے ہر طبقہ کو لاکار اور انہیں متنبہ کیا کہ جس راہ پر وہ بگٹ چلے جا رہے ہیں اس کے آگے ایک گہری کھائی ہے۔ اور اگر وہ اس کھائی سے ادھر نہ رے تو خدا نہ کرے ان کا انجام اچھا نہیں ہوگا۔ شاہ صاحب نے سلاطین کو ڈرایا۔ امراء اور ارکان دولت کو سنبھلنے کو کہا۔ فوجی سپاہیوں کو ان کے فرائض بتائے۔ اہل صنعت و حرفت کو اصلاح نفس کی دعوت دی۔ مشائخ کو سمجھایا اور علماء کو راہ راست بتائی۔ چنانچہ شاہ صاحب نے عام امت اسلامیہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

”تمہارے اخلاق سوچکے ہیں۔ تم پر بے جا حرص و آرزو کا سوار ہو گیا ہے۔ تم پر شیطان نے قابو پالیا ہے۔ عورتیں مردوں کے سر چڑھ گئی ہیں۔ اور مرد عورتوں کے حقوق برباد کر رہے ہیں۔ حرام کو تم نے اپنے لیے خوش گوار بنا لیا ہے اور حلال تمہارے لیے بد مزہ ہو چکا ہے۔“

الغرض جو کچھ ایران اور روم پر گزری تھی وہی اسلامی ہند کو پیش آیا۔ سلاطین ختم ہو گئے۔ امراء کا وجود نہ رہا۔ اہل صنعت اور جمہور بے سری فوج کی طرح تتر بتر ہو گئے۔ شاہ صاحب کا پیغام قوم نے نہ سنا اور جنہوں نے سنا بھی وہ عام زوال کی رو کو نہ روک سکے۔ شاہ صاحب کی جماعت نے اس رو کو تھامنے کی بے شک کوشش کی لیکن ایک عام طوفان کے مقابلہ میں چند مخلص افراد کی کوششیں کامیاب نہ ہو سکیں۔ اور آخر کار ہندوستان کو نئے سیلاب نے زیر آب کر لیا۔

نیا دور ہمارے لیے بہت سی مصیبتیں لایا۔ ہم اس ملک کے مالک تھے۔ آج ہم دوسروں کے غلام ہیں۔ ہمارے ہاتھ میں سیاسی اقتدار اور معاشی ثروت کی باگ دوڑ تھی۔ اس سے محروم ہو گئے۔ ہمارے اشراف علم و فضل کے محافظ تھے۔ آج علم و فضل دوسروں کے ہاں جا چکا ہے۔ ہم آسمان پر تھے لیکن تقدیر نے آج ہمیں گڑھے میں دھکیل دیا ہے۔ ہمارے لیے یہ انقلاب کوئی معمولی انقلاب نہ تھا۔ چنانچہ مولانا فرماتے ہیں۔ ہم واقعی شکست کھا گئے ہیں۔ اگر ہمارا تمدن فلسفہ زندگی اور قانون ناقص نہ ہوتے تو ہمارا سیاسی وجود کیوں بگڑتا۔ مولانا کے الفاظ میں ہر ایک تمدن کسی خاص فکر کا وجود خارجی ہوتا ہے۔ قوم کی اجتماعی زندگی اس وجود خارجی کو ایک قالب میں ڈھالتی ہے جس کو ہم سیاست کہتے ہیں۔ جب کسی قوم کا سیاسی ڈھانچہ بگڑ جاتا ہے تو اس کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ وہ فکر اصلی جو اس ڈھانچے کا اساس تھا وہ بے کار اور فرسودہ ہو گیا۔ بے شک اس فکر کا لباس پرانا ہو جاتا ہے لیکن اس کی اصل روح کی آب و تاب میں کمی واقع نہیں ہوتی۔ مولانا نے فرمایا کہ ہم تاریخ میں اکثر دیکھتے ہیں کہ جب کوئی قوم زوال کے اس منزل پر آتی ہے تو اس میں کوئی نہ کوئی ایسی شخصیت پیدا ہوتی ہے جو ظاہر کے سارے

پردوں کو ہٹا کر اس تمدن کی حقیقی روح کو بے نقاب کرتی ہے۔ اور اپنے اہل وطن کو دعوت دیتی ہے کہ یہ اصلی مدعا تھا تمہاری زندگی کا۔ لیکن تم اس اصل کو چھوڑ کر دوسری راہوں پر پڑ گئے۔ اب بھی وقت ہے کہ تم سنبھل جاؤ۔ ورنہ یاد رکھو کہ خدا کا عذاب تمہارے سروں پر منڈلا رہا ہے۔ اور تاریخ اپنا انتقام تم سے لے کر رہے گی۔ قرآن کی اس آیت کا کہ ”ہم کسی بستی پر اس وقت تک اپنا عذاب نہیں بھیجتے جب تک کہ ان میں کوئی نذیر یعنی ڈرانے والا نہ بھیج لیں اور یہی ہماری سنت ہے۔“ مقصود بھی یہ ہے۔

مولانا فرماتے ہیں کہ ہمیں اس شکست کا کھلے دل سے اعتراف کر لینا چاہیے۔ لیکن یہ شکست ہمارے تمدن اور نظام کی شکست ہے۔ ہمارے فکر کی شکست نہیں۔ اس فکر نے ایک زمانے میں یہ ڈھانچہ اختیار کیا۔ اب وہ ڈھانچہ ٹوٹ چکا ہے۔ جہاز ڈوبنے کے بعد محض اس خیال سے کہ کبھی یہ جہاز ہارا تھا اور اس کے بل پر ہم سمندر کے سینہ پر دوڑتے پھرتے تھے جہاز کے تختوں سے چمٹے رہنا دانش مندوں کا طریقہ نہیں۔ جہاز ڈوب گیا ہم نے بس بھر کوشش کی وہ نہ ڈوبے۔ مولانا کا کہنا ہے کہ میں اور میرے ساتھیوں نے تو اس جہاز کو بچانے کے لیے اپنی جان تک دینے میں بھی دریغ نہ کیا۔ اور آخر وقت تک اس کی خاطر سمندر کی موجوں، آندھیوں اور جھکڑوں سے لڑتے رہے لیکن اب جب کہ یہ جہاز سمندر کے نیچے جا چکا ہے اور اس کے ترانے کی امید موم تک باقی نہیں رہی۔ اس جہاز پر آنسو بہاتے رہنا فہم و فراست سے دیوالیہ ہونے کے مترادف ہے۔ عقل اور ہمت تو یہ تقاضا کرتا ہے کہ جس طرح ہم نے پہلے یہ جہاز بنایا تھا اب ایک دوسرا جہاز بنا کر کھڑا کر لیں۔ لیکن جب بھی ہم نیا جہاز بنائیں گے تو ظاہر ہے اس کے بنانے میں پچھلے جہاز کے فن، مہارت اور نمونہ سے بڑی مدد لی جائے گی۔

القصد مولانا کے الفاظ میں ہمارا تمدن ہمارا نظام زندگی اور ہمارا قانون جو ہم نے ابھی اس سیلاب کی نذر کیا ہے اب بجنہ دوبارہ زندہ نہیں ہو سکتے۔ ان کی حیثیت اب ایک تاریخی واقعہ کی ہے لیکن اس کے ساتھ ہمیں یہ بھی ماننا پڑے گا کہ ایک عرصہ تک ہماری قومی اور ملی شخصیت نے اپنے وجود کو ان مظاہر میں جلوہ گر کیا تھا اور یہ چیزیں ہمارے باطنی وجود کے لیے علامات سی بن گئی ہیں۔ اس لیے ان کا کلی انکار کسی طرح ممکن نہیں۔ زندگی کا سلسلہ اٹوٹ ہے اور جس طرح پانی اپنی سطح ہموار رکھتا ہے زندگی بھی ہمیشہ اپنا تسلسل قائم رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ قوم زندگی کے جن مراحل کو طے کر چکی ہوتی ہے نیا نظام بشرطیکہ وہ صالح ہو ان مراحل سے آگے بلندی کی راہ دکھاتا ہے لیکن وہ ان مراحل سے کلیتاً انکار نہیں کرتا۔ البتہ ان کے بُرے اجزاء کو ضرور الگ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مولانا کا یہ کہنا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو بھی اسی چیز کی ضرورت ہے۔ ان کو چاہیے کہ وہ ماضی کی وراثت کا جائزہ لیں۔ کھوٹے کھرے کو پرکھیں۔ کھوٹے کو قومی وجود سے نکال کر باہر کریں۔ جو کھرا ہے اس کو سینہ سے لگائیں۔

ارد گرد جو نئے عناصر وجود میں آچکے ہیں انہیں اپنائیں اور اپنے قومی مزاج میں ان کو اس طرح سموئیں کہ وہ ان کے لیے موافق بن جائیں اور اس طرح اپنے لیے نیا تمدن، نیا نظام حیات اور نیا قانون وضع کریں۔ بے شک اس تمدن، نظام اور قانون کی روح وہی ہوگی جو قرآن اور اسلام کی روح ہے۔ ہاں لباس کا فرق ضرور ہوگا لیکن کیا قرآن اور اسلام کی روح اتنی ہی عام نہیں جتنی کہ خود انسانیت ہے اور کیا انسانیت کو ہر زمان و مکان میں ایک ہی لباس کا پابند بنانا ممکن ہے۔

مولانا نے ایک دفعہ فرمایا کہ شکست کھانا بری چیز نہیں۔ لیکن شکست کھا کر ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جانا البتہ مذموم ہے۔ انسان کو ہر شکست سے نئے ولولہ عمل کے لیے مہمیز کا کام لینا چاہیے اور پہلے جو چوک ہوگئی تھی، اس کی تلافی کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس موضوع پر گفتگو فرماتے ہوئے مولانا نے ایک مرتبہ اپنے بچپن کا ایک لطیفہ سنایا۔ کہنے لگے کہ میں بالکل ابتدائی درجوں میں پڑھتا تھا۔ ایک دفعہ گھر والوں پر رعب جمانے کے لیے میں نے یہ کیا کہ ایک خوش خط لڑکے سے اپنی تختی پر کچھ لکھوا لیا۔ اتفاق سے میرے کسی ہم عمر عزیز نے وہ لکھا ہوا دھو دیا۔ میں نے جو دیکھا تو رو کر سارے گھر کو سر پر اٹھالیا۔ اتنے میں میرے ماموں آگئے۔ انہوں نے جو واقعہ سنا تو فرمانے لگے کہ جب تم نے ایک بار لکھا اور وہ کسی نے دھو دیا۔ تو تم اسے دوبارہ بھی لکھ سکتے ہو۔ آخر اس رونے دھونے سے کیا حاصل۔ مولانا کہتے ہیں کہ ماموں کی یہ بات اب تک میرے ذہن پر نقش ہے۔ بے شک تختی پر لکھا ہوا مٹ سکتا ہے لیکن ہاتھ کے لکھنے کی مہارت اور دماغی صلاحیت جو ہاتھ سے لکھواتی ہے وہ تو موجود اور قائم ہے۔ مظاہر بدلا کریں۔ لیکن اگر فکر موجود اور زندہ ہے تو ان مظاہر کی تبدیلیوں سے آدمی کیوں بددل ہو۔

اس ضمن میں مولانا کی زندگی کا ایک اور واقعہ ہے جس کو بیان کرنا یہاں بے محل نہ ہوگا۔ پچیس سال کی جلاوطنی کے بعد جب آپ ہندوستان آنے کے لیے مکہ معظمہ سے روانہ ہوئے تو آپ کی عجیب حالت تھی۔ دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ مولانا پر اس وقت غیر معمولی تاثر کی کیفیت طاری تھی۔ جو حرم میں رہتے بارہ سال ہو گئے تھے۔ ایک طرف اس کو چھوڑنے کا قلق تھا اور ساتھ ہی وطن کی مراجعت، جذبات میں تلاطم پیدا کر رہی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ مولانا سوز و گداز کے سیلاب کو بڑی مشکل سے ضبط کیے ہوئے ہیں۔ ایک ہندوستانی بزرگ جو خود بہت بڑے عالم ہیں اور وہ اور ان کا خاندان مستقل طور پر حجاز میں بس گیا ہے اور ان کا وہاں کاروبار کا وسیع سلسلہ ہے بارہ سال کے عرصے میں شاید ہی کوئی دن ہوگا کہ مولانا کی صاحب موصوف سے ملاقات نہ ہوئی ہو۔ آپ مولانا کے ساتھی بھی تھے اور ایک لحاظ سے شاگرد بھی۔ ان کا اصرار تھا کہ مولانا بیت الحرام ہی میں رہیں۔ لیکن مولانا سمجھتے تھے کہ ان کا وطن واپس جانا ضروری اور مفید ہے۔ ان دنوں بزرگوں کی آخری ملاقات بڑی رقت انگیز تھی۔ رخصت

ہوتے وقت مولانا نے ان سے فرمایا کہ میرا یہ غیر متزلزل یقین اور عقیدہ ہے کہ اسلام کا مستقبل بڑا روشن اور شاندار ہے۔ بے شک اسلام پوری قوت اور توانائی کے ساتھ ایک بار پھر اٹھے گا لیکن خارج میں اس کا وہ ڈھانچہ نہیں ہوگا جو اس وقت ہے۔ مجھے جس طرح اس بات پر یقین ہے کہ اسلام پھر ایک بار ابھرے گا اسی طرح میرا یہ بھی ایمان ہے کہ ہمارا موجودہ ڈھانچہ اب چند دنوں کی چیز ہے۔ اسلام کو اپنا ایک نیا ڈھانچہ بنانا ہوگا۔ اور مسلمان اسے جس قدر بھی جلد بنا لیں بہتر ہوگا۔ یہ وہ عقیدے ہیں جو مجھے کشاں کشاں ہندوستان لے جا رہے ہیں۔ میں اب چراغ سحری ہوں۔ خدا معلوم زندگی کے کتنے دن اور ہوں گے۔ چاہتا ہوں مرنے سے پہلے اپنی قوم کے کانوں تک یہ حقیقت پہنچا دوں۔

خدا سمجھے بیٹھے ہو یہ تو خود فنا پذیر ہیں یہ نکتے ہیں اور ڈوب جاتے ہیں۔ خدا تو ان سب کا خالق ہے۔ اگر پوجنا ہے تو اسے پوجو۔ ابراہیم کی اس دعوت کا عملاً یہ نتیجہ نکلتا تھا کہ جب یہ چاند سورج اور ستارے خدا نہیں تو ان کے بت بنا کر ان کو پوجنا کیسے ٹھیک ہو سکتا ہے۔ جب بتوں کی پوجا غلط ہے تو یہ پجاری اور ان کا اقتدار اور تقدس بھی لغو ہے۔ اور ان کے بل بوتے پر نمرود بادشاہ جو خدائی کر رہا ہے وہ کیسے جائز ہو سکتی ہے۔ صائبی فکر کے مظہر بادشاہ پجاری اور بت تھے۔ ابراہیم نے جو نیا فکر پیش کیا وہ ان سب کو حرف غلط کی طرح مٹانا چاہتا تھا۔ ابراہیم کا خدا چونکہ ان مظاہر سے ماوراء تھا اس لیے اس کا بت بنانا ممکن ہی نہ تھا۔ اس کے برعکس صائبی تمدن کی کل کائنات بتوں اور بتوں کی پرستش پر مشتمل تھی اور اسی سے ان کی سیاسی اجتماعی اور انفرادی زندگی کے یہ سارے فتنے اٹھے تھے الغرض انسانیت کی تاریخ میں حضرت ابراہیم ایک نئے دور کے بانی بنتے ہیں۔ اس دور کو ہم حقیقت کا نام دیتے ہیں۔

انسانیت کے فکری ارتقا پر بحث کرتے ہوئے ایک دفعہ مولانا نے فرمایا کہ زندگی کو نقطہ کمال تک پہنچنے کے لیے ہزار ہا مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ ایک مرحلہ سے گزرتے ہوئے زندگی چند نقائص سے پاک ہو جاتی ہے۔ پھر دوسرے مرحلہ میں جو ارتقا ناقص ہوتے ہیں وہ چھٹ جاتے ہیں۔ اسی طرح ترقی کا یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ بعینہ یہی مثال مذاہب کی ہے۔ یہ منازل ہیں انسانیت کے نقطہ کمال کی طرف سفر کے۔ زندگی کی ابتداء معدنیات، نباتات اور حیوانات سے ہوئی۔ پھر انسان معرض وجود میں آیا۔ اس کے فکری ابتدائی صورت صائبیت تھی۔ اس منزل سے انسان آگے بڑھا تو حنفی دور میں داخل ہوا۔

حضرت ابراہیم نے اپنی قوم کو جو دعوت دی تھی قوم نے اسے قبول نہ کیا۔ پہلے تو انہیں درغلانے کی کوششیں ہوئیں لیکن جب ادھر سے عزم بالجزم کا اظہار ہوا تو قوم حضرت ابراہیم کی جان کے درپے ہو گئی۔ آپ نے دیکھا کہ دجلہ و فرات کی وادی میں صائبی فکر اتنا راسخ ہو چکا ہے اور لوگوں کی ذہنیت اس قدر مسخ ہو گئی ہے کہ وہ حقیقت کا پاکیزہ اور بلند فکر قبول کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ آپ نے جب یہ دیکھا تو وطن اور قوم سے ہجرت کرنے کی ٹھان لی۔ چنانچہ آپ عراق سے شام آئے۔ شام سے فلسطین اور فلسطین سے آپ مصر بھی گئے۔ وہاں سے لوٹے تو فلسطین میں اپنی نئی بستی بسائی۔ یہ نئی بستی آگے چل کر عرب شام اور فلسطین کا مرکز بنی۔ نیز ایک طرف اس کے ذہنی اور تمدنی تعلقات عراق سے پیدا ہوئے اور دوسری طرف یہاں پر مصر کی تہذیبی اور علمی زندگی کے اثرات بھی پہنچے۔ حضرت ابراہیم نے اپنے خاندان کے لیے جو جگہ پسند کی تھی وہ جغرافیائی اعتبار سے ایک عالمگیر اور بین الاقوامی فکر کے پروان چڑھنے کے لیے بہت مناسب اور موزوں تھی۔ فلسطین اور اس کے ارد گرد کے علاقے

تاریخ اسلام پر ایک نظر

پس منظر اور ابتدائی دور

کئی ہزار سال پہلے کی بات ہے کہ دجلہ و فرات کی وادی میں تمدن اپنے عروج پر تھا۔ اس تمدن کے حامل صائبی عقیدہ کے تھے۔ یہ لوگ مظاہر قدرت کی پرستش کرتے تھے۔ ان کے نزدیک چاند تارے اور سورج خدا کے مظہر تھے۔ یہ مندروں میں ان کے بت بناتے اور ان کی پوجا کرتے۔ طبعی طور پر بت پرستی سے پجاریوں کا گروہ وجود میں آیا۔ سلطنت نے اس گروہ کی سرپرستی کی۔ بادشاہ خدایا خدا کا مظہر قرار پایا۔ پجاری اس کے دست و بازو بنے اور جس طرح تاریخ کے ہر دور میں ہوتا چلا آیا ہے ان لوگوں نے بھی مذہب کے نام سے عوام کی ذہنی اخلاقی اور معاشی لوٹ کھسوٹ شروع کر دی۔

ہر تمدن ایک خاص فکر کا مادی نتیجہ ہوتا ہے۔ جب دن رات کا الٹ پھیر اس تمدن میں فتور پیدا کر دیتا ہے اور اس سماج کے قواعد اور ضوابط انسانوں کی صلاحیتوں کو ابھرنے نہیں دیتے تو طبیعت نئے فکر نئے تمدن اور نئے قوانین کا تقاضا کرتی ہے۔ چنانچہ ان لوگوں ہی میں سے کوئی فرد یا جماعت اٹھتی ہے جو پہلے کے تمدن اور نظام معاشرت کو جو فرسودہ اور بے کار ہو چکا ہوتا ہے غلط ٹھہراتی ہے۔ اور نئے افکار اور نئے اصولوں پر نئی زندگی کی طرح ڈالتی ہے۔ نیا فکر پہلے نظام فکر سے اصولاً مختلف نہیں ہوتا بلکہ یہ اسی کی ایک نئی ترقی یافتہ شکل ہوتی ہے۔ پہلا فکر اپنے مقام پر درست اور مناسب تھا۔ لیکن جب اس فکر کے اساس پر ایک تمدن بنا اور ایک منزل پر جا کر وہ زمانے اور ماحول کی ضرورتوں کے مقابلہ میں ناکافی ثابت ہوا تو مصلحت متقاضی تھی کہ پہلے فکر سے وسیع تر اور بلند تر کوئی فکر معرض وجود میں آئے اور ظاہر ہے تمدن کی جو عمارت اس فکر کی بنیادوں پر بنے گی وہ پہلے سے اعلیٰ اور ارفع ہوگی۔

اس صائبی تمدن کے خلاف جس کا مظہر اس وقت نمرود بادشاہ اور اس کے پجاری تھے اسی تمدن کے ایک فرد ابراہیم نے آواز بلند کی اسے حسن اتفاق سمجھئے کہ اس شخص کا اپنا خاندان بھی پجاریوں میں سے تھا۔ اس صائبی فکر کے ناقص ہونے کی دلیل اور کیا ہو سکتی تھی کہ خود اس فکر کی علمبردار جماعت کا ایک رکن اس سے بدظن ہو جاتا ہے۔ ابراہیم نے اپنی قوم کو بتایا کہ یہ چاند سورج اور ستارے جن کو تم

سے پھیلا۔ پھر حضرت عیسیٰ آئے انہوں نے ابراہیمی دین کی پھر تجدید کی۔ اور یہ عیسائیت کے نام سے روشناس خلق ہوا۔ آخر میں اسلام آیا جو حضرت ابراہیمؑ کے فکر کا نقطہ کمال ہے اور یہودیت اور عیسائیت کے سلسلہ ارتقاء کی آخری کڑی۔

مولانا فرماتے ہیں کہ بے شک قرآن اپنی جگہ مستقل بالذات ہے اور وہ اپنے مطالب اور تعلیمات میں کسی اور کتاب کا محتاج نہیں۔ لیکن خود قرآن نے یہ بار بار کہا ہے کہ وہ تورات و انجیل کا صدق ہے اور نبوت محمدیؐ کی تائید میں وہ ہر موقع پر حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ اور ان کی قوم کی مثالیں دیتا ہے۔ مولانا کے خیال میں اس کا مطلب یہ ہے کہ تورات، انجیل اور قرآن ابراہیمی ملت کی تین الہامی کتابیں ہیں اور یہودیت، عیسائیت اور اسلام اس ملت کے تین مذاہب ہیں۔ ان میں قرآن اور اسلام کی حیثیت ایک میزان اور کسوٹی کی ہے۔ کیونکہ وہ آخر ترین کتاب اور دین ہے اور اس کی تاریخی حیثیت بھی مسلم اور قابل اطمینان ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ اسلام کا علمی اور تحقیقی مطالعہ کرتے وقت اگر ابراہیمی ملت کی ساری ذہنی اور فکری تاریخ کو بطور پس منظر سامنے رکھا جائے تو اس سے بڑی مدد ملتی ہے۔

لیکن ابراہیمی ملت کی ذہنی اور فکری تاریخ سمجھنے کے لیے اس کی بھی ضرورت ہے کہ ایک طرف ایران اور عراق کی قدیم تہذیبوں پر نظر رہے اور دوسری طرف مصر اور یونان کے افکار سے واقفیت ہو کیونکہ واقعہ یہ ہے کہ مشرق قریب اور ایران کی ان تہذیبوں، تمدنوں اور مذہبی اور فلسفیانہ افکار کا قدیم زمانہ میں آپس میں بڑا ربط تھا۔ اور ایک کا دوسرے پر غیر معمولی اثر بھی پڑتا رہا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ صائبی تمدن کی بہترین روایات اپنے ساتھ اپنے نئے وطن میں لائے تھے۔ اس زمانے میں عراق کے اس صائبی تمدن اور ہندوستان اور ایران کی آریائی تہذیب کے ڈانڈے بھی آپس میں ملے ہوئے تھے چنانچہ آجکل زمین کے نیچے سے جو کھنڈرات نکل رہے ہیں ان سے ان تمدنوں کے باہمی میل ملاپ کا مزید ثبوت ملتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کا حنفی فکر جیسا کہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں صائبی اور آریائی فکر کے ارتقا کا اگلا قدم تھا۔ پھر فلسطین میں رہتے ہوئے حضرت ابراہیمؑ نے ایک طرف جنوب کے عربوں سے اپنا رشتہ جوڑا اور دوسری طرف مصر سے آمدورفت کا سلسلہ قائم کیا۔ کچھ عرصہ کے بعد حضرت یعقوبؑ اپنے تمام خاندان سمیت مصر چلے گئے اور کئی نسلوں تک اولاد یعقوب جو بنی اسرائیل کہلاتی تھی، مصر میں آباد رہی۔ بنی اسرائیل میں حضرت موسیٰؑ پیدا ہوتے ہیں۔ خوش قسمتی سے ان کی پرورش، تعلیم و تربیت بنی اسرائیل میں نہیں بلکہ مصر کے بادشاہ فرعون کے ہاں ہوتی ہے۔ حضرت موسیٰؑ جوان ہوئے تو فرعون کی طاقت سے ان کا تصادم ہو جاتا ہے اور وہ مدین میں جو عرب اور فلسطین کے مابین واقعہ تھا آ کر پناہ گزین

جنہیں ہم آجکل مشرق قریب کہتے ہیں صدیوں سے مشرق اور مغرب کے علاقے میں بیچ کی کڑی کا کام دیتے رہے ہیں، مشرق کا سامان تجارت اس راستے سے یورپ کو جاتا تھا اور ظاہر ہے سامان تجارت کے ساتھ ساتھ خیالات اور افکار بھی جاتے ہوں گے۔ چین کی نادر چیزیں ہندوستان اور جزائر مشرق الہند کے گرم مسالے اور حبش کے تھے سب اسی راہ سے گزرتے تھے۔ چنانچہ دنیا کی بڑی بڑی تہذیبیں جنہوں نے سارے عالم کو اپنے اثر میں لانے کی کوششیں کیں، اکثر مشرق قریب یا اس کے ساتھ کے سمندر بحیرہ روم سے اٹھیں اور ہر تہذیب اور سلطنت جس نے کہ بین الاقوامی قیادت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لینے کی طرف قدم بڑھایا۔ اس نے سب سے پہلے ان ممالک کو قابو میں کرنے کی کوشش کی۔

لارڈ کرومر مصر کے مشہور برطانوی ہائی کمشنر نے اپنی کتاب ”مصر جدید“ میں لکھا ہے کہ ”نیولین جب آخری شکست کھانے کے بعد سینٹ ہلینا کے جزیرہ میں جلاوطن کیا گیا تو اس نے جزیرہ مذکور کے برطانوی گورنر کو سب سے پہلی ملاقات میں کہا تھا کہ مصر دنیا کا سب سے اہم ملک ہے۔“ اور یہ ایک تاریخی حقیقت بھی ہے کہ جس کے قبضے میں مصر ہو وہ شام، فلسطین، جزیرہ عرب اور بحیرہ روم اور بحیرہ قلمز کا مالک بن جاتا ہے اور جو شام اور فلسطین پر قابض ہو جب تک وہ مصر کو اپنے ہاتھ میں نہ لے لے۔ ان دونوں ملکوں پر اس کا قبضہ مضبوط نہیں ہو پاتا۔ اب تک یہی ہوتا آیا ہے کہ جو اس علاقہ پر مسلط ہو جائے وہ دنیا میں اول درجہ کی بین الاقوامی طاقت کا مالک ہوتا ہے۔ کسی زمانے میں مصریوں کو یہ امتیاز حاصل تھا۔ پھر چند روز کے لیے ایران مشرق قریب کا سرخیل بنا۔ سکندر نے ایرانیوں کو شکست دے کر یونان کو یہ عزت بخشی یونانی کمزور پڑے تو رومیوں نے ان کی جگہ لی۔ رومیوں کے وارث عرب بنے۔ اور عربوں کو زوال آیا تو عثمانی ترک اس سرزمین پر حکومت کرتے رہے۔ اور اب برطانیہ کے ہاتھ میں بین الاقوامی طاقت کی یہ کنجی ہے۔

الغرض مشرق قریب اور اس کے آس پاس کے علاقے ہمیشہ سے تاریخ میں ایک سیاسی فکری اور تمدنی وحدت رہے ہیں۔ کبھی بحیرہ روم کے شمالی کنارے پر بسنے والوں نے اس سہ گانہ وحدت کی زمام سنبھالی اور کبھی جنوبی کنارے کے لوگ سمندر پار کر کے شمال والوں کو اس وحدت میں شریک کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ چنانچہ ہر ایک نے دوسرے سے استفادہ کیا۔ کبھی ایک استاد بنا اور دوسرا شاگرد۔ جو کبھی شاگرد تھے وہ استاد کی مسند پر بیٹھے اور استاد شاگردوں کی صف میں بیٹھے نظر آئے۔ اسے زمانہ کا اتفاق کہنے یا مصلحت خداوندی کہ حضرت ابراہیمؑ نے اس مرکزی سرزمین کو اپنے خاندان کا وطن بنایا۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا، ابراہیمی ملت بڑھتی اور پھیلتی گئی۔ اس ملت کی ابتدا حضرت ابراہیمؑ سے ہوئی۔ بعد میں حضرت موسیٰؑ نے ملت ابراہیمؑ کے فکر کو ایک رنگ دیا۔ جو دنیا میں یہودی مذہب کے نام

ایک دوسرے سے لڑنے لگ گئے۔

اسلام مشرق قریب کے ان تمام فلسفوں اور مذاہب کا نعم البدل بن کر آیا، اسلام کے نعم البدل ہونے کی پرکھ خود زمانے نے کر دی، چنانچہ جہاں کہیں ان فلسفوں اور مذاہب سے اسلام کی نگر ہوئی، اسلام غالب آیا اور یہ فلسفے اور مذاہب یا تو مٹ گئے یا انہوں نے اپنے آپ کو اسلام سے ہم آہنگ بنالیا، اسی طرح مشرق قریب میں قدیم تمدنوں کے بچے کھچے جو بھی آثار تھے، وہ یا تو ناپید ہو گئے یا وہ نئے اسلامی تمدن کا جزو بن گئے، الغرض اسلام بین الاقوامی فکر اور تمدن کی قیادت کا مالک ہو گیا۔

قصہ مختصر، دین اسلام ہزار ہا برسوں کی اس مذہبی جدوجہد کا آخری نقطہ کمال تھا اور مسلمانوں نے جس تمدن کی بعد میں تشکیل کی تھی وہ صابیوں، بنی اسرائیل، مصریوں اور دوسری اقوام کی تمدنی روایات کے اجزائے صالح اور باقیات صالحات کا حاصل تھا۔

مولانا کے نزدیک مکہ کے قریش کے بارے میں یہ سمجھنا کہ وہ عربوں کے اور قبائل کی طرح ایک قبیلہ تھا صحیح نہیں، صحرائی اور بدوی زندگی اور اس کے لوازمات اور خصائص جو دوسرے بدوی قبائل میں موجود تھے، قریش ان سے بہرہ ور تو ضرور تھے لیکن وہ عرب کی بدوی ذہنیت کا نمونہ نہ تھے۔ قریش کی اپنی خاص روایات تھیں اور قصی کے زمانے سے مکہ کی اجتماعی اور سیاسی زندگی میں ایک نظم چلا آتا تھا، نیز تجارتی قافلوں کی وجہ سے قریش کو ہمسایہ ملکوں میں آنے جانے کا بھی موقع ملتا تھا اور حج اور عکاظ کے میلے کے موقعوں پر عرب قبائل سے بھی ان کے راہ و رسم پیدا ہو جاتے تھے، یہ اسباب تھے جن کی وجہ سے قریش ایک طرف مشرق قریب کے تمدنی سرمایہ اور ذہنی روایات سے واقف تھے اور دوسری طرف قبائل کی بدویانہ خصائل سے بھی نابلد نہ تھے، چنانچہ قرآن کے بلند معانی اور اعلیٰ مضامین قریش کے لیے اجنبی نہ تھے، وہ یہودی اور نصرانی روایات کو بھی سمجھتے تھے اور قرآن میں علم و حکمت کی جو باتیں بیان کی جاتی تھیں، ان سے بھی محظوظ ہوتے تھے، البتہ ان کے دماغوں میں اپنا کوئی واضح اور مستقل فکر نہ تھا اور اس کا سبب یہ تھا کہ وہ اپنی مادی اغراض میں اس طرح الجھے ہوئے تھے کہ وہ ادھر توجہ نہ کرتے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ قرآن کو عرب کی بدوی ذہنیت کا ترجمان کہنا سخت غلطی ہے۔ قرآن کا خطاب تو قریش کی اس ترقی یافتہ سوسائٹی کی طرف تھا۔ لیکن قریش قرآن ایسی کتاب تصنیف نہ کر سکتے تھے اور نہ اس کے بس میں تھا کہ وہ قیصر و کسریٰ سے نکر لیتے۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اکرم صلعم کی وساطت سے قریش کے لیے یہ دو چیزیں ممکن کر دیں۔ بے شک قرآن قریش کی زبان اور ان کی ذہنیت کے مطابق نازل ہوا، لیکن تھا وہ خدا کا پیغام، جو قریش کے واسطے سے ساری دنیا کو دیا جا رہا تھا۔

مکہ میں قریش کا اپنا ایک باقاعدہ نظام تھا، تجارتی اور سیاسی معاملات کو سلجھانے کے لیے

ہوتے ہیں۔ یہاں وہ تقریباً دس سال تک رہے۔ مصر کی تعلیم اور مدین میں حضرت شعیب کے ساتھ صحرائی زندگی کا اثر آخر رنگ لایا اور حضرت موسیٰ مصر لوٹے تو خدا کی طرف سے فرعون، اس کی قوم اور بنی اسرائیل کے لیے ایک نیا پیغام لے کر لوٹے۔

فرعون نے حضرت موسیٰ کی بات نہ مانی اور وہ ہلاک ہوا اور آپ اپنی قوم کو مصر سے نکال کر فلسطین میں دوبارہ لے آئے، یہاں بنی اسرائیل کی تاریخ کے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ ان میں نبوت تو تھی ہی، اب انہیں سلطنت ملتی ہے اور داؤد اور سلیمان جیسے پیغمبر جو سلطنتوں کے مالک تھے۔ برسر اقتدار آتے ہیں۔ اس کے بعد پھر ان کے بڑے دن آ گئے، چنانچہ بخت نصر عراق کا ایک بادشاہ فلسطین پر حملہ کرتا ہے اور بنی اسرائیل کو قیدی بنا کر اپنے ساتھ عراق لے جاتا ہے، یہاں وہ برسوں رہتے ہیں۔ مصر کے قیام کے زمانہ میں بنی اسرائیل کو وہاں کی تہذیب و تمدن سے واسطہ پڑا تھا اور بخت نصر کے عہد میں وہ ایرانی اور عراقی اثرات سے متاثر ہوئے۔ اس کے بعد یونانیوں کا دور آتا ہے اور سکندر کے زمانہ میں یونانی فلسفہ اور تہذیب مشرق قریب پر چھا جاتی ہے اور بنی اسرائیل پھر اس کی لپیٹ میں آ جاتے ہیں۔

یونان دراصل فلسفہ اور تمدن میں مصر کا شاگرد تھا اور یونان کے بڑے بڑے حکیم مصری درس گاہوں سے مستفید ہو چکے تھے۔ سکندر کے زمانہ میں اہل یونان فلسفے اور تمدن کی استاد بن کر مصر پہنچے۔ سکندر مر تو مصر کو اس کے ایک سردار بطلمیوس نے اپنا مرکز بنایا اور علم و فلسفہ کی جو شمع کبھی یونان کے پایہ تخت ایتھنز میں روشن تھی، بطلمیوس نے اسے دارالسلطنت اسکندریہ میں دوبارہ جلایا، یہاں ایک بار پھر یونان کے فلسفے اور مصر اور بنی اسرائیل کی حکمت اور مذہب کا اتصال ہوا اور مشرق قریب میں ایک نئے فکر نے جسے اشراقی یا نوافلاطونی کہا جاتا ہے، جنم لیا۔

مصر کے بطلمیوس فرماں روا بھی ناپید ہو گئے اور ان کی جگہ رومیوں نے مشرق قریب کی سرداری لی۔ اسی عہد میں حضرت عیسیٰ پیدا ہوئے، اب وہ اور ان کے حواری دنیا کو ایک نیا پیغام دیتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ تو زیادہ کامیاب نہ ہو سکے، لیکن ان کے حواریوں اور ان کے حواریوں کے شاگردوں نے بنی اسرائیل کو تو نہیں البتہ آریائی فکر والوں کو اپنا ہم نوا بنا لیا اور ایک وقت آیا کہ عیسائیت رومی شہنشاہیت کا سرکاری مذہب بن گئی اور جبل الطارق سے لے کر درجلہ و فرات کے کناروں تک عیسائیت کا بول بالا ہو گیا، بلکہ ایرانی حکومت جو روم کی عیسائی سلطنت کی سخت دشمن تھی اور دونوں میں آئے دن خون ریز جنگیں ہوتی رہتی تھیں، اس ایرانی حکومت کی ایرانی رعایا کے افراد بھی عیسائیت قبول کرتے جاتے تھے۔ آخر زمانے نے عیسائیت کو بھی بے روح کر دیا اور عیسائی خالی خولی اصطلاحوں کے لیے آپس میں

تو اعد ضوابط تھے، قومیت کا ان کا اپنا ایک مخصوص تصور تھا اور انہوں نے اس سلسلہ میں ایسی مذہبی رسوم بھی بنائی تھیں، جو ان کے مادی اور جماعتی مفاد کے لیے مفید تھیں۔ اور اس کی وجہ سے بدو قبائل میں ان کا مذہبی وقار بھی قائم ہوتا تھا اور ایک مشہور اہل قلم اس عہد کے محقق کے الفاظ میں ”متعدد کاروانی راستوں کا اہم جنکشن ہونے کی وجہ سے یہاں کی آبادی میں یک نسلی نہ رہی تھی۔ اسمعیلی خاندان، عراق یا فلسطین سے آئے تھے، خزاعہ یمن کے تھے۔ مکہ والوں کی رشتہ داری اور کاروباری تعلقات شہر مدینہ اور طائف سے بھی کافی تھے، قصی کا تعلق شمالی عرب کے قبیلہ قضاہ سے تھا، قصی کی کوشش اور قابلیت سے قریشی قبائل نے شہر مکہ میں سربرآوردہ حیثیت حاصل کی اور قصی ہی کی سرداری میں ایک زیادہ منضبط شہری مملکت قائم ہوئی جس میں سماجی اور انتظامی عہدے موروثی طور پر مختلف خاندانوں میں پائے جاتے تھے۔ جہاں تک قانون کا تعلق ہے، حجاز میں لکھنے پڑھنے کا رواج بہت کم رہنے کے باعث اسلام سے پہلے کسی تحریری مجموعہ کا پتہ نہیں چلتا، لیکن قانون معاہدہ اور قانون جرائم وغیرہ کے بہت سے رواجی احکام روایات نے محفوظ رکھے تھے حتیٰ کہ اجنبیوں کے حقوق کے تحفظ اور تصادم قوانین سے بچنے کے لیے حلف الفضول کے نام سے ایک رضا کارانہ نظام بطور تہدید اور تدارک وجود میں آ گیا تھا۔

لیکن مکہ کے اس نظام میں چند بنیادی خامیاں تھیں، جن کی بناء پر مکہ کی شہری زندگی میں اندر ہی اندر ناراضگی کی لہر دوڑ رہی تھی۔ مکہ میں ایک طرف مفاد پرست تاجروں کا ایک مخصوص طبقہ تھا اور دوسری طرف حبشی غلاموں کی ایک بہت بڑی تعداد تھی، مکہ میں سودی کاروبار زوروں پر تھا اور خود رسول اللہ کے چچا حضرت عباس تک اسلام لانے سے پہلے سود کا بڑے پیمانے پر کام کرتے تھے۔ یہ امیر طبقہ مال مست تھا، تجارت اور سرمایہ سے انہیں دولت ملتی اور دولت سے یہ لوگ خدمت کے لیے حبشی غلام خریدتے اور حظ نفس کے لئے لوٹیاں لاتے، چنانچہ ناچ اور گانے کی محفلیں جتیں، شراب کا دور چلتا، سفر کے سلسلے میں جب ان لوگوں کا ایران اور شام میں گزر ہوتا، تو وہاں سے یہ عیش و عشرت کے نئے نئے انداز سیکھ کر آتے، مکہ کا یہ کنتی کا اوپر کا طبقہ اس لہو و لعب میں منہمک تھا، لیکن مکہ کے باشندوں کی اکثریت اقتصادی بد حالی کا شکار ہو رہی تھی۔

دنیا کا سب سے مشکل مسئلہ اور سب سے بڑی گتھی جس کو سلجھانے کے لیے ہمیشہ بڑے آدمیوں کی ضرورت پڑی اور ہر نئے نظام کو اس کے متعلق اپنا خاص نقطہ نظر متعین کرنا لازمی ہوا، وہ انسانیت کے مختلف طبقوں کے درمیان جن میں اکثر کشمکش رہتی ہے، صلح و صفائی اور میل ملاپ کی راہ پیدا کرتا ہے، امیر و غریب کا فرق، آسودہ حال و فلاش کی چچقلش، زمینداروں اور کسانوں کا تقادت،

زرداروں اور زردالوں کی آپس کی کھینچا تانی، کارخانوں کے مالکوں اور ان میں کام کرنے والے مزدوروں کی بے اعتمادی، اس کشمکش، اس اختلاف اور اس دشمنی کو جو ایک قوم کے مختلف طبقوں میں قدرتا ہوتی ہے، دور کرنا ہر صاحب مذہب اور ہر نئے نظام کا فرض ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے اسلام کو بھی اس مسئلہ کا حل کرنا ضروری تھا، چنانچہ مذہب اسلام اعلان جنگ تھا، ظالم، فاجر، عام مفاد کے ذرائع کے اجارہ داروں کے خلاف جو پس ماندہ اور غریبوں کی محنت سے اپنے ہاتھ رنگتے اور مذہب کے نام سے عام عربوں کی سادہ لوحی اور توہمات پرستی سے فائدہ اٹھاتے تھے، مکہ کے قریشی تاجر نہ صرف غیر قریشی عوام کو ذلیل سمجھتے تھے بلکہ دولت اور زرداری کے ساتھ ساتھ انہوں نے رنگ اور نسب کے عجیب و غریب تصورات بنا رکھے تھے۔ یہ لوٹ کھسوٹ ہر ذریعہ سے روا رکھی جاتی تھی، مذہب ہو یا سیاست، تجارت ہو یا اجتماع، ان سب کا حاصل یہ ہو گیا تھا کہ قریشی تاجروں کی اس چھوٹی سی جماعت کو اور فروغ ملے۔

قریش کے سربرآوردہ طبقے اگر اسی رو میں بہتے چلے جاتے تو ان کا انجام صاف نظر آ رہا تھا، چنانچہ رسول اللہ صلی علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو انہوں نے سب سے پہلے قریش کی حالت کو سنوارنے کی کوشش کی۔ قریش اگر راہ راست پر آجاتے تو ان کے ذریعہ عربوں کی اصلاح ہو سکتی تھی اور اگر عربوں جیسی جنگ جو اور جری قوم قریش کی قیادت کو مان لیتی تو رسول اللہ صلی علیہ وسلم کا پیغام دوسری قوموں تک پہنچ سکتا تھا، بے شک رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام ساری دنیا کے لیے مبعوث ہوئے تھے اور قرآن کا پیغام سب قوموں کے لیے تھا، لیکن آپ کی بعثت کا پہلا مقصد یہ تھا کہ قریش کی اصلاح و تہذیب ہو جائے تاکہ وہ اس پیغام کو دوسری قوموں تک پہنچانے کا ذریعہ بن سکیں۔ چنانچہ نبی کریم صلی علیہ وسلم کی دو حیثیتیں ہیں، ایک قومی اور دوسری عمومی اور بین الاقوامی۔ آپ کی قومی حیثیت کا مظہر قریش کی قیادت تھی اور آپ کی بعثت کی بین الاقوامیت اور عمومیت کی دلیل یہ ہے کہ اسلام صرف قریش تک محدود نہ رہا بلکہ ان کے ذریعہ عام عربوں تک پہنچا، پھر دوسری قومیں بھی زمرہ اسلام میں داخل ہو گئیں۔ مولانا اپنے اس دعویٰ کی تائید میں شاہ صاحب کا یہ قول نقل فرماتے ہیں۔

”جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں دو خصوصیتیں جمع ہو گئی تھیں، ایک نبوت اور دوسرے ان کے ذریعہ قریش کا برتری اور عزت حاصل کرنا، نبوت تو ہر قوم اور ہر نوع کے لیے عام تھی، سرخ اور کالے سب کے لیے اور مشعل نبوت سے نور حاصل کرنے کے معاملے میں وہ سب برابر تھے۔ (تہذیبات، جلد اول)

مولانا کے خیال میں جب تک بعثت محمدی کی یہ دو حیثیتیں پیش نظر نہ ہوں، اسلام کو صحیح طور پر سمجھنا بڑا مشکل ہے، مورخوں نے غلطی سے ان دونوں حیثیتوں کو اس طرح گڈمڈ کر دیا ہے کہ بعض دفعہ

ان کی باتیں پڑھ کر یہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ اسلام خالص عربی تھا۔ وہ صرف عربوں کے لیے تھا، عربوں نے اسے بلند نام کیا۔ وہ نہ رہے تو اسلام کو بھی زوال آ گیا، اب اگر اسلام کی قسمت میں کچھ اچھے دن لکھے ہیں تو اس کی صورت یہی ہے کہ عرب انھیں اور دوبارہ پھر اس میں جان ڈالیں، گوجھی قوموں نے تلوار سے ڈر کر اسلام قبول کر لیا، لیکن وہ مسلمان ہوئیں تو اپنے ساتھ الحاد و زندقہ کے جرائم بھی لیتی آئیں اور ان کی وجہ سے "حجازی" اسلام کا صاف اور پاکیزہ چشمہ گدلا ہو گیا۔ اس ذہنیت کا یہ نتیجہ تھا کہ عربی زبان کو مقدس مان لیا گیا۔ عربوں کو سب قوموں سے افضل بتایا گیا پھر ان میں سے قریش سب سے ممتاز سمجھے گئے اور قرآن کا دوسری زبانوں میں ترجمہ ممنوع قرار پایا۔ بے سوچے سمجھے قرآن کے عربی متن کی تلاوت کرنا ثواب ٹھہرا اور عربی میں دعائیں مانگنا "اسرع الی الایجابہ" سمجھا گیا، چنانچہ ترکوں کی کمالی تحریک کے خلاف عرب پہلو اسی لغو ذہنیت کا رد عمل ہے اور عباسی عہد میں شعوبی تحریک کے معرض وجود میں آنے کا باعث بھی عربیت کا یہ جھوٹا گھمنڈ تھا۔ مولانا فرماتے ہیں کہ اس وقت ضرورت ہے کہ اسلام اور قرآن کو ان پریشان خیالیوں سے نکالا جائے، بے شک قریش اور عرب کی تاریخی برتری اپنی جگہ مسلم ہے کہ وہ سب سے پہلے اسلام کی عمومی دعوت کا ذریعہ بنے لیکن جہاں تک بعثت محمدی کی عمومیت کا تعلق ہے، سب مسلمان قومیں اس میں مساوی اور یکساں ہیں اور کسی کو دوسرے پر امتیاز نہیں۔ قریش اور عرب کی برتری استحقاق کی بناء پر تھی، اس میں ذات یا نسل کو کوئی دخل نہیں، اسلام جتنا حجازی ہے، اتنا ہی وہ غمی ہے اور اتنا ہی ہندی اور ترکی بن سکتا ہے۔

بعثت محمدی کی قومی حیثیت کی تکمیل تو یوں ہوئی کہ قریش کے ایک ممتاز گروہ نے رسول اللہ کی دعوت کو قبول کیا، چنانچہ یہی لوگ نئی تحریک کے چلانے والے بنے، اس گروہ کو اپنے بھائیوں اور عزیزوں سے جو اس نئی تحریک کے مخالف تھے، لڑنا بھی پڑا۔ یہ مکہ کی رجعت پسند طاقت تھی، بارہ تیرہ سال تک مکہ میں ان دونوں جماعتوں میں بڑے زور کی کشمکش رہی۔ ایک طرف رسول اکرم کی قیادت میں ابو بکر، علی طلحہ، زبیر، سعد بن ابی وقاص، عمر، عثمان، حمزہ، سعید اور مصعب رضوان الہ علیہم وغیرہم نوجوان تھے اور دوسری طرف خود آپ کے حقیقی چچا ابولہب اور دوسرے عمر رسیدہ سردار ابو جہل، ابوسفیان، عتبہ اور ان کے حلقہ بگوش تھے۔ ان رجعت پسندوں کے ہاتھ میں اقتدار تھا وہ اس "بے دین" گروہ کو طرح طرح سے تنگ کرتے جو بلال اور یاسر جیسے لاوارث اور کمزور تھے، ان کو بدنی سزائیں دی جاتیں، جو قریش کے

مولانا نے ایک مرتبہ فرمایا کہ اسلام کا اعلان کرنے کے بعد میں ایک دینی درس گاہ میں رات کو جایا کرتا تھا، صرف دو نوحا پہلا سبق مجھے یوں پڑھایا گیا، "بداں اسعدک الہ" مولوی صاحب نے اس کی تشریح میں فرمایا کہ عربی زبان میں دعا مانگی جائے تو جلد قبول ہوتی ہے اور تائید میں موصوف نے "الدعا بالعربیۃ اسرع الی الایجابہ" کا مشہور قول نقل کیا۔

خاندانوں میں سے تھے، ان کا یہ لوگ مذاق اڑاتے، عام مجلسوں میں ان پر پھبتیاں کتے، اور موقع ملتا تو مار پیٹ بھی کر دیتے، مسلمانوں کا گروہ کو تعداد میں کم تھا اور اگر کھلم کھلا لڑائی تک نوبت پہنچتی تو شاید ان کو ہزیمت ہوتی، لیکن اس کے باوجود عرب میں جہاں کی روایات یہ تھیں کہ ایک شخص ہزار کے مقابلہ میں ڈٹ جاتا اور جان دے دیتا لیکن دوسرے کے ظلم کو برداشت نہ کرتا، خلاف معمول مکہ کے یہ افراد خاموشی سے قریش کے مظالم سہتے اور عمر اور حمزہ ایسے جانباز اور غصہ ور بہادر بھی ہاتھ نہ اٹھاتے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ انقلاب کرنے کے لیے ہمیشہ ایک جماعت کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ جماعت اس وقت تک نہیں بن سکتی جب تک کہ انقلاب کے پیغام کو ان تک نہ پہنچایا جائے۔ صرف پہنچایا نہ جائے بلکہ وہ اس پیغام کو سمجھیں اور ان کے دلوں میں پیغام رنج بھی جائے۔ وہ اس پر ایک عرصہ تک عمل بھی کریں۔ اس راہ میں جو مشکلات پیش آتی ہیں، ان کو برداشت کرنا بھی سیکھیں اور ان امتحانوں میں پڑ کر جب وہ نکلیں تو اس قابل ہوں کہ انقلاب کے لیے اپنی جانیں دے سکیں۔ انقلاب کی تیاری کے زمانے پر عدم تشدد پر عمل کرنا مفید رہتا ہے۔ چنانچہ تاریخ میں اکثر مقدس ہستیوں نے عدم تشدد کی پالیسی پر ایک خاص مدت کے لیے عمل کیا ہے، مگر انسانی فطر کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ محض عدم تشدد سے آخر تک کام نہیں چل سکتا۔ اس لیے ہر انقلابی تحریک کو کبھی نہ کبھی کشت و خون سے بھی واسطہ پڑتا ہے۔ عدم تشدد انقلاب کی تیاری کا دور ہے اور جب انقلاب فعلاً متحقق ہو تو خون ریزی کا ہونا ناگزیر ہوتا ہے۔

مکی زندگی کے بارہ تیرہ سال اس انقلابی جماعت کی تعلیم اور تربیت میں گزرے، ہجرت کے بعد مدینہ میں یہ جماعت جو مکہ میں انقلاب کی پوری تربیت پا چکی تھی، اپنی حکومت بناتی ہے، مدینہ کے وہ لوگ جو ان کے ہم خیال ہو چکے تھے، اس کے انصار بنتے ہیں اور جب مکہ کی رجعت پسند طاقت اس نئی حکومت سے برسر نزع ہوتی ہے تو رسول اللہ اور ان کے ساتھی انقلاب کو بچانے کے لیے میدان رزم میں اترنے پر مجبور ہوتے ہیں، بدر کی جنگ میں اس رجعت پسند طاقت کا زور توڑ دیا جاتا ہے۔ ایک سال کے بعد مکہ والے احد میں اپنی گرتی ہوئی طاقت کو سنبھالنے میں قدرے کامیاب ہوتے ہیں۔ پھر دو سال کے بعد خندق کا واقعہ پیش آتا ہے، اس میں مکہ والوں کے ساتھ عرب کی دوسری رجعت پسند طاقتیں یعنی یہود اور بدو قبائل مل کر مدینہ پر دھاوا کرتے ہیں، لیکن وہ اس مجموعی طاقت سے بھی انقلاب کے مرکز کو سر نہیں کر پائے، یہاں سے ان کا زوال شروع ہوتا ہے اور مدینہ کی انقلابی حکومت بتدریج آگے قدم بڑھاتی ہے، چنانچہ رسول اللہ اور ان کے ساتھیوں کو مکہ سے نکلے آٹھ سال ہی ہوئے تھے کہ قریش کی ساری کی ساری جمعیت نے انقلاب کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے، مکہ کا ختم ہونا تھا کہ عرب کے دوسرے قبائل بھی جوق در جوق مدینہ پہنچنے لگے اور عرب کے اس سرے سے لے کر اس سرے تک

اسلام کا پرچم لہرانے لگا، رسول اکرم صلعم انتقال فرماتے ہیں تو سارا عرب مدینہ کی نئی حکومت اور اسلام کے نئے نظام کو تسلیم کر چکا ہوتا ہے۔

یہ ہے اسلام کے بین الاقوامی انقلاب کی پہلی منزل، رسول اکرم صلعم کی تعلیمات اور فیض صحبت سے اب قریش اور ان کے پیرو، ان کے دوسرے عرب بھائی بند اس قابل ہو گئے تھے کہ وہ اسلام کے پیغام اور اس کی ذمہ داریوں کا بار اٹھا سکتے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ ایک لحاظ سے یہ قدم قریش کی قومیت ہی کی ایک ارتقائی شکل تھی۔ اسلام نے دراصل قریش میں اب تک قومیت کا جو محدود تصور تھا، اسے دوسرے معنی دیئے تھے۔ اسلام نے قریش کی قومیت کو جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے، مٹایا نہیں بلکہ اسے بحال رکھا۔ البتہ اس کا دائرہ وسیع کر دیا، اسلام قومیتوں کا انکار نہیں کرتا، وہ قوموں کے مستقل وجود کو تسلیم کرتا ہے، لیکن اس میں وہ صالح اور غیر صالح قومیت کا امتیاز کرتا ہے، وہ قومیت جو بین الاقوامیت کے منافی ہو وہ اس کے نزدیک بے شک مذموم ہے، لیکن یہ کہ قوم کا وجود ہی سرے سے نہ رہے۔ مولانا کے خیال میں یہ ناممکن ہے اور نہ فطرت اس کو گوارا کرتی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ اسلام نے قریش کے محدود قومی تصور کو یوں بدلا تھا کہ اب دوسری قوموں کے اچھے آدمی بھی قریش کی اس اصلاح شدہ قومیت میں شامل ہو سکتے تھے۔ اسلام سے پہلے قریش کی قومیت صرف مکہ کی چار دیواری تک محدود تھی اور خاص مکہ میں بھی قریش الگ تھے اور غیر قریشی عناصر جن کی تعداد اغلباً قریش سے کچھ کم نہ تھی، الگ۔ مولانا کے خیال میں اگر قریش ابوہلب اور ابو جہل کے قومی تصور پر چلتے رہتے اور خون اور نسل ہی کو اپنے محدود معنوں میں معیار قومیت مانتے چلے جاتے تو قریش کا وجود خطرے میں پڑ جاتا، اس کے برعکس اسلام نے اس قومی تصور میں اتنی وسعت اور صلاحیت پیدا کر دی کہ ایک طرف وہ تصور ساری عرب قوم پر مشتمل ہو گیا اور دوسری طرف اور قوموں کے اچھے افراد بھی اس قومیت کے انسانی پہلوؤں کو اپنانے کے لیے تیار ہو گئے، قریش اس نئی قومیت کے ترجمان اور قائد تھے اور عرب اور دوسرے لوگ ان کے ساتھی اور سپاہی۔

اس طرح قریش کا عرب کی سیادت کی سعادت حاصل کرنا بعثت محمدی کا لازمی نتیجہ بن گیا، چنانچہ رسول اللہ کے انتقال کے فوراً بعد سقیفہ بنی ساعدہ میں آپ کا جانشین چنے کے لیے مدینہ کے انصار کا اجتماع ہوا۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ خلیفہ انصار میں سے ہو، ان میں آپس میں مشورے ہو ہی رہے تھے کہ حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت ابو عبیدہؓ وہاں پہنچ جاتے ہیں، یہ تینوں بزرگ مکہ کی ابتدائی جماعت کے نامور افراد تھے۔ اس موقع پر طرفین کی طرف سے جو تقریریں ہوئیں، ان کی تفصیلات میں جانے کی یہاں ضرورت نہیں، تمام بحث و مناظرہ کا آخر میں نتیجہ یہ نکلا کہ انصار نے ”الائمة من القریش“

کا اصول قبول کر لیا، یعنی قیادت اور امارت قریش کی ہو لیکن حضرت ابو بکر نے ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا کہ امیر ہم میں سے ہوں گے اور وزیر تم میں سے۔ ہم انقلاب کی قیادت کریں گے اور تم ہمارے دست و بازو ہو گئے، بے شک اس کی وجہ کوئی خاندانی اعزاز یا نسبی امتیاز نہ تھا جیسا کہ بعد میں غرض مندوں نے سمجھ لیا، بلکہ بات یہ تھی کہ مکہ میں اسلام سے بہت پہلے قبضی کے زمانے سے ہی قریش کی ایک ایسی نسل پل رہی تھی جو عرب کی قیادت کی صلاحیت رکھتی تھی، یہ لوگ اپنے آپ کو حضرت ابراہیم کے خاندان میں سے سمجھتے تھے اپنے مذہب کو دین ابراہیمی مانتے تھے، چونکہ حضرت ابراہیم اسمعیلی عربوں کے ورثہ اعلیٰ تھے اور بنی اسرائیل بھی انہیں کو اپنا بڑا جانتے تھے، نیز غیر اسمعیلی یعنی قحطانی عرب بھی اسمعیلیوں سے کھل مل رہے تھے۔ اس لیے ان روایات نے قریش کے ذہنوں میں بڑی وسعت کا امکان پیدا کر دیا تھا۔ دوسری طرف قریش پڑوس کی ترقی یافتہ قوموں اور ان کے مذاہب سے بھی آشنا تھے اور اپنے آپ کو ان سے کسی طرح بھی کم نہ سمجھتے تھے، ان کا پھر تجارتی سفروں کی وجہ سے ان ممالک میں آنا جانا بھی تھا، نیز مکہ میں رہتے ہوئے جو عربوں کا دینی اجتماعی اور ایک حد تک تجارتی مرکز بھی تھا، وہ عربوں میں بھی غیر معمولی امتیاز حاصل کر چکے تھے۔ ان داخلی اور خارجی اسباب کی بنا پر قریش میں سے ”ائمہ“ کا ہونا ایک قدرتی امر تھا۔ چنانچہ سقیفہ بنی ساعدہ میں حضرت ابو بکرؓ نے قریش میں سے ہی امیر کو چننے کے حق میں جہاں اور دلیلیں دی تھیں، اس سلسلے میں یہ بھی فرمایا تھا کہ عرب قریش کے سوا کسی اور کی امارت کو قبول کرنے کے لیے ہرگز تیار نہ ہوں گے۔ غرض قریش کی یہ خصوصیت اور صلاحیتوں کے سبب سے تھی جب تک وہ ان صلاحیتوں کے مالک رہے، مشرق اور مغرب میں ان کی حکومت رہی، لیکن جب انہوں نے یہ صلاحیتیں کھو دیں تو کوئی ان کا پرسان حال نہ رہا۔

حضرت ابو بکرؓ نے سقیفہ بنی ساعدہ میں قریش کی سیادت کے حق میں جو دلیل دی تھی، بعد کے تاریخی واقعات نے بھی ان کے اس دعویٰ کی تصدیق کی، چنانچہ عربوں کی جہاں کہیں حکومتیں بنیں۔ ”قریش کے خاندان کے لوگ ہی ان میں برسر اقتدار آئے۔ خلافت راشدہ کے چاروں خلفاء قریش میں سے تھے۔ انصار کا دعویٰ رد کر دیا گیا۔ مسلمانہ بری طرح ناکام ہوا، اموی قریش ہی کی ایک شاخ تھی، امویوں کے وارث عباسی بنے، وہ بھی قریش تھے، اسپین میں جو عربی سلطنت قائم ہوئی اس کے بانی اور صاحب تخت و اقتدار امویوں کا ایک خاندان تھا، آخر میں قریش کی فاطمی شاخ کو مصر میں اپنی خلافت قائم کرنے کا موقع مل گیا، امویوں، عباسیوں اور فاطمیوں کا دور دورہ ختم ہوا تو تو عرب بھی مسند حکومت سے برطرف کر دیئے گئے، اور ان کی جگہ مسلمانوں کی دوسری قوموں نے لے لی۔

قریش کی سیادت کے متعلق کم و بیش اسی قسم کا ایک واقعہ امیر معاویہؓ سے بھی مروی ہے۔

حضرت عثمانؓ کے آخری سالوں میں چند شورہ پشت اور مفسد افراد نے مصر، کوفہ اور بصرہ میں شورش پیدا کر دی تھی۔ یہ لوگ حکومت کے خلاف طرح طرح کی افواہیں پھیلاتے اور عوام کو جھوٹے سچے واقعات سنا کر بغاوت پر آمادہ کرتے تھے۔ آخر ان سب کو گرفتار کر کے شام بھیج دیا گیا، وہاں امیر معاویہؓ جیسا بیدار مغز سیاست دان اور مدبر حاکم تھا۔ انہوں نے ان سب کو اپنے سامنے بلایا اور ان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”میں جانتا ہوں کہ ان سب شرارتوں کے پیچھے کون سی طاقت کام کر رہی ہے اور تم کیوں فتنہ و فساد کی آگ کو ہوادے رہے ہو۔ دراصل بات یہ ہے کہ تم قریش کی امارت اور سیادت سے جلتے ہو اور تمہیں اس کے اقبال اور عروج پر حسد ہے، لیکن کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ اب تک جو کچھ تمہیں ملا ہے، یہ سب قریش کی بدولت ہے، اگر قریش نہ ہوتے تو تم بکریوں کے ریوڑ چراتے یا اونٹوں کو ہٹکایا کرتے۔ قریش نے تمہیں ان نعمتوں کا مالک بنایا اور آج تم ہو کر قریش ہی کے خلاف شورش برپا کر رہے ہو۔“

قریش پر دنیا میں بعثت محمدیؐ کو نافذ العمل کرنے کا بار ڈالا گیا تھا اور اس میں شک نہیں کہ انہوں نے اس بار کا اپنے آپ کو پورا اہل ثابت کیا، چنانچہ ان کے ذریعہ ہی چین سے لے کر فرانس تک کی بسنے والی خدا کی مخلوق اسلام سے متعارف ہوئی، اس سلسلے میں سب سے پہلے قریش خود آپس میں لڑے اور ان کی انقلابی جماعت نے اپنے رجعت پسند بھائی بندوں کو ٹھکانے لگا دیا۔ ہمارے خیال میں ابو جہل، ابولہب اور اس قبیل کے نامور قریش سرداروں کو رسول اللہ کی عظمت و دیانت سے شاید انکار نہ تھا اور سکون و اطمینان کی گھڑیوں میں وہ آپ کو نعوذ باللہ کاذب اور مفتری بھی نہ کہتے ہوں گے لیکن ان کو اعتراض یہ تھا کہ بلالؓ ایک حبشی زادہ محض لا الہ الا اللہ کہنے سے ابو بکرؓ، عثمانؓ اور زبیرؓ جیسے اصیل و نجیب قریشیوں کا کس طرح بھائی بن سکتا ہے۔ رؤسائے مکہ کی نظروں میں جو چیز ناممکن تھی، قریش کی اس جماعت نے اسے امر واقعہ کر دکھایا۔ ابو جہل اور ابولہب کا معیار قومیت غلط قرار دیا گیا، اور فتح مکہ کے دن قریش کی خاندانی نخوت اور نسبی غرور جو ان کے لیے حقیقت میں جان کا لاگو بن رہا تھا، سب خاک میں مل گیا، کعبہ کی چھت سے بلالؓ کی آواز مکہ کی فضا میں بلند ہوئی، قریش کا خون اور نسل کی برتری کا محدود قومی تصور جو کعبہ کے تین سو ساٹھ بتوں کے ذریعہ سے عوام و خواص سے منوایا جاتا تھا، بتوں کے ساتھ رو بھی رخصت ہو گیا اور اس کے بجائے ایک نیا قومی تصور معرض وجود میں آیا جس میں جو کوئی بھی آریش کے افکار و خیالات سے متفق ہوتا، باسانی سما سکتا تھا۔ اسلام کی دعوت، لا قومیت کی دعوت نہیں تھی بلکہ اس نے قریش کی قومیت کو ایسی شکل دے دی کہ وہ بین الاقوامیت کے مرکز بن گئے۔ اسی طرح رسول اللہ صلعم سے پہلے عرب کے دوسرے قبائل کا تصور قومیت بھی مکہ کے قریشیوں کی طرح بہت تنگ

اور ناقص تھا۔ گو بدو عربوں میں حب وطن و قوم کا جذبہ بڑا تیز اور قوی تھا لیکن ان کا وطن اپنے گاؤں یا قصبے، چراگاہ یا نخلستان تک محدود ہوتا اور قوم ان کے نزدیک عبارت تھی اپنے خاندان سے اور اگر خاندان سے ترقی کی تو قبیلہ کو قومیت کا معراج مان لیا اور زیادہ تخیل سے کام لیا، تو بنو ربیعہ، بنو مضر اور بنو قحطان تک پہنچ گئے۔ ان کی یہ ”وطن پروری“ اور ”قوم پرستی“ اس حد کو پہنچ چکی تھی کہ ایک قبیلہ کو دوسرے قبیلہ کا خدا تک تسلیم کرنا منظور نہ تھا۔ چنانچہ ہر ایک نے اپنے اپنے خدا کا الگ الگ بت بنا لیا تھا اور ایک قبیلہ کا دوسرے پر چڑھ دوڑنا قومی، عزت و غیرت کا معیار تھا۔ جب دور کے بھائی ایک قبیلہ کی ترکتازیوں کے تختہ مشن نہ بن سکتے تو ایک دادا کی اولاد آپس میں گتھم گتھا ہو جاتی اور جس طرح قریش کی محدود قومیت انہیں زوال کی طرف لے جا رہی تھی، اسی طرح ان عربوں کے محدود قومی تصورات انہیں آپس میں لڑا لڑا کر فنا کرنے کے درپے تھے۔

مکہ کے سر ہونے کے بعد جب قریش کے بچے کچے عناصر بھی نئی جماعت میں شامل ہو گئے تو یہ جماعت اتنی قوی ہو گئی کہ عرب کی سر زمین میں کوئی عرب، یہودی یا عیسائی قبیلہ ان کے مقابلہ کی تاب نہ لاسکتا تھا، چنانچہ عرب کے تمام قبائل اپنے قبیلہ یا قوم پرستیوں سے تائب ہو کر قریش کی نئی قومیت کا حصہ بن گئے اور سب نے قریش کی قیادت کو تسلیم کر لیا۔ حجۃ الوداع میں جو رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا آخری حج تھا۔ ایک روایت کے مطابق ایک لاکھ سے زیادہ نفوس جمع تھے۔ سب کی زبانوں سے ”لبیک اہم لبیک“ کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ سب کا ایک خدا، ایک نبی، ایک قوم اور ایک شاہراہ زندگی تھی، لیکن عرب سے رجحیت کے جراثیم ابھی پوری طرح فنا نہیں ہوئے تھے، چنانچہ رسول اللہ کے انتقال فرماتے ہی عرب کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک رد انقلاب کا ہنگامہ برپا ہو گیا۔ مدینہ اور مکہ کی اس جماعت کو دوبارہ عربوں کو بزور شمشیر فتح کرنا پڑا اور انہیں قریش کی قیادت ماننے پر مجبور کیا گیا۔ ارتداد کا یہ طوفان بڑا سخت تھا لیکن انقلابی جماعت کے ایمان اور ہمت سے یہ بلا ٹل گئی۔ عجیب بات یہ ہے کہ ارتداد کے خلاف جو بڑے بڑے معرکے ہوئے ان میں پیش پیش مکہ کے نوجوان قریشی تھے، جن کو اسلام لائے ابھی زیادہ دن نہ گزرے تھے ارتداد حقیقت میں عرب کے بدو قبائل کی رجعت پسندی کا مظاہرہ تھا۔

رسول اللہ کے بعد آپ کے تربیت یافتہ صحابہ آپ کے کاموں کو جاری رکھتے ہیں۔ یہ ”السابقون الاولون“ کی جماعت تھی۔ انہوں نے آپ کے بعد حضرت ابو بکرؓ کو خلیفہ چنا، حضرت ابو بکرؓ کے بعد ان کی رائے سے حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے اور یہی جماعت تھی جنہوں نے بالاتفاق حضرت عثمانؓ کو عمر کی جگہ منتخب کیا تھا۔ حضرت عثمانؓ کی خلافت کے شروع کے چند سالوں تک یہ جماعت متفق اور متحد رہی

اور اس کے بعد ان میں آپس میں اختلافات پیدا ہونے لگے۔ حضرت عثمانؓ شہید کر دیئے گئے اور "السابقون الاولون" کی کل جماعت نے نہیں بلکہ ان کے غالب حصہ نے حضرت علیؓ کو خلیفہ مانا، حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ جو "السابقون" میں سے تھے، انہوں نے حضرت علیؓ کی مخالفت کی اور نتیجہ یہ نکلا کہ "السابقون الاولون" کی یہ جماعت آپس میں لڑنے لگ گئی۔

مسلمانوں کی قومی حکومتوں کا دور

حضرت علیؓ کی شہادت کے ساتھ رسول اللہ کی تربیت یافتہ جماعت کا دور اقتدار ختم ہوتا ہے اور اب عربوں کی قومی حکومت شروع ہوتی ہے۔

مولانا نے اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کہ حضرت عمرؓ کی شہادت تک اسلام کی تحریک پر بین الاقوامیت کا رنگ غالب تھا، لیکن حضرت عمرؓ ایک ایرانی کے ہاتھ سے شہید ہو گئے اور قتل کی سازش میں بعض ایسے ایرانیوں کے نام بھی لیے گئے جو مسلمان ہو چکے تھے اور مدینہ میں مقیم تھے۔ اس طرح کی افواہوں سے مشتعل ہو کر حضرت عمرؓ کے صاحب زادے عبید اللہؓ نے ایک ممتاز ایرانی کو جان سے مار ڈالا تھا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کی شہادت سے ایک رد عمل شروع ہوتا ہے اور عرب یہ محسوس کرتے ہیں کہ خاص مرکز اسلام میں عین مسجد میں نماز کے وقت ان کا امام ایک ایرانی کے ہاتھ سے قتل ہو جاتا ہے، قدرتی بات تھی کہ اس سے عربوں کو ایرانیوں پر اعتماد نہ رہتا۔ وہ انہیں شک و شبہ کی نظروں سے دیکھنے لگتے۔ لازمی طور پر اسلام کی حفاظت اب عربوں کا قومی سوال بن گیا اور لامحالہ اس کا اثر حکومت کی روش پر بھی پڑا۔ گو اسلام کی بین الاقوامیت اپنی جگہ پر بدستور قائم رہی، لیکن عملاً عربوں نے آہستہ آہستہ اس بین الاقوامیت کو اپنے قومی دائرہ میں لے لیا۔ کیونکہ اس وقت اس کے بقاء کی صورت ممکن تھی۔ اگر عرب اس کو اپنا قومی مسئلہ نہ بنا لیتے تو اسلام کی بین الاقوامیت مختلف عناصر کی کھینچا تانی کے ہاتھوں کبھی منڈھے نہ چڑھ سکتی۔

مولانا فرماتے ہیں کہ جب اسلام کی تحریک کی حفاظت عربوں نے اپنا قومی مسئلہ بنا لیا تو ظاہر ہے کہ اسلام سے پہلے قریش کے جس خاندان کے ہاتھ میں اقتدار تھا۔ وہ برسر عروج ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ عربوں کی قومی حکومت کی قیادت بنو امیہ کو ملی۔ مولانا کے خیال میں بنو امیہ اور بنو ہاشم کا جھگڑا دو خاندانوں کا تھا، ہر خاندان یہ چاہتا تھا کہ عربوں کی زمام اقتدار اسے ملے، مادی حالات بنو امیہ کے حق میں تھے وہ کامیاب ہوئے اور بنو ہاشم ناکام رہے۔

امیر معاویہ کی حکومت مسلمان عربوں کی قومی حکومت کا بہترین نمونہ تھا، شاید بعض کے نزدیک امیر معاویہ اسلام کے بہت بڑے آدمی نہ ہوں، لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ مسلمان عربوں کے

بہت بڑے آدمی تھے۔ مولانا نے کہا کہ ایک دفعہ عبداللہ بن عمر نے فرمایا تھا کہ حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ تو بڑے ہیں لیکن معاویہ بھی بڑے ہیں، کسی نے کہا کہ عمرؓ سے بھی بڑے، آپ نے فرمایا کہ ابو بکرؓ اور عمرؓ اور ہیں اور معاویہ کچھ اور ہے۔

عام طور پر عربوں کا رجحان بنو ہاشم کے مقابلہ میں امویوں کی طرف زیادہ تھا اور اس کے اسباب ہیں۔ علوی خاندان رسالت میں ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو دوسرے عربوں سے ممتاز سمجھتے تھے، اس سلسلے میں مولانا نے ایک دلچسپ واقعہ سنایا۔ ایک دفعہ امام شافعیؒ یمن سے پکڑے آئے، ان کے خلاف یہ الزام تھا کہ وہ علویوں کے حامی ہیں اور عباسیوں کے خلاف، جب انہیں خلیفہ ہارون کے سامنے پیش کیا گیا تو انہوں نے فرمایا۔ امیر المؤمنین! میری بات غور سے سنئے، ایک شخص کے دو بھائی ہیں، ایک اسے بھائی کے برابر سمجھتا ہے اور دوسرا غلام، بھلا آپ ہی بتائیے کہ یہ شخص ان دونوں میں کس کو ترجیح دے گا۔ ہارون نے سن کر کہا کہ انہیں رہا کر دو۔

مسلمانوں کی ساری تاریخ میں آپ کو کہیں بھی عرب بحیثیت قوم علوی امارات کی حمایت کرتے نظر نہ آئیں گے۔ ماموں کے عہد کا واقعہ ہے کہ جب وہ مرو میں تھا اور بغداد میں اس کی غیر موجودگی کی وجہ سے بڑی شورش پیدا ہو گئی تھی اور لوگ سمجھتے تھے کہ ماموں ایک ایرانی وزیر فضل بن سہیل کے ہاتھ میں محض کٹ پتلی ہے۔ چنانچہ اس کی وجہ سے سلطنت کے ہر حصہ میں بغاوتیں بھی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ان دنوں کا ذکر ہے کہ شام میں ایک عرب سردار نے بڑا زور پکڑ لیا تھا اور اس کی سرکوبی کے لیے دارالسلطنت سے جو بھی مہم بھیجی جاتی وہ ناکام رہتی۔ چنانچہ اس کا اقتدار تمام فلسطین اور شام پر ہو گیا۔ اب ضرورت تھی کہ اسے کوئی ایسا شرعی امیر مل جائے جس سے اس کے اقتدار کو جواز کی سند حاصل ہو سکے۔ اسے کسی اموی شہزادہ کو امیر بنانے کا مشورہ دیا گیا۔ اس نے جواب دیا کہ جن کے ہاتھ سے ایک دفعہ اقتدار جاتا رہے پھر وہ دوبارہ اس اقتدار کو نہیں پایا کرتے۔ بعد میں علوی کو خلیفہ بنانے کی رائے دی گئی۔ عرب سردار نے کہا کہ میرا دماغ خراب ہو گیا ہے کہ ایک ایسے شخص کو امیر بناؤں، جو مجھے غلام اور خود کو آقا سمجھے۔ دراصل میں تو ماموں ہی کو مانتا ہوں، مجھے اگر اختلاف ہے تو اس کی موجودہ پالیسی سے ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ جب ”السابقون الاولون“ کا عہد ختم ہو گیا اور اسلام کی بین الاقوامی تحریک کو چلانے والی اس وقت کوئی ایسی جماعت موجود نہ تھی جو سب قوموں کی نمائندہ ہوتی بلکہ اس وقت تک تو عربوں کے سوا کسی دوسری قوم نے بحیثیت مجموعی اسلام کو قبول بھی نہ کیا تھا اور فرداً فرداً اگر کوئی غیر عرب گروہ اس میں شامل ہوا بھی تھا، تو حضرت عمرؓ کے واقعہ کے بعد اس سے اعتماد اٹھ گیا۔ ان حالات

میں یقیناً عرب ہی اس تحریک کے محافظ اور علم بردار بن سکتے تھے۔ اس دور میں اسلام کی بین الاقوامی تحریک عام عربوں کے لیے قومی تحریک بن گئی اور اس کی حفاظت اور بقاء ان کی قوم کی موت اور زندگی کا سوال ہو گیا۔ مثلاً آج اس جنگ میں دیکھئے جمہوریت کسی قوم کے لیے خاص نہیں ہے، لیکن اس وقت برطانوی قوم کے لیے جمہوریت ایک قومی مسئلہ بن گیا ہے۔ اب اگر برطانیہ والوں کو شکست ہو جائے تو ان کے ساتھ جمہوریت بھی فنا ہوتی ہے۔ چنانچہ برطانیہ والے بیک وقت اپنی قوم کے لیے بھی لڑ رہے ہیں اور جمہوریت کی حفاظت و بقاء کے لیے بھی۔ بعینہ یہی روس کا حال ہے۔ اشتراکیت کسی معنی میں بھی اصولاً ایک قوم یا ملک کی تحریک نہیں لیکن ہٹلر نے روس پر جب حملہ کیا تو سٹالن نے روسیوں سے مادر وطن کے نام سے لڑنے کو کہا کہ اور ان کو بتایا کہ نازی درندوں سے اپنے گھروں اور بال بچوں کو بچاؤ، کیونکہ اگر روس بچ گیا تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اشتراکیت بچ گئی، بات یہ ہے کہ کوئی نظام محض خلا میں نہیں رہتا۔ وہ اس دنیا میں کوئی نہ کوئی عملی شکل اختیار کرتا ہے، چنانچہ جب اس عملی شکل پر زد آئے تو وہ نظام بھی خطرے میں پڑ جاتا ہے، اس لیے اس عملی شکل کی حفاظت بعض دفعہ کل نظام کی حفاظت کے مرادف بن جاتی ہے۔

خلاف راشدہ کے بعد امویوں کا برسراقتدار آنا حقیقت میں اسلامی اصولوں سے کسی قسم کی بغاوت نہ تھی۔ بلکہ اموی دور، اسلام کی بین الاقوامی تحریک کے ارتقاء کی ایک لازمی کڑی کا حکم رکھتا ہے۔ مولانا کے خیال میں ہمارے تاریخ نگاروں نے بنو امیہ کے ساتھ انصاف نہیں کیا اور بنو امیہ کے سیاسی مخالفوں نے بھی جو بعد میں ان کے تحت و تاج کے وارث بنے، انہیں بدنام کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا، مولانا فرماتے ہیں کہ پہلے ہم بھی بنو امیہ کے خلاف اپنے مورخوں کی باتیں پڑھ کر متاثر ہو جاتے تھے لیکن اب جو ہم نے دنیا کی انقلابی تحریکوں کا بغور مطالعہ کیا اور ایک انقلابی تحریک کو جن مراحل میں سے گزرنا پڑتا ہے، ان کو جانا، تو ہم پر اموی دور کی اصل حقیقت واضح ہو گئی، جس زمانے میں بنو امیہ کے خلفاء سلطنتوں کے مالک ہوئے، اس زمانے میں بادشاہ اپنے آپ کو اور اپنے خاندان کو مسؤلیت سے بالا سمجھتے تھے، لیکن یہ عدم مسؤلیت صرف شخصی اور نجی زندگی تک محدود ہوتی، جہاں تک قوم اور ملک پر حکومت کا تعلق تھا، اس کے لیے ایک معین دستور اور قانون تھا اور جو بادشاہ یا فرماں روا اس مسلمہ دستور کی خلاف ورزی کرتا، اس کی سلطنت زیادہ دیر قائم نہ رہ سکتی، بد قسمتی سے ہمارے تاریخ نگاروں نے فرماں رواؤں کے ذاتی حالات اور خانگی زندگی کے واقعات کو تاریخ میں ضرور سے زیادہ اہمیت دی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تاریخ کی صحیح حیثیت ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ مثال کے طور پر ہندوستان کے مغل شہنشاہ جہانگیر کو دیکھیے وہ شراب کا بری طرح سے رسیا تھا لیکن اس کے یہ معنی تو نہیں تھے کہ وہ سلطنت

کے انتظام والے انصاف سے بے پروا ہو گیا تھا، چنانچہ عدل جہانگیری آج تک ضرب المثل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، ہمارے مورخوں کو بادشاہوں کے پوست کندہ حالات کریدنے کی لت پڑ گئی تھی اور اس سلسلے میں انہوں نے فرضی یا حقیقی روایات کا ایک طومار کھڑا کر دیا۔

مولانا کے نزدیک حضرت عثمانؓ کے آخری زمانے اور حضرت علیؓ کی خلافت کے دوران میں مسلمانوں میں جو خانہ جنگیاں ہوئیں انہیں یہ سمجھنا کہ وہ محض ایک یہودی مفسد یا چند بدطیبت منافقوں کی سازشوں کا نتیجہ تھا، ٹھیک نہیں، خود ہی انصاف فرمائیے کہ ایک طرف تو یہ کہا جاتا ہے کہ اسلام کا نظام سب سے برتر اور اعلیٰ ہے اور جن بزرگوں نے اس نظام کو عملی شکل دی، وہ دنیا کے بہترین لوگ تھے، اگر یہ صحیح ہے اور ہم مانتے ہیں کہ یہ بالکل صحیح اور درست ہے تو کیسے ممکن تھا کہ ایک یہودی یا چند نابکار اس نظام کو اتنی آسانی سے درہم برہم کر دیتے، اگر بفرض محال یہ مان لیا جائے تو لامحالہ یہ کہنا پڑے گا کہ اسلام کا نظام اور اس کے اولین کارفرما نعوذ باللہ اتنی صلاحیت بھی نہ رکھتے تھے کہ ان کا لگایا ہوا پودا ایک معمولی سے جھکڑ کا مقابلہ کر سکتا، کسی نظام کی برتری اور اس کے نافذ کرنے والوں کی عظمت کی دلیل یہ ہوتی ہے کہ وہ نظام ان نافذ کرنے والوں کے بعد بھی قائم رہے اور صرف قائم نہ رہے بلکہ اور ترقی کرتا جائے، ورنہ تاریخ میں بارہا یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ کسی قوم میں کوئی غیر معمولی شخصیت پیدا ہوئی۔ اور اس نے ایک مختصر سی مدت میں قوم کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا، لیکن جو وہی وہ شخصیت دنیا سے رخصت ہوئی، اس کے ساتھ اس کی حاصل کی ہوئی عظمت بھی ختم ہو گئی، خدا نہ کرے اگر تاریخ اسلام کے ان نظریات کو مان لیا جائے جو آئے دن ہمارے بڑے بڑے ”ارباب علم و فضل“ پیش کرتے ہیں اور اپنے ان نظریات کی بناء پر دنیا سے یہ حسن ظن رکھتے ہیں کہ وہ ان کے نظام کو سب نظاموں سے افضل اور مفید تر مان لے گی، جو بقول ان کے صرف تیس برس تک ٹھیک طرح چلا اور جس کے ان تیس برسوں کے بھی آخری دس سال آپس کی لڑائیوں اور خون ریزیوں میں گزرے تو اسلام کے ساتھ اس سے بڑھ کر کیا دشمنی ہوگی۔ مولانا فرماتے ہیں کہ (Civil War) یا خانہ جنگی ہر انقلاب کا ایک لازمی نتیجہ ہوتا ہے۔ بات یہ ہے کہ انقلاب کے ہنگامے میں ہر مزاج اور ہر رجحان کے آدمی باہم مل جاتے ہیں، ان کا یہ اتحاد داخلی سے زیادہ خارجی اسباب کی بنا پر ہوتا ہے۔ انہیں چونکہ مخالف طاقتوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے اور مثل مشہور ہے کہ دوسروں کی دشمنی اور عداوت ناہم جنسوں کو بھی اکٹھا کر دیتی ہے، چنانچہ ہر خیال کے آدمی جن کا نصب العین انقلاب ہوتا ہے، اس جماعت میں شریک ہو جاتے ہیں۔ انقلاب کی کشمکش میں جہاں ہر شخص کو مرنے مارنے کے سوا اور کوئی کام نہیں ہوتا، طبیعتوں کے یہ اختلافات زیادہ ابھرنے نہیں پاتے اور جماعت میں یک جہتی قائم رہتی ہے، لیکن جو نہیں مخالف تو تیس ختم ہو جاتی ہیں اور سامنے کوئی فوری اور سخت خطرہ نہیں رہتا، تو پھر

دبے ہوئے جذبات ابھرتے ہیں، شروع شروع میں نظری اختلافات ہوتے ہیں، پھر ہر خیال کا ایک گروہ بن جاتا ہے اور آخر نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ خود انقلابی جماعت آپس میں پھٹ جاتی ہے اور دوسروں سے لڑنے کے بجائے یہ باہم لڑنے لگ جاتے ہیں۔ دنیا میں جہاں بھی انقلاب ہوا، ہمیشہ ہنگامہ انقلاب کے سرد پڑتے ہی وہاں خانہ جنگی شروع ہو گئی، یہ خانہ جنگی انتشار یا زوال کی علامت نہیں ہوتی بلکہ اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ ایک کام کرنے کے متعلق مختلف رائیں ہو جاتی ہیں، اب اگر ہر رائے کو مان لیا جائے تو جماعت کا شیرازہ بکھر جائے گا، اس لیے ضرورت پڑتی ہے کہ ایک رائے والے اقتدار کی باگ ڈور سنبھالیں، لیکن دوسرا فریق بھی اپنی رائے کو صحیح سمجھتا ہے اور دوسرے کی دلیل و منطق سے وہ قائل نہیں ہوتا۔ اس لیے لازمی طور پر تلوار سے معاملہ کو نمٹانا پڑتا ہے۔ پارلیمنٹری نظام میں یہ جھگڑا عام انتخاب کے ذریعے طے ہو جاتا ہے اور تلواروں کے بجائے ووٹوں سے جمہور فیصلہ کر دیتے ہیں کہ کونسا فریق برسر اقتدار ہو، ہارنے والی جماعت اس فیصلے کو تسلیم کر لیتی ہے لیکن غالب فریق شکست خوردہ جماعت کو خارج از بحث نہیں کر دیتا، بلکہ اس کو شریک حکومت بناتا ہے، اس سے مشورے لیتا ہے اور بعض دفعہ اگر ان کا مشورہ صحیح سمجھے تو اسے قبول بھی کر لیتا ہے، ہارنے والی جماعت غالب فریق کی حکومت صرف اس لیے تسلیم کر لیتی ہے کہ اسے یہ امید ہوتی ہے کہ سال، دو سال یا پانچ سال کے بعد ہم پھر جمہور سے استصواب رائے کر سکتے ہیں اور کچھ بعید نہیں کہ اب کے ہم غالب آئیں۔

لیکن یہ یاد رہے کہ پارلیمنٹری نظام صرف امن و امان اور عام حالات ہی میں چل سکتا ہے، اس کے برعکس کسی انقلاب کا ہونا خود اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ ملک کے حالات غیر معمولی تھے، اس لیے باتوں اور راؤں کی بجائے تلواروں سے کام لینا پڑا، اس سے کہیں یہ غلط فہمی نہ ہو کہ انقلابی طبعاً خون آشام ہوتے ہیں، آپ کو سن کر تعجب ہوگا کہ وہ لوگ جن کو اپنی دعوت انقلاب کے سلسلے میں تلوار چلانی پڑی ان میں اکثر ایسے تھے جو بڑے رقیق القلب تھے، وہ بچوں کے ساتھ ہوتے تو بالکل معصوم بچے بن جاتے، وہ طبیعت کے بے حد نرم اور مزاج کے بڑے ٹھنڈے تھے، لیکن ہوا یہ کہ ان کے زمانے کے لوگ دلیل کے بجائے محض تلوار کو حکم اور بیچ مانتے تھے، چنانچہ ان بزرگوں کو مجبوراً تلوار بے نیام کرنی پڑی اور جب انقلاب میں تلوار چلی اور تلوار ہی حکم ٹھہری تو ظاہر ہے انقلاب کے بعد خود انقلابی جماعت میں جو اختلاف ہوگا، اس کا فیصلہ بھی تلوار سے کیا جائے گا، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، امیر معاویہؓ اور اس عہد کی دوسری لڑائیاں دراصل دوراؤں کا تصادم تھا، عام حالات ہوتے تو دونوں جماعتوں میں ووٹوں کے ذریعہ فیصلہ ہو جاتا، لیکن وہ زمانہ اور تھا، ہر شخص شمشیر بند تھا اور اس کی رائے کا اظہار شمشیر ہی سے ہوتا تھا۔

بے شک رسول اللہ صلعم کے بڑے ممتاز اور قریبی صحابہ میں تلوار چلی اور دونوں طرف سے بے دریغ خون بہایا گیا۔ اسلام کے مخالف اس پر ہنستے ہیں اور جو مسلمان ہیں وہ اس کی عجیب عجیب تاویلیں کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں رسول اللہ کی پیش گوئیاں بیان کرتے ہیں، دبی زبان سے کچھ کہتے ہیں، تو بعد میں جو بات کہی تھی، اسے ان کہی بنانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اگر اسلام کو ایک انقلابی تحریک کی نظر سے دیکھا جائے تو سارے معاملات واضح ہو جاتے ہیں، کسی کو برا بھلا کہنے کی ضرورت بھی نہیں پڑتی اور دل میں کچھ اور اور زبان اور قلموں سے کچھ اور کہنے اور لکھنے کی بھی حاجت نہیں رہتی۔

مولانا فرماتے ہیں کہ ایران، شام اور مصر فتح کرنے اور کسریٰ کو ختم اور قیصر کو ایشیائی مملکت سے محروم کرنے کے بعد عربوں کا انقلابی جوش قدرے ٹھنڈا پڑ گیا تھا، اب حالت یہ تھی کہ ایک بدو مدینے سے اونٹ پر سوار ہوتا، تو اسلامی سلطنت کی آخری حد تک پہنچتے پہنچتے اس کا دم ختم ہو جاتا۔ پہلے عرب اپنے آپ کو مخالف قوتوں میں گھرا ہوا پاتے تھے اور ہر طرف ان کے ایسے دشمن بھی موجود تھے جن کا سر کرنا ضروری تھا، چنانچہ قدرتی طور پر اس زمانے میں ان کی طبیعتوں کا انقلابی رجحان پورے عروج پر تھا، لیکن جب انہیں اتنی بڑی سلطنت مل گئی اور ان کے سامنے کوئی فوری خطرہ بھی نہ رہا تو ظاہر ہے کہ اس جوش و خروش میں بھی کمی آگئی، مولانا کے نزدیک اگر عربوں میں اس وقت واقعی انقلاب کا پہلا سا زور ہوتا تو حضرت علیؑ جیسا اور لو العزم خلیفہ کبھی ناکام نہ رہتا۔

جب کوئی قوم انقلاب کی اس منزل پر پہنچتی ہے تو اس کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ نئے حالات کے مطابق اپنے لائحہ عمل کو نیا رنگ دے، شروع شروع میں تو قوم کے سارے کے سارے فرد انقلاب کے سپاہی ہوتے ہیں اور اگر کسی سبب سے حرب و ضرب کا سلسلہ رک جائے تو ان میں آپس میں لڑائیاں چھڑ جاتی ہیں، حضرت عثمانؓ کے زمانے میں یہی ہوا، امیر معاویہؓ نے اس بات کو سمجھا۔ انہوں نے اس انقلاب کو قومی شکل دے دی اور عرب بحیثیت قوم اس کے حامل اور محافظ بن گئے، چنانچہ امیر معاویہؓ نے دمشق کو پایہ تخت بنایا، اپنا بحری بیڑہ تیار کیا اور عربوں کو نئی فتوحات کی طرف متوجہ کر دیا۔ امیر معاویہؓ کی اس سیاست اور دانش مندی کا نتیجہ تھا کہ وہ عرب جو آپس میں لڑ لڑ کر فنا ہو رہے تھے بیس سال تک پھر متحد و متفق ہو گئے اور خشکی و تری میں ان کی فوجیں اور آگے بڑھتی چلی گئیں۔

ہم نے بنو امیہ کی غلطیوں کو تو خوب اچھالا، لیکن ان کی حکومت کی جو اچھائیاں تھیں ان کو اعتراف کرنے میں بخل سے کام لیا، بے شک امویوں نے اسلامی حکومت کو قومی اور عربی رنگ دیا تھا، لیکن انہوں نے اسلام کے بین الاقوامی فکر کو اپنی قومی حکومت کے تابع نہ بنایا، چنانچہ عہد اموی میں اسلام کا سیاسی مرکز دمشق تھا لیکن ذہنی اور علمی مرکز مدینہ ہی رہا۔ دوسرے لفظوں میں اسلامی فکر کی بین

الاقوامیت بحال رہی، بے شک حکومت میں غیر عربوں کو خواہ وہ مسلمان ہی ہوتے، شریک نہ کیا جاتا اور عربوں کے حکمران طبقے غیر عربی مسلمانوں کو ایک حد تک نفرت کی نگاہ سے بھی دیکھتے اور اگر موقع ملتا تو انہیں ذلیل بھی کرتے، عراق کے مشہور والی حجاج کا واقعہ ہے کہ اسے خبر ملی کہ ایک غیر عرب مسلمان نے ایک عرب عورت سے شادی کر لی ہے، وہ پکڑ منگوا لیا گیا۔ اس کی داڑھی مونچھ موٹھہ کر گدھے پر سوار کیا اور اسے سارے شہر میں گھمایا اور اعلان کیا کہ یہ سزا ہے جو غیر عرب ہو کر عربوں کی برابری کرے، بعض عرب والی تو یہاں تک کرتے تھے کہ اگر غیر عرب مسلمان ہو جاتے تو ان کو جزیہ دینے پر مجبور کیا کرتے۔

ایک طرف تو حکمران طبقوں کا یہ وطیرہ تھا اور دوسری طرف اسلام کے اثرات رنگ، نسل اور خاندان کے ان غلط امتیازات کو مٹا رہے تھے، سیاست وقت عرب اور غیر عرب کی تفریق پیدا کرتی اور علم اور مذہب اس تفریق کی بنیادوں کو اندر ہی اندر سے کھوکھلا کرتا جاتا، یہ صحیح ہے کہ اموی حکومت کے ایوانوں میں غیر عرب مسلمانوں کو بار نہ ملتا تھا، لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ حکومت کے علاوہ جماعتی اور تمدنی زندگی کے جتنے بھی ادارے تھے، ان سب میں غیر عربی مسلمان پیش پیش تھے اور جمہور ان کی بڑی عزت اور احترام کرتے تھے۔ اسی زمانے کی بات ہے کہ حضرت حسن جو بصری کے نام سے تاریخ میں مشہور ہیں اور وہ غیر عرب تھے، اپنی تقریروں میں اموی حکومت پر نکتہ چینی کرتے، ہزاروں کا مجمع ہوتا اور کسی کی مجال نہ تھی کہ ان کی اذیت کے درپے ہوتا، ایک موقع پر یزید بن مہلب نے اموی خلیفہ سے بغاوت کی، تمام اہل عراق نے اس کا ساتھ دیا، حضرت حسن بصری سے پوچھا گیا، فرمانے لگے کہ کل تک تو یہ شخص بنو امیہ کا نام لے کر ہم پر ظلم کرتا تھا اور آج ہمیں ان کے خلاف لڑنے کو کہتا ہے اور انہیں ظالم بتایا ہے، یہ بات مشہور ہوئی تو کسی نے یزید بن مہلب سے کہا کہ اگر اجازت ہو تو میں ان کا صفایا کروں، یزید نے کہا کہ خبردار ایسا نہ کرنا، یہ ہزاروں کی جماعت جو میرے ارد گرد جمع ہے، تتر بتر ہو جائے گی۔

ہشام یا شاید کسی اور اموی خلیفہ کا ذکر ہے کہ اس نے اپنے ایک مصاحب سے پوچھا کہ اس وقت بصرہ کا سب سے بڑا عالم کون ہے، مصاحب نے اس کا نام لیا، خلیفہ نے پوچھا وہ عرب ہے یا غیر عرب؟ وہ غیر عرب تھا، پھر پوچھا کہ کوفہ میں کون سا بڑا عالم ہے؟ پھر فسطاط یمن، مکہ، مدینہ اور دمشق کا پوچھا؟ راوی کا بیان ہے کہ ان تمام شہروں کے سب سے ممتاز اہل علم غیر عربوں میں سے تھے، خلیفہ ایک ایک کا نام پوچھتا اور جب معلوم ہوتا کہ وہ غیر عرب ہیں تو جزبہ ہوتا، مصاحب کہتا ہے کہ آخری شہر کا ذکر آیا، تو گو میں نام تو ایک غیر عرب کا لینا چاہتا تھا لیکن جب خلیفہ کی برہمی دیکھی تو میں نے عمد دوسرے عالم کا نام لے دیا، خلیفہ نے اس کے متعلق پوچھا تو میں نے بتایا کہ وہ عرب ہے، ان مثالوں سے پتہ چلتا ہے کہ اموی نظام حکومت ایک طرف تو غیر عربی مسلمانوں کو پس پشت ڈالنے کی کوشش کرتا تھا اور دوسری

طرف اس نظام سے بالواسطہ عام زندگی میں غیر عربی مسلمانوں کو غیر معمولی اہمیت اور قوت حاصل ہو رہی تھی۔

غرض اموی حکومت کی سیاست تو بے شک عربی امتیاز کو لیے ہوئے تھی، لیکن اس سیاست سے جو عملی نتائج مرتب ہوئے، وہ مفتوح قوموں کے حق میں بے حد مفید تھے۔ عربی فتوحات نے مفتوح ملکوں کی قوموں کے اوپر کے طبقوں کو جن کے بار کے تلے ان کے عوام بری طرح کچلے جا رہے تھے، ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔ نیز جہاں جہاں عرب فاتح گئے، ان کے ساتھ اسلام بھی گیا، فتوحات کا سیلاب تو آیا اور گزر گیا، لیکن اسلام کے عقائد جس جس زمین میں پہنچے، وہاں کے لوگوں کو ذہنی اور جماعتی زندگیوں کو بدلتے چلے گئے، پہلے کے مذاہب جو بے جان اور بے روح کھلونے بن چکے تھے۔ اسلام کے فکری طوفان کے سامنے خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے۔ پرانی دنیا اپنی تمام فرسودگیوں کے ساتھ رخصت ہوئی اور تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔

اسلام نے اس وقت کی دنیا کو کیسا پایا تھا۔ اور اس کی کیا کاپی پلٹ کر دی۔ اسلام کے اس زریں کارنامے کی صدائے بازگشت دوسروں کی زبان سے سنئے۔ ایم این رائے اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

”اپنی تاریخ کے ابتدائی دور میں وہ ایک آواز تھی جس نے عرب قبائل کو متحد کر دیا، کچھ ہی عرصہ کے بعد اس سیاسی اور مذہبی مرکزیت کے جھنڈے تلے سلطنت روما کے وہ تمام ایشیائی و افریقی صوبے آگے جو قدیم متزلزل نظام سے نکلنا چاہتے تھے۔ عیسائیت میں نہ تو اگلا سا جوش تھا اور نہ اس کی انقلابی اہمیت ہی باقی تھی وہ اپنے کمزور کندھوں پر خانقاہیت کا پشتارہ لیے کانپ رہی تھی۔ ایسے نازک وقت میں عربستان سے امید کی کرن پھوٹی۔ اسلام کی تلوار بظاہر خدا کی خدمت کے لیے بلند ہوئی، لیکن درحقیقت اس نے ایک ایسے ترقی پسند سماجی اور مذہبی نظام کا سنگ بنیاد رکھا جس نے تمام فرسودہ خیالی، توہم پرستی اور قدیم مذاہب کو موت کی گہری نیند سلا دیا۔“

اسلام کی اس انقلاب آفرینی کا ذکر کرتے ہوئے فرانس کا مشہور اجتماعی مصنف موسیو لیبان لکھتا ہے:

”اسلامی تہذیب کی تاریخ میں یہ نہایت اہم واقعہ ہے اور اس زمانہ کی عربی تہذیب کے اثر اور اس کی اہمیت کا غالباً سب سے اہم اور قطعی ثبوت بھی، ایرانی بازنطینی اور قبطی سب ایک لاء علاج کاہلی کا شکار ہو رہے تھے اور اس قابل نہ تھے کہ از خود زمانے کی ترقی کا ساتھ دے سکیں۔ عربوں سے ربط و ضبط پیدا ہونے کی وجہ سے ان کی سستی دور ہو گئی اور ان میں ایک نئی طرح کی ذہنی بیداری پیدا ہو گئی۔“

بد قسمتی سے ہماری تاریخ نے تیج آزماؤں کے کارناموں پر بہت زور دیا۔ یا حکمران طبقوں کی غلط کاریوں اور کوتاہیوں کو اچھالنے کی طرف ضرورت سے زیادہ توجہ رکھی، لیکن اسلامی انقلاب سے جوشان دار اور دور رس نتائج برآمد ہوئے، ان کی تحقیق نہ کی۔ اموی تلواریں مشرق میں ہندوستان، افغانستان، ترکستان، خراسان اور ایران اور اوسر مغرب میں فرانس کی حدود تک عربی نفوذ اور اقتدار کے لیے راستہ صاف نہ کرتیں تو ان ممالک میں اسلام کو کیسے بار ملتا، سچ پوچھیے تو ان فتوحات کی وجہ سے ہی ایسے حالات پیدا ہو سکے کہ پس ماندہ انسانیت کو نئی زندگی سے متمتع ہونے کا موقع ملا۔ ”اس وقت دول فارس و روما کے کھنڈر صاف کرنے کی ضرورت تھی، تاکہ ایک نیا سماجی نظام نئے خیالات اور مقاصد کی شرح لے کر اٹھے اور تیرہ و تار دنیا میں علم کا نور پھیلا دے، مجوسی تصوف کے گندے توہمات اور یونانی کلیسا کے ناگفتہ بہ ماحول نے فارس اور بزنطینی ممالک کے عوام کو ذہنی پستی اور اخلاقی کمزوریوں کے قعر مذلت میں پھینک دیا تھا۔“

بنو امیہ کی عربی حکومت نے ایک تو دول فارس و روما کے کھنڈرات کو صاف کرنے کا کام بڑی خوش اسلوبی سے سرانجام دیا۔ دوسرے اپنی فتوحات سے اسلام کے بین الاقوامی پیغام کو عام بھی کیا۔ اس طرح مفتوحہ قومیں اسلام سے متعارف ہوئیں اور ان کا اثر یہ ہوا کہ یہی تو میں ایک صدی کے اندر اندر اس قابل ہو گئیں کہ عرب ان کو اپنے ساتھ حکومت میں برابر کا شریک کرنے پر مجبور ہو گئے، موسیو لیبان کے الفاظ میں خون ریزی کے اس گرداب میں نئے تمدن کا بیج جو ایک قدیم سر زمین میں بویا گیا تھا۔ از سر نو پھوٹتا ہے اور جب طوفان تھم جاتا ہے تو امویوں کا ستارہ غروب ہوتا ہے اور عباسیوں کے کوکب اقبال کی درخشانی سے افق روشن ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں عظمت و جلال کے ایک شان دار منظر سے دوچار ہوتی ہیں۔

مولانا نے اموی سلطنت کے متعلق ایک دفعہ فرمایا کہ خلافت راشدہ کے بعد مسلمان عربوں کی اس قومی سلطنت کو میں دنیا کی بہترین سلطنت مانتا ہوں۔ ہمارے نزدیک بہترین حاکم یا تو خلیفہ راشد ہوتا ہے یا سلطان عادل، خلیفہ راشد صرف قانون کو حاکم مانتا ہے اور سلطان عادل اپنی قومی طاقت سے انصاف کرتا ہے، جب خاندانی بادشاہت ہوتی ہے تو سارے حکمران کبھی ایک سے نہیں ہوتے، ایک عادل ہوگا، تو اس کا جانشین غیر عادل، اور پھر ممکن ہے کہ ایک عادل تخت پر بیٹھ جائے، ولید بن عبدالملک نے کہا تھا کہ داؤد و سلیمان علیہ السلام کی حکومت شام میں رہی۔ وہ بنی تھے، اس سے قطع نظر کر لو، پھر میری حکومت کا ان کی حکومت سے مقابلہ کرو اور دیکھو، کوئی اندھا نہیں جس کے لیے میں نے عصا کش مقرر نہ کیا ہو، کوئی بھوکا اور بیمار نہیں ہے جس کو کھانا اور دوا نہ پہنچتی ہو، مولانا فرماتے ہیں کہ یہ

ایک عرب بادشاہ کی حکومت ہے، خلیفہ راشد کی خلافت نہیں، خلیفہ راشد کی حکومت نمونہ کی حکومت ہے، اس کی نظیر پھر مسلمان پیدا نہیں کر سکتے، مگر قریش کے یہ بادشاہ بھی انسانی اجتماع کی ضرورتوں کو نظر انداز نہیں کرتے تھے۔

اسلام کے عالمگیر انقلاب کی دوسری منزل یہاں ختم ہوتی ہے اور عباسیوں سے اس کے تیسرے دور کا آغاز ہوتا ہے، پہلے دور میں قریش سارے عرب کو اپنے جھنڈے تلے جمع کرتے ہیں۔ دوسرے دور میں قریش اور عرب مل کر دنیا کے ایک رقبہ کو اسلام کے زیر اثر لے آتے ہیں، عباسی دور آتا ہے، تو عرب اور غیر عرب مسلمان مل جل کر حکومتیں قائم کرتے ہیں، گوان میں اخلاقی سیادت عربوں کے ہاتھ میں رہتی ہے، لیکن زندگی کے دوسرے شعبوں پر غیر عرب چھا جاتے ہیں، آہستہ آہستہ عربوں کا اخلاقی اقتدار بھی کم ہوتا جاتا ہے اور ایک وقت ایسا آتا ہے کہ ایرانی اور ترکی قومیں اسلام کے بین الاقوامی مرکز کی مالک بن جاتی ہیں اور عربوں کی حیثیت دوسرے درجہ کی ہو جاتی ہے۔

دمشق خالص عربی قوموں کا مرکز تھا، بغداد میں عرب امیر اور ایرانی وزیر تھے، ایرانیوں نے بغداد کی عباسی خلافت کے زیر تربیت حکومت کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کی، شروع شروع میں تو ایرانی دبے رہے۔ اگرچہ عباسیوں نے ان کی مدد سے ہی امویوں کو خلافت سے برطرف کیا تھا، لیکن ابتداء کے چند عباسی خلفاء نے عربی سیادت کو برقرار رکھنے کی بڑی کوشش کی، چنانچہ منصور، مہدی ہادی اور ہارون نے جب بھی انہیں موقع ملا، اپنے ایرانی وزراء اور امراء کو جو سلطنت میں بڑے وکیل اور صاحب اقتدار تھے، بے درغ قتل کر دیا اور ایران کے قدیم افکار جو اسلام پر غالب آنے یا اسے اپنے رنگ میں رنگنے کے لیے سراٹھا رہے تھے، بڑی سخت سے کچلا، لیکن ماموں کا، جس کی ماں ایرانی تھی، اپنے بھائی امین کے مقابلہ میں کامیاب ہونا دراصل عربوں کے خلاف ایرانی عنصر کی فتح تھی، اس عہد میں عباسی خلافت کی فوج میں عربوں کا وجود بھی برائے نام رہ گیا، ماموں کے بعد معتصم اور واثق کا زمانہ آیا تو تزک جنہیں ہم تمدنی اعتبار سے ایرانی ہی کہتے ہیں، خلافت عباسی کے سیاہ و سفید کے مالک ہو گئے، ماموں نے اپنے عہد خلافت میں غیر عرب مسلمانوں کو حکومت کا اہل پا کر انہیں سلطنت کے بڑے بڑے عہدے بھی دیئے اور بعض کو تو صوبوں میں مستقل حکومتیں بھی عطا کیں۔ اس زمانے سے عباسی خلافت کے ماتحت شرق و غرب میں نیم آزاد سلطنتیں بنا شروع ہوتی ہیں، وہ اپنے اندرونی معاملات میں تو مستقل تھیں لیکن حاکمیت اعلیٰ عباسی خلفا ہی کی تسلیم کرتی تھیں، چنانچہ مشرق میں بخارا، غزنی اور بعد میں دہلی کی سلطنتیں وجود میں آئیں اور ادھر مغرب میں مصر اور مراکش کی حکومتیں بنیں۔

مولانا فرماتے ہیں کہ اس طرح تقریباً پانچ سو برس اسلام کی مرکزی قوت عربی اقوام کے

ہاتھ میں رہی۔ ان اقوام کی امامت قریش نے کی، اس کے بعد ”آخِرِينَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوا بِهِمْ“ کا زمانہ آتا ہے اور عربوں کے بجائے یہ لوگ اسلام کی بین الاقوامیت کے محافظ اور سرپرست بنتے ہیں، مولانا کا کہنا یہ ہے کہ اگر اسلام کو صرف عربی اقوام تک محدود کر دیا جائے تو غیر عرب مسلمان اقوام نے جو بڑی بڑی سلطنتیں بنائیں، وہ اسلامی اجتماع پر ایک دنبل بن کر رہ جائیں گی، لیکن اگر بعثت محمدی کی دونوں حیثیتیں یعنی قومی اور عمومی ملحوظ رہیں تو قرآن کے مقاصد پورا کرنے والے عرب اور ان کے بعد عجم ایک ہی درجہ پر آجائیں گے، بے شک عرب اس اجتماعی تحریک کے امام ہیں۔ انہوں نے سب سے پہلے قرآن کی اجتماعیت کو دنیا میں کامیاب کر کے دکھایا، وہ قیامت تک انسانی نسلوں کے لیے قرآن کی اجتماعیت پر عمل کرنے کے لیے نمونہ کا کام دیں گے، مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ عربوں کی مرکزی حکومت کمزور ہونے سے اسلام ختم ہو گیا۔

حاشا دکلا ہمارا مقصود یہاں کسی قسم کا مقابلہ کرنا نہیں ہے اور نہ کسی طرح کی مشابہت ثابت کرنے کی غرض ہے لیکن تاریخ اسلام کے ان ادوار کو سمجھنے میں اس زمانہ کی ایک اور بین الاقوامی تحریک سے بڑی مدد مل سکتی ہے، خوش قسمتی سے یہ تحریک ہمارے سامنے اٹھی، ابھری اور پھیلی اور مختلف مراحل سے گزری ہے، اس لیے اس کا تجزیہ کرنا اور اس کا صحیح جائزہ لینا زیادہ مشکل نہیں، ہماری مراد یہاں اشتراکیت کی تحریک سے ہے۔

اشتراکیت اپنے اصول و مبادی کے اعتبار سے خالص بین الاقوامی تحریک ہے، اس کا مقصد صرف ایک قوم کو اشتراکی بنانا نہیں، بلکہ ایک اشتراکی تو اس دن کی تمنا رکھتا ہے جب ساری دنیا اشتراکیت قبول کر لے گی، طبقات کی موجودہ تقسیم مٹ جائے گی اور روئے زمین پر انسانوں کا صرف ایک ہی طبقہ نظر آئے گا، یہ ہے مشن جو اشتراکیت کے داعیوں کے پیش نظر ہے۔

عہد حاضر میں لینن اسی عالمگیر انقلاب کا نقیب تھا۔ روس میں انقلاب کے کامیاب ہونے کے بعد اشتراکیت کی مرکزی جماعت تھرڈ انٹرنیشنل یا کمونٹرن کا صدر مقام ماسکو بنا، ماسکو کے سوا انقلاب کو کسی اور ملک میں پورا اقتدار حاصل نہ ہو سکا بلکہ انٹرنیشنل کی بڑی بڑی سلطنتیں اس انقلاب کو ختم کرنے کے درپے ہو گئیں، چنانچہ ان زبردست دشمنوں کی شہ اور مدد پا کر خود روس کے اندر انقلاب دشمن

آنسورہ جمعہ میں ارشاد ہوتا ہے۔ ”هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كُنَّا لَأَوَّاهِينَ قَبْلَ لَيْلَىٰ ضَلُّوا سُبُلًا وَمُبِينًا“ (ترجمہ) وہی ہے جس نے ان پڑھوں میں ان ہی میں سے ایک رسول مبعوث کیا۔ وہ ان کو اس کی آیتیں پڑھ کر سنا تا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور اس سے پہلے وہ صریح گمراہی میں تھے اور اس پر رسول کو مبعوث کیا، ان سے دوسروں کے لیے بھی جو ابھی ان سے نہیں ملے۔

جماعتیں بن گئیں اور ملک میں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ اشتراکی لیڈروں نے بڑی خون ریزی کے بعد حالات پر قابو پایا، اور لینن نے انقلاب کو روس کی سر زمین میں مضبوط اور پائیدار بنانے کے لیے اشتراکیت کے عمومی اصولوں میں تھوڑی سی تبدیلی بھی گوارا کر لی، تاکہ عام روسیوں کو اشتراکیت کے اپنانے میں کامیابی ہو سکے۔

لینن کا انتقال ہوا تو روس میں اشتراکیوں کے قدم جم چکے تھے، لینن کے بعد دو جماعتیں ہو گئیں، ایک جماعت کہتی تھی کہ ہمیں دوسرے ملکوں میں اشتراکیت کی نشر و اشاعت اور دوسری قوموں کو اشتراکی بنانے کا کام زور شور سے کرنا چاہیے، اگر ہم نے ادھر سے توجہ ہٹا دی اور دوسرے ملکوں کے مزدوروں کو اپنے ساتھ ملانے کی فی الفور کاوش نہ کی تو نتیجہ یہ ہوگا کہ ان ملکوں کی سرمایہ دار سلطنتیں جو ہمیں مٹانے پر تلی بیٹھی ہیں، ہمیں اور ہماری تحریک کو پھلنے پھولنے کا موقع نہ دیں گی۔ ضرورت ہے کہ سارا زور تحریک کے بین الاقوامی پہلو پر صرف کیا جائے، نیز ان کا یہ کہنا تھا کہ اگر اشتراکی روس کے تعمیری کاموں میں لگ گئے تو یہ کام اتنا بڑا ہے کہ ہماری ساری انقلابی طاقت اسی کام میں صرف ہو جائے گی اور اگر ہم نے انقلابی جذبہ کھو دیا تو آگے چل کر باہر کی انقلاب دشمن سلطنتیں اس نئی ریاست کو فنا کر دیں گی۔

دوسری جماعت کہتی تھی کہ عالمگیر انقلاب کی کوششیں بار آور نہیں ہوں گی اور نہ مستقبل قریب میں ان کے بار آور ہونے کی زیادہ امید ہے، اگر ہم نے ملک کی تعمیر کی طرف توجہ نہ کی اور اپنی تمام جدوجہد دوسرے ملکوں کے لیے وقف کر دی تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ نہ دوسرے ملکوں میں انقلاب ہوگا اور نہ ہمارا ملک مضبوط ہو کر خارجی حملوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکے گا۔ مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ اشتراکی اصول حیات کو ایک ملک میں عملی جامہ پہنایا جائے تاکہ یہ دوسروں کے لیے ایک نمونہ کا کام دے اور اگر کوئی سرمایہ دار سلطنت ہمارے درپے آزار ہو تو اشتراکیت کے اس مرکز میں اتنی جان ہونی چاہیے کہ وہ اپنی حفاظت کرے اور رجعت پسند طاقتوں کو نیچا دکھا سکے۔ سٹالن اس گروہ کا سر دار تھا جو روسی ہے اور ٹرائسکی جو یہودی ہے، بین الاقوامی سرگرمیوں کو مقدم رکھنے کے حق میں تھا، سٹالن کامیاب ہوا اور دوسری جماعتوں کے لیڈروں کو ایک ایک کر کے قتل کر دیا۔

عجیب بات یہ ہے کہ ٹرائسکی کا حصہ روسی انقلاب میں سٹالن سے کہیں زیادہ تھا اور ٹرائسکی کے ساتھ جن کو بعد میں ایک ایک کر کے موت کے گھاٹ اتارا گیا، انقلاب کے بڑے نامی گرامی ارکان تھے، لیکن یہاں دو مستقل رازوں میں تصادم تھا، ہر فریق سمجھتا تھا کہ اگر دوسرے فریق کی رائے پر عمل ہوا تو اس سے اشتراکی تحریک کو قابل تلافی نقصان پہنچے گا، اشتراکی جماعت کی اکثریت نے جو ظاہر ہے، رویا تھے اور سٹالن کے لائحہ عمل سے انہیں فائدہ پہنچا تھا، سٹالن کا ساتھ دیا اور ٹرائسکی اور اس کے معاون جو

بلند نصب العین رکھنے والے لوگ تھے، روسی اشتراکیوں کو اپنا ہم رائے نہ بنا سکے۔

مختصر امارت کی اشتراکیت خالص نظری تھی اسے کسی خاص قوم یا مخصوص ملک سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ اسے سب مظلوم انسانوں کے روگوں کا علاج بتاتا تھا اور اس سلسلے میں اس نے نسخہ بھی تجویز کیا، لینن نے چونکہ اس نسخہ کو ایک خاص ملک اور خاص ماحول میں برتا، اس لیے اس کو وہاں کے لوگوں کے مزاج اور حالات کے مطابق اس نسخہ میں قدرے تبدیلی بھی کرنی پڑی، لیکن یہ تبدیلی اس کے اور اس کے ساتھیوں کے نزدیک اشتراکیت کے بنیادی اصولوں میں تبدیلی نہ تھی، بلکہ اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ اشتراکیت ماحول کی ان وقتی مشکلات کو صلح و صفائی سے طے کر کے اپنے اصل نصب العین کی طرف قدم بڑھا سکے۔ سٹالن آیا تو اسے تمام روسی زندگی کو اشتراکیت کے ساتھ سمونا پڑا۔ اس لیے لامحالہ اشتراکیت میں روس کا قومی رنگ غالب آ گیا، لیکن اس سے یہ سمجھ لینا کہ اشتراکیت کی بین الاقوامی حیثیت روسی اشتراکیوں کے دماغوں سے محو ہو گئی، صحیح نہیں۔

لینن کے زمانے میں تھرڈ انٹرنیشنل یا کومنٹرن ایک فعال اور زندہ قوت تھی، اشتراکی روس کے نظم و نسق کے سلسلے میں جو بھی پالیسی بنتی، کومنٹرن سے اس کے متعلق استصواب رائے ضرور کیا جاتا، کومنٹرن میں ہر قوم کے اشتراکی شریک تھے اور یہ صحیح معنوں میں ایک بین الاقوامی جماعت تھی۔ لیکن اس میں روسیوں کا غلبہ تھا اور عملاً اس کا اقتدار بھی روسیوں کے ہاتھ میں تھا، لیکن جہاں تک اصول کا معاملہ تھا، روسی اور غیر روسی میں کوئی امتیاز نہ تھا، سٹالن کی نئی پالیسی شروع ہوئی تو کومنٹرن کا زور بھی کم ہوتا چلا گیا اور گوب اس سے استصواب رائے کرنے کا دستور برقرار تھا، لیکن عملاً کومنٹرن بے اثر ہو چکا تھا۔

۱۹۳۹ء میں موجودہ جنگ چھڑی اور روس ہٹلر کے ساتھ سمجھوتہ کر کے غیر جانب دار بن گیا تو دوسرے ملکوں کی اشتراکی جماعتیں بڑے مخمضے میں پڑ گئیں۔ نازیت اور فسطائیت نہ صرف ان اشتراکی جماعتوں کے ملکوں کی آزادی سلب کرنے پر اثر آئی تھیں، بلکہ وہ دونوں بنیادی طور پر اشتراکیت دشمن اور مزدور کش تحریکیں بھی تھیں، بلحاظ ایک اشتراکی کے ہر اشتراکی کا طبعی رجحان یہ تھا کہ ہٹلر اور مسولینی سے لڑا جائے، لیکن جس بین الاقوامی مرکز سے یہ اشتراکی جماعتیں منسلک تھیں، وہ اس جنگ میں غیر جانب دار تھا، ممکن ہے کہ روسی اشتراکیت کا فائدہ اس میں ہو کہ ہٹلر سے لڑائی مول نہ لی جائے، لیکن فرانسیسی ڈیج، انگریز اور دوسری قوموں کے اشتراکیوں کے لیے تو ہٹلر سے لڑنا ضروری تھا کیونکہ جمہوریت میں تو اشتراکیت کی کامیابی کے کچھ امکان بھی تھے لیکن نازی نظام تو اشتراکیت کو جیسا کہ اس نے جرمنی میں کیا، شیخ و بن سے ہی اکھاڑ کر پھینک دیتا، یہاں سے اشتراکیوں کے قومی اور بین الاقوامی مصالح میں

تضاد پیدا ہوتا ہے، اس بناء پر بعض اشتراکی جماعتوں نے روس کے اس فیصلے سے اختلاف بھی کیا لیکن اکثر جماعتیں گوگلو میں پڑ گئیں اور مجموعی طور پر اس کا اثر بہت برائے نکلا، ہر ملک میں اشتراکی جماعتوں کا وقار کم ہو گیا، اور اشتراکیت اور نازیت دونوں کو جمہوریت کا دشمن سمجھا گیا۔

آخر کار جب ہٹلر نے روس پر بھی دھاوا بول دیا، تب کہیں جا کر اشتراکی جماعتوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ وقتی طور پر گو یہ تضاد رفع ہو گیا لیکن اصل سوال تو بدستور اب بھی اپنی جگہ پر قائم تھا، مثلاً فرض کیا کہ روس کی اشتراکی حکومت آئندہ کسی مصلحت سے ہٹلر سے صلح کر لیتی ہے، اب کیا ضروری ہے کہ انگریز اور فرانسیسی اشتراکی بھی ہٹلر سے صلح کر لیں، یعنی مطلب یہ ہے کہ ایک ملک کی مصلحتیں کیونکر ایک دوسرے ملک کی مصلحتوں کے تابع کر دی جائیں، یہی بنیادی اسباب تھے جن کی بنا پر کومنٹرن کو ایک مہینہ ہوا توڑ دیا گیا ہے، چنانچہ اب ہر ملک کی اشتراکی جماعت کو یہ اختیار مل گیا ہے کہ اپنے ملک کے لیے جو لائحہ عمل مناسب سمجھے، اس پر چلے۔ کومنٹرن کی اس تئسیخ کو بعض اشتراکی اہل فکر نے سراہا ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ بے شک کومنٹرن اصولاً ایک بین الاقوامی جماعت تھی لیکن عملاً اب وہ روسیوں کے ہاتھ میں آچکی تھی اور روسیوں کے اپنے مصالح اور مفاد ہیں اور یہ ضروری نہیں کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ دوسرے ملکوں سے خواہ وہ اشتراکی بھی ہو جائیں، موافق ہی ہوں، اس وجہ سے دوسرے ملکوں کی اشتراکی جماعتوں کو اپنے اپنے ملکوں میں کام کرنا مشکل ہو گیا تھا، کیونکہ جس سیاسی جماعت کا مرکز اطاعت دور کہیں ماسکو میں ہو، اس کے لیے اپنے ملک کے جمہور کو ساتھ ملانا تقریباً ناممکن تھا، چنانچہ یہی وقت برطانیہ کی اشتراکی پارٹی کو پیش آئی، وہاں کی لیبر پارٹی جو اس وقت ملک میں بڑی زبردست سیاسی طاقت ہے اور بظاہر اشتراکیت سے ہمنوا بھی ہے، اشتراکی پارٹی کو اپنے ساتھ شریک نہیں کرتی اور جب بھی اس سے یہ مطالبہ کیا جاتا ہے، وہ اسے رد کر دیتی ہے، کیونکہ برطانیہ کی اشتراکی پارٹی کا مرکز اطاعت برطانیہ سے باہر کسی دوسرے ملک میں تھا اور جو سیاسی پارٹی اپنے ملک کو چھوڑ کر کسی دوسری قوم کے اثر میں ہو، آج کی دنیا میں وہ پارٹی اپنے ملک میں باوقار نہیں ہو سکتی اور نہ اقتدار حاصل کر سکتی ہے، ان حالات میں مصلحت، انصاف اور ضرورت متقاضی تھی کہ کومنٹرن کو ختم کر دیا جائے، امید ہے کہ کومنٹرن کے ٹوٹنے سے اب ہر ملک کی اشتراکی جماعت کو اپنے عوام کو ساتھ ملانے میں آسانی ہوگی اور آئندہ چل کر صحیح معنوں میں کوئی بین الاقوامی اشتراکی اداہ بن سکے گا۔

اس میں شک نہیں کہ سالن کے عہد میں اشتراکی روس پر قومی رنگ غالب آ گیا، لیکن اشتراکیت کی بین الاقوامی روح میں برابر موجود رہی ہے۔ پچھلے دنوں جنگی ضرورتوں کی وجہ سے برطانیہ اور روس دونوں ایران میں اپنی فوجیں بھیجنے پر مجبور ہوئے اور دونوں نے آدھے آدھے ملک کو اپنے اثر

میں لے لیا، لیکن دونوں ملکوں کی فوجوں کی جو روش ہے، اس میں بہت فرق ہے۔ روسی ایران میں اشتراکی پہلے ہیں اور روسی بعد میں، اور ظاہر ہے برطانیہ والے پہلے بھی انگریز ہیں اور بعد میں بھی انگریز۔ اسی طرح موجودہ جنگ کی ابتدا میں پولینڈ کو روسیوں اور نازیوں نے آپس میں تقسیم کر لیا تھا۔ روسیوں نے جس حصہ پر قبضہ کیا، وہاں کے بڑے بڑے زمینداروں کو ان کی زمینداروں سے بے دخل کر دیا۔ عوام کے سوویت بنادیئے اور ہر سوویت کے انتخابات ہوئے اور ان کے نمائندے سوویت روس میں شامل کر لیے گئے، اس کے برعکس نازیوں نے پولینڈ والوں کو خوب لوٹا، کھسوتا اور پول قوم کو جرمن قوم کا دشمن سمجھ کر انہیں صفحہ زمین سے مٹانے کی تدبیریں کیں۔

الغرض اگر اشتراکیت کے بین الاقوامی ہونے کے یہ معنی ہیں کہ کسی قوم کا وجود ہی نہ رہے اور ملکوں اور قوموں کی حدیں سرے سے ناپید ہو جائیں تو عملاً یہ ممکن نہیں اور اگر اشتراکیت کی بین الاقوامیت سے کوئی یہ سمجھے کہ ماسکو ہی ہمیشہ کے لیے اس کا مرکز بنا رہے اور دنیا کی سارے اشتراکی اس ایک مرکز کے تابع ہوں تو اس کا بھی اب انکار ہو چکا ہے اور خود روسیوں نے اس قسم کی بین الاقوامی مرکزیت کا جو اپنی گردن سے اتار دیا ہے، ہاں ایک صورت اور ہے، اشتراکیت کا نصب العین بین الاقوامی رہے اور اشتراکی روس اور دوسرے ملک اگر وہ بھی اشتراکی ہو جائیں، اس اشتراکی بین الاقوامی برادری میں برابر کے رکن ہوں۔ یقیناً روسیوں کو یہ امتیاز حاصل ہوگا کہ انہوں نے دنیا کے سامنے اشتراکی حکومت کا ایک نمونہ پیش کیا اور اس سلسلے میں ان کو بڑی بڑی قربانیاں بھی دینی پڑیں۔ چنانچہ جب کبھی اشتراکیت کو بطور ایک نمونہ اور مثال کے پیش کیا جائے گا تو لامحالہ روس کی اس ابتدائی اشتراکی حکومت کا نام آئے گا اور اس کے لیڈروں کو ہر زمانے میں اشتراکی عزت کی نظر سے دیکھیں گے، لیکن فرض کیا کہ اگر دوسری قومیں کل کو اشتراکی ہو جائیں اور روس کی اشتراکی حکومت کمزور ہو جائے تو کیا اس وقت بھی ضروری ہوگا کہ روس ہی اشتراکی قوموں کا مرکز رہے کیا یہ ممکن نہیں کہ کوئی دوسری قوم اس امتیاز کی مالک ہو جائے۔

بے شک اشتراکیت اصلاً ایک بین الاقوامی اور عالمگیر تحریک ہے۔ روس میں اس تحریک کو عملی جامہ پہنایا گیا، اس طرح روس اس بین الاقوامی تحریک کا ہراول اور دوسروں کو اشتراکیت سے متعارف کرانے کا ذریعہ بنا، ایک طرف تو اس تحریک نے روسی قوم کو سر بلند کیا، چنانچہ پچیس سال پہلے جو قوم انتہائی پستی، ذلت، استبداد، بد نظمی اور جہالت کا شکار ہو رہی تھی، وہ اس تحریک کی بدولت اتنی طاقتور منظم اور اتنی ترقی یافتہ ہو گئی کہ جرمنی جیسی زبردست سلطنت کی جبرافوجوں کا جن کے سامنے دنیا کی بڑی بڑی طاقتیں بھی نہ ٹھہر سکیں، خم ٹھونک کر مقابلہ کر سکی، یہ ہے اشتراکیت کی بین الاقوامی تحریک کا قومی پہلو۔

دوسری طرف روسی قوم باقی دنیا کے لیے اشتراکیت کی ترجمان بنی اور انہوں نے اپنے عمل سے یہ بتا دیا کہ جب اشتراکیت کے اصولوں پر زندگی کی تنظیم کی جائے تو اس کے یہ نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ چنانچہ روس کے اس عمل سے دوسری قوموں نے اشتراکیت کی افادیت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا اور جو دشمن تھے، وہ بھی اس کے مفید ہونے کے قائل ہو گئے۔ یہ ہے روسی اشتراکیت کا عمومی پہلو، قومی پہلو، محدود زمانے کے لیے ہوتا ہے اور عمومی پہلو جب تک انسانیت کے لیے کسی تحریک میں کچھ بھی فائدہ ہے، برسر کار رہ سکتا ہے، اشتراکیت کی وجہ سے آج روس کو سر بلندی ملی، کل کو کوئی دوسری قوم اس کی بدولت بین الاقوامی قیادت کی مالک بن سکتی ہے اور پرسوں کوئی تیسری قوم۔ علیٰ ہذا القیاس، ہر قوم کے لیے اس کا دروازہ کھلا ہے اور اس کے ذریعہ عزت و عظمت حاصل کر سکتی ہے، ایک بین الاقوامی اور عمومی تحریک کا یہ لازمی نتیجہ ہے۔

یہ مثال ہے اس عہد کی ایک بین الاقوامی تحریک کی، مولانا اس تحریک کو نامکمل سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک انسان محض معاشی حیوان نہیں۔ اشتراکیت نے انسانیت کی خارجی زندگی کی تنظیم کر کے بڑا کام کیا ہے لیکن انسان کی ایک معنوی زندگی بھی ہے، بے شک اسلام اور اشتراکیت دونوں بین الاقوامی تحریکیں ہیں اور دونوں کا پیغام تمام بنی نوع انسان کے لیے ہے، پھر دونوں کی دونوں انقلابی ہیں، لیکن دونوں میں فرق یہ ہے کہ اشتراکیت صرف معاشی زندگی پر سارا انحصار رکھتی ہے۔ اسلام معاشی زندگی کا انکار تو نہیں کرتا لیکن وہ زندگی کو محض معاشی دائرہ تک محدود بھی نہیں سمجھتا۔ اس کے نزدیک زندگی دوام چاہتی ہے اور وہ اس دنیا ہی میں ختم نہیں ہو جاتی۔ بے شک یہ فرق بھی کوئی معمولی فرق نہیں لیکن جہاں تک دونوں کے بین الاقوامی اور انقلابی ہونے کا تعلق ہے، دونوں آپس میں ملتی ہیں اور ایک کے مطالعہ سے دوسری تحریک کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

روسی قوم میں انقلاب سے پہلے جوش تھا، بہادری کے جذبات بھی تھے، روسی ایثار بھی کر سکتے تھے، ان میں بے پناہ صبر کا مادہ تھا، ان کا ادب دنیا کا مانا ہوا ادب تھا، لیکن ان سب باتوں کے باوجود وہ ذلیل تھے، تباہ حال تھے، بعینہ یہی حالت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے عربوں کی تھی۔ اس کے علاوہ وہ بڑے جنگجو اور لڑاکے بھی تھے اور صدیوں سے آپس میں لڑ لڑ کر وہ لڑائی کے فن میں بڑے ماہر ہو گئے تھے۔ خدا نخواستہ اگر ان کو کوئی چنگیز جیسا قومی قائد مل جاتا تو یہ تاریخوں کی طرح انسانیت پر سیلاب بلا بن کر چھا جاتے۔ ان کے ہاتھوں سے نہ یورپ کا کوئی ملک بچتا، نہ ایشیا کا کوئی خطہ محفوظ رہتا اور ان کے ساتھ تمدن اور علم کے سارے انسانی اثاثے بھی ہمیشہ کے لیے دفن ہو جاتے۔ لیکن خدا تعالیٰ کو انسانیت کی فلاح مقصود تھی کہ عرب جب دنیا کی فتح و تسخیر کو نکلے تو ایک بین الاقوامی تحریک کے سپاہی اور

مبلغ بن کر نکلے اور انسانیت کی مزید خوش نصیبی یہ تھی کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں ان عربوں کی قیادت تھی وہ بین الاقوامی روایات کے اور ایک بلند انسانی فکر کے تربیت یافتہ تھے۔ بدو کی سفاکی اور بربریت کا کسی کو اندازہ نہیں، عرب کا بدو اسلام کے بغیر تاریخ میں چنگیز کے تاتاری سے کم خونخوار ثابت نہ ہوتا۔ یہ اسلام کی انسانیت اور بین الاقوامی تعلیم کا فیض ہی تھا کہ عرب کی باوصر صد دنیا کے لیے باد بہاری بن گئی۔

اسلام کا ظہور مکہ میں ہوا، جو ذہنی لحاظ سے تو اس قوت کا ایک بین الاقوامی شہر تھا، لیکن وہاں کے رہنے والے جسمانی لحاظ سے بدویوں کی سی صحت و توانائی کے مالک تھے۔ مکہ میں اسلام کے اولین پیروؤں کی جو جماعت بنی، اس میں ہر قوم کے لوگ شامل تھے، ان میں قریش بھی تھے۔ بلال حبشی جیسے بھی تھے اور صہیب رومی بھی تھے۔ مکہ سے جب یہ جماعت مدینہ میں منتقل ہوئی تو اس میں عبداللہ بن سلام ایسے یہودی عالم اور انصار کے بڑے بڑے سردار بھی شریک ہو گئے۔ قرآن مجید نے اس جماعت کو "السا بقون الاولون" کا نام دیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس جماعت میں قریش کی حیثیت سب میں ممتاز تھی، لیکن امتیاز صلاحیت کی بنا پر تھا، کسی خاندان یا نسب کی وجہ سے نہ تھا۔ درجہ میں سب لوگ برابر تھے، چنانچہ اس عہد کی یہ ایک صحیح انٹرنیشنل انقلابی جماعت تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد اس مرکزی جماعت نے بالاتفاق حضرت ابوبکر کو سردار چنا۔ حضرت عثمان کے آخری زمانہ تک مرکزی جماعت کا اتفاق قائم رہا۔ اس عہد میں صحابہ کی دو جماعتیں ہو گئیں۔ ایک جماعت عربیت کی طرف زیادہ مائل تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ اگر حاصل شدہ سلطنت کے استحکام کی طرف توجہ نہ کی گئی تو سلطنت میں بڑا انتشار پیدا ہو جائے گا۔ پھر ایک طرف بدو عرب بھی بے قابو ہو رہے تھے اور دوسری طرف مفتوحہ قومیں ہنوز پوری طرح مطیع نہ ہوئی تھیں۔ اس جماعت کا کہنا یہ تھا کہ اتنی وسیع سلطنت کو سنبھالنے کے لیے عربوں کو بحیثیت ایک قوم کے آگے بڑھنا چاہیے۔ اس کے خلاف دوسری جماعت عربیت کو موخر اور ابتدائی زمانہ کی اسلامیت کو مقدم رکھنا چاہتی تھی چنانچہ حضرت عثمان کی خلافت کے آخری سالوں میں یہ کشمکش زوروں پر رہی۔ مرکزی جماعت کے اس اختلاف سے عربوں کے شورش پسند طبقوں نے فائدہ اٹھایا اور حضرت عثمان شہید کر دیئے گئے۔ ان شورش پسند عربوں کے سامنے کوئی نصب العین نہ تھا۔ یہ دراصل بدوؤں کی پرانی نراجی ذہنیت کا مظاہرہ تھا۔ بے شک حضرت علی کے پیش نظر حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کے عہد کو تازہ کرنا تھا لیکن ان کو کوئی اور بصرہ میں جن لوگوں سے سابقہ پڑا وہ عہد اول کی بلند نظری تو کجا عربی تنظیم سے بھی بے بہرہ تھے۔ حضرت علی کا بلند نصب العین واقعی قابل تعریف تھا۔ لیکن جن لوگوں کے ذریعہ وہ اس نصب العین کو عمل میں لانا چاہتے تھے۔ وہ بین الاقوامی تنظیم تو کیا، قومی تنظیم سے بھی ناواقف تھے۔ ان کے خلاف امیر معاویہ

عربوں کو بحیثیت ایک قوم کے منظم کر کے اسلام کا محافظ بنانا چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے شام والوں کو عربیت کے نام سے جمع کیا۔ نصب العین تو ان کا بھی اسلام رہا، لیکن ان کے ہاں یہ نصب العین عرب قوم کا قومی مسئلہ بن گیا۔

حضرت علیؓ کے اس بین الاقوامی رجحان کا اس واقعہ سے بھی پتہ چلتا ہے، حضرت عمرؓ کی شہادت پر ان کے صاحب زادے عبید اللہ نے ایک ایرانی مسلمان کو محض شبہ میں قتل کر دیا تھا۔ عبید اللہ پر اس جرم میں مقدمہ چلایا گیا اور ان سے قصاص کا مطالبہ ہوا۔ اس وقت حضرت عثمانؓ نے اپنی طرف سے مقتول کا خون بہا ادا کر کے عبید اللہ کی جان بچائی لیکن حضرت علیؓ خلیفہ منتخب ہوئے تو آپ نے عبید اللہ کو قصاص میں پکڑنا چاہا، چنانچہ وہ مدینہ سے بھاگ کر دمشق پہنچ گئے، حضرت علیؓ کے ساتھ سلمان فارسی کے بھی خصوصی تعلقات تھے۔

آل علیؓ کا بھی بعد میں یہی رجحان رہا، اسی وجہ سے ان کو عربوں کے بجائے ہمیشہ غیر عرب مسلمانوں میں حامی و مددگار ملے، آخر میں جب ایرانیوں میں قومی شعور پیدا ہوا اور انہوں نے اسلام کو بھی قومی رنگ دیا، تو ان لوگوں نے اسلام کی ایسی تعبیر کی جس میں عربیت کا اثر کم سے کم تھا، بلکہ ایک حد تک عربوں سے تفرق کا جذبہ بھی موجود تھا، شیعیت اسلام کی ایرانی تعبیر ہے اور اس میں آل علیؓ کی محبت اساس ہے۔

گو عہد اموی میں حکمران طبقوں پر عربی رنگ غالب تھا، لیکن اہل علم اسلام کی عمومی حیثیت کی بڑی شد و مد سے اشاعت کرتے رہے، چنانچہ اس عمل اور رد عمل کا نتیجہ یہ نکلا کہ غیر عرب مسلمان بھی حکومت میں مساوی حیثیت کا مطالبہ کرنے لگے، اموی عرب پہلے کی طرح عرب قومیت کو ہی اسلام کے مرادف سمجھتے تھے، ان کو یہ احساس نہ تھا کہ ایک صدی میں کتنی اور قومیں مسلمان ہو چکی ہیں اور اب ان کے وجود کا انکار کر کے کوئی سلطنت قائم نہیں رہ سکتی، عباسیوں نے بدلتے ہوئے زمانے کی اس ضرورت کو سمجھ لیا اور وہ ایرانیوں کو ساتھ ملا کر امویوں سے اقتدار چھیننے میں کامیاب ہو گئے۔ اس کے بعد تقریباً ایک سو سال تک ایرانی ایک زبردست شریک کی حیثیت سے عباسی خلافت میں حکومت کا کام سیکھتے رہے۔ آخر کار ان کو بھی اپنی حکومتیں قائم کرنے کے لیے عباسی خلافت کے ماتحت بڑے بڑے وسیع رقبے مل گئے۔ ماموں پہلا خلیفہ تھا جس نے وقت کے اس تقاضے کو پہنچانا اور غیر عرب مسلمانوں کو بڑی فراخ دلی سے مواقع عطا کر کے انہیں عباسی خلافت سے وابستہ رکھا۔

کئی سو سال تک اسلامی دنیا کی یہ حالت رہی کہ ہر اسلامی ملک اپنی اپنی جگہ پر آزاد تھا اور نظم و نسق سلطنت میں وہ کسی دوسری طاقت کو اپنا حاکم اعلیٰ نہ مانتا تھا اس کے باوجود بغداد میں اور پھر قاہرہ میں

ایک نام کی اسلامی خلافت قائم رہی، جس کے ساتھ دور ہی سے عقیدت مندی کا اظہار کرنا اور وہ بھی محض زبانی، سلاطین و ملوک کافی سمجھتے تھے، یہ اسلامی خلافت جس کا وجود دراصل نہ ہونے کے برابر تھا اور جس کا اثر جہاں وہ تھی وہاں کی زندگی کے بھی کسی شعبے پر نہ پڑتا تھا۔ حقیقت میں اسلام کے اس تصور کی یادگار تھی کہ یہ دین قومی نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے۔

آخر یہ رسمی یادگار بھی قائم نہ رہ سکی، عثمانی ترکوں نے قاہرہ فتح کیا، تو یہ نام نہاد عباسی خلافت بھی ختم ہوگی، تسطنطیہ میں عثمانی فرماں روا خلافت کے مدعی تھے، ایران میں شیعہ خلافت قائم تھی۔ ہندوستان میں مغلوں نے اپنی خلافت کا ڈول ڈالا اور مراکش اور الجزائر میں ایک چھوڑی خلیفہ بن گئے۔ یہ خالص قومی سلطنتوں کا زمانہ ہے، اب ہر سلطنت اپنی اپنی جگہ خود مختار اور آزاد تھی۔ عثمانی ترک سرزمین حجاز پر قابض ہونے کی وجہ سے گواپنے آپ کو دوسری سلطنتوں سے ممتاز سمجھتے تھے، لیکن ہندوستان کے مغل سلاطین نے کبھی بھی ان کی برتری تسلیم نہ کی اور ایران کی شیعہ سلطنت تو عثمانیوں کی سخت دشمن تھی اور آئے دن دونوں حکومتوں میں لڑائیاں بھی ہوتی رہتی تھیں۔ شمالی افریقہ کے "خلفاء" تو خود خلفاء تھے۔ وہ بھلا کسی اور کی خلافت کو کیوں مانتے۔ قومی سلطنتوں کا یہ دور مدتوں رہا، لیکن آخر کار ان کو بھی زوال آ گیا اور ایک ایک کر کے یہ ساری سلطنتیں یا "خلافتیں" رخصت ہو گئیں۔ ۱۹۱۳ء کی جنگ عظیم ختم ہوئی تو ان اسلامی سلطنتوں کی آخری نشانی جو خیر سے اسلامی خلافت کی مدعی بھی تھی۔ وہ بھی مٹ گئی۔

اسلام کی بین الاقوامی تحریک کا یہ چوتھا دور تھا اس دور میں زمام اقتدار کلیتہً غیر عرب مسلمان اقوام کے ہاتھ میں آ گئی اور خود عرب قوم اور ان کا ملک تک عثمانی ترکوں کے ماتحت ہو گیا۔ ان مسلمان اقوام پر ان کے قومی بادشاہ حکومت کرتے تھے، یہ ان معنوں میں تو جمہور کے نمائندے نہ تھے کہ ان کے عزل و نصب کا اختیار جمہور کو ہوتا۔ یہ تلوار کے زور سے تخت و تاج کے مالک بنتے تھے اور جوان میں سے صالح ہوتا وہ البتہ جمہور کی مرضی کے مطابق حکومت کرتا تھا۔ آہستہ آہستہ حکمران بادشاہ جمہور سے دور ہٹتے چلے گئے اور آخر کار "شاہیت" اپنے محکموں کے لیے وبال جان بن گئی۔ بد قسمتی سے مسلمان جمہور میں اتنی طاقت نہ تھی کہ وہ ان "بادشاہوں" کو جواب محض نام کے بادشاہ رہ گئے تھے۔ مسند اقتدار سے الگ کر کے خود ملک کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیتے اور دنیائے اسلام میں قومی شاہی حکومتوں کے بجائے قومی جمہوری حکومتیں بن جاتیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یورپ میں تو جمہور نے بیدار ہو کر اپنے مطلق العنان بادشاہوں کو یا تو تخت سے محروم کر دیا، یا انہیں اپنی مرضی کے تابع بنا لیا، لیکن مسلمان جمہور خواب غفلت میں پڑے سوئے رہے اور اگر کبھی ان کو جگانے کی کوشش بھی ہوئی تو مستبد بادشاہوں نے اسے اپنے اقتدار کے خلاف سمجھ کر بار آور ہونے نہ دیا۔

حسن اتفاق دیکھیے کہ ”شاہیت“ کے اس دور میں کم و بیش ایک ہی زمانے میں ہر اسلامی ملک میں ایسی تحریکیں شروع ہوئیں جن کے مخاطب جمہور تھے۔ یہ تحریکیں قومی اور جمہوی تھیں، ان کے بانیوں کے پیش نظر ساری دنیائے اسلام نہ تھی، بلکہ صرف اپنی قوم کے جمہور تھے۔ عثمانی ترکوں کے ہاں اس تحریک نے تنظیمات کی شکل اختیار کی، عربوں میں محمد بن عبدالوہاب پیدا ہوئے۔ شمالی افریقہ میں امیر عبدالقادر نے قوم کی زمام قیادت سنبھالی۔ مصر میں خدیو محمد علی اہل مصر کے قومی جذبات کے ترجمان بنے۔ ایران میں بھی قومی بیداری نے جنم لیا۔ شاہ ولی اللہ اور ان کے نام لیواؤں نے ہندوستان کے مسلمان جمہور کو منظم کرنے کی کوشش کی۔ بدقسمتی سے ان تحریکوں کا بھی آغاز ہی ہوا تھا کہ یورپ کے جمہور جو تقریباً دو صدی پہلے بیدار ہو چکے تھے، مشرقی ملکوں پر پل پڑے اور بجائے اس کے کہ قومی بادشاہوں کی وارث قومی پارلیمنٹری حکومتیں بنیں، یورپ والے بیچ میں آگے اور تمام اسلامی دنیا ان کی ترکتازیوں سے تہ وبال ہو گئی۔

۱۹۱۸ء سے اسلامی دنیا میں ایک نئے دور کی ابتدا ہوئی ہے، اسلامی ملکوں میں ایک صدی پہلے جن قومی جمہوری تحریکوں کا بیج بویا گیا تھا گو یورپ کے سیلاب نے اسے برگ و بار لانے کا اس وقت موقع نہ دیا، لیکن وہ بیج اندر ہی اندر نشوونما پاتا رہا اور جو نہی گزشتہ جنگ عظیم ختم ہوئی اور محکوم قوموں کو سر اٹھانے کی فرصت ملی تو تقریباً ہر اسلامی ملک میں عوام نے آزادی کے لیے جدوجہد شروع کر دی۔ ترکی میں مصطفیٰ کمال نے قومی جمہوی حکومت کی بنا رکھی۔ رضا شاہ ایران کا دستوری فرماں روباہنا۔ عرب کی وہابی تحریک نے ابن سعود کو پیدا کیا اور سارا عرب اس کے جھنڈے تلے آزاد ہو گیا۔ مصر میں سعد زغول نے قومی پارلیمنٹ بنائی۔ عراقیوں نے فیصل کو پہلا دستوری ملک مانا۔ شام، فلسطین، طرابلس، تیونس اور مراکش وغیرہ میں بھی قومی تحریکیں اٹھیں لیکن وہاں کے جمہور اپنی آزاد حکومتیں بنانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ ہندوستان کے مسلمان بعض مخصوص حالات کی بنا پر اپنے ملک کی قومی جمہوری تحریک میں شامل ہونے سے ہچکچاتے رہے۔ ان میں بعض تو یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ہندوستان آزاد بھی ہو گیا تو چونکہ یہاں غیر مسلموں کی اکثریت ہے۔ اس لیے جمہوری نظام میں مسلمان اکثریت کے غلام ہو جائیں گے۔ لیکن دوسرے فریق کا خیال ہے کہ آزاد ہندوستان میں مسلمان کسی کا غلام نہیں رہ سکتا۔

یہ قومی حکومتوں کا جمہوری دور ہے۔ اس دور میں ایک مسلمان قوم کسی دوسری مسلمان قوم کی حکومت قبول کرنے کو تیار نہیں اور نہ کسی اسلامی ملک کے جمہور اپنے مطلق العنان بادشاہ کی استبدادی حکومت ہی گوارا کر سکتے ہیں۔ جن مسلمان بادشاہوں نے رعایا کی خلاف مرضی من مانی حکومت کرنی چاہی ان کا حشر دنیا دیکھ چکی ہے اور جس مسلم قوم نے دوسری مسلم قوم پر زبردستی حکومت کرنے کی کوشش

کی، اس کا انجام بد گزشتہ جنگ عظیم میں عربوں اور ترکوں کے معاملہ میں واضح ہو چکا ہے۔ الغرض اس دور میں ہر اسلامی ملک اپنی جگہ آزاد ہونا چاہتا ہے۔ وہ کسی نام سے بھی اپنے ملک میں دوسروں کی دخل اندازی برداشت نہیں کر سکتا۔ اور نہ وہ دوسروں کے سر پر اپنی حکومت تھوپنے کا روادار ہے۔ چنانچہ ہر قوم اپنی زبان کو ترقی دے رہی ہے۔ افغان، پشتو کی ترویج کر رہے ہیں۔ ایران میں فارسی کو قومی زندگی کے ہر شعبہ میں لازمی بنا دیا گیا ہے۔ عربی بولنے والی قومیں عربی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا چکی ہیں اور ترک تو زبان کے معاملہ میں کافی نام بھی پیدا کر چکے ہیں۔ اس دور میں اسلام کی بین الاقوامی تحریک کی حامل کوئی ایک قوم نہیں رہی۔ مثلاً جس طرح ایک زمانے میں عرب تھے۔ خلافت راشدہ اور بنو امیہ کے ابتدائی عہد میں عرب مرادف تھے مسلمان سے۔ اور مسلمان کے معنی یہ تھے کہ وہ عرب ہیں لیکن ان تیرہ سو برسوں میں اسلام کا دائرہ کافی وسیع ہو چکا ہے۔ اب عربوں کے علاوہ اور قومیں بھی مسلمان ہو چکی ہیں۔ اب اگر کبھی کوئی بین الاقوامی اسلامی ادارہ بنے گا تو اس میں ساری مسلمان قومیں برابر کی شریک ہوں گی۔ یعنی ہر مسلمان قوم اور ہر مسلمان ملک اپنی جگہ آزاد ہوگا۔ پھر یہ آزاد قومیں اور ممالک باہم مل جل کر کسی بین الاقوامی اسلامی ادارہ کی تشکیل کریں گے۔

مولانا فرماتے ہیں کہ اگر ہم ان اہل الرائے کی بات صحیح مان لیں، جن کے نزدیک قومی حکومتوں کا تصور اسلام کے خلاف ہے اور اسلامی حکومت صحیح معنوں میں صرف ایک بین الاقوامی یا مافوق قومی حکومت ہی ہو سکتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ صد ہا سال سے اسلامی حکومت اس دنیا سے ناپید ہے اور پھر جہاں تک اس زمانے کے حالات کا تعلق ہے بظاہر اس کا کوئی امکان نظر نہیں آتا کہ آئندہ کوئی اس طرح کی حکومت معرض وجود میں بھی آسکے۔ مولانا کا کہنا یہ ہے کہ اگر ان کی یہ بات تسلیم کر لی جائے تو نعوذ باللہ اس کے یہ معنی ہونے کہ اسلام بحیثیت ایک نظام سلطنت کے ان تیرہ سو سالوں میں صرف گنتی کے برس جی سکا اور اب اُس کے دوبارہ ابھرنے کا بھی زیادہ امکان نہیں۔ اور جب اسلام کے نظام کی دیر پائی کا یہ عالم ہو تو اس کے عقائد کی بلندی اور پاکیزگی سے دنیا کیا متاثر ہوگی۔ مولانا کے نزدیک اسلام اور اس کی تاریخ کی اس طرح تعبیر کرنے والے دوستی کے پردے میں اسلام کے ساتھ دشمنی کر رہے ہیں اور وہ یہ نہیں سمجھتے کہ جو بلند دعاوی وہ زبان سے پیش کرتے ہیں۔ اگر ان دعاوی کو عملی نقطہ نظر سے پرکھا جائے تو نتیجہً دعاوی کے بالکل برعکس نکلتا ہے۔

خیال پرستوں کا یہ گروہ ہر قوم اور ہر تحریک میں ہوتا ہے۔ روس میں اشتراکیت کو جب عملی شکل دی گئی اور مارکسزم کے نظریوں کو روسی زندگی کی ضرورتوں کے ساتھ مطابقت دینے کی کوشش ہوئی تو اس رجحان والے لوگوں نے چلانا شروع کیا کہ روس میں اشتراکیت ختم ہوگی اس کے بعد جب ٹرانسکی

عربوں کو زوال آیا اور ان میں حکومت اور ترقی کی استعداد ختم ہو گئی تو ضروری تھا کہ ان کی جگہ دوسری قومیں لیتیں، اسلام کی خوش قسمتی تھی کہ عربوں کے دور اقتدار میں ایرانی، ترک اور دوسری غیر عرب اقوام اسلامی تعلیمات سے مستفید ہو چکی تھیں، چنانچہ اسلامی حکومت غیر مسلموں کے ہاتھ میں جانے کے بجائے جیسا کہ ہندوستان میں ہوا، غیر عرب مسلمانوں کے ہاتھ میں آ گئی، ان مسلمان اقوام نے بڑے بڑے کارنامے سرانجام دیئے اور اعلیٰ پایہ کی حکومتیں بنائیں، ان کی بدولت اسلام کو بڑی ترقی نصیب ہوئی اور نئی نئی قومیں اسلام سے مشرف ہو سکیں۔

مولانا فرماتے ہیں کہ عربی خلافتیں ختم ہوئیں، عجمی مسلمان ان کے وارث بنے اور عربوں کی حیثیت محکوموں کی ہو گئی، تو بعض عربوں کے دلوں میں عجمی مسلمانوں کا یہ غلبہ کانٹے کی طرح چبھتا رہا، سیاسی لحاظ سے ان کو عجمی دولتوں کے خلاف سر تابی کرنے کی مجال نہ تھی، لیکن ہنی اور فکری دنیا میں عربوں نے اپنی برتری قائم رکھنے کی برابر کوشش کی، چنانچہ ان کے اہل قلم نے تاریخ اسلام کے غیر عربی دور کو ہمیشہ زوال و بکت اور پبے دینی کا عہد ثابت کیا۔ اسلام کی تاریخ کا یہ تصور ٹھیک نہیں۔ ہماری بد قسمتی ہے کہ اس زمانے میں ہندوستان کے مسلمان اہل علم میں سے جن لوگوں نے بھی تاریخ اسلام پر کتابیں لکھیں، وہ عربی تصنیفات سے بہت متاثر ہوئے اور چونکہ عربی زبان کو ہمارے ہاں مقدس سمجھا جاتا ہے اور اس زبان میں جو کچھ بھی لکھا ہوا ہو، اس کو الہام کا درجہ دیا جاتا ہے۔ اس لیے یہ خیال ہندوستان کے اہل قلم میں بھی عام ہو گیا۔

مولانا نے اسلام کی تیرہ سو سال کی تاریخ کا تنقیدی مطالعہ فرمایا ہے، مکہ معظمہ کے بارہ سالہ قیام میں آپ نے اپنی تاریخ کو از سر نو پڑھا اور فلسفہ تاریخ کے نئے اصول و مبادی کی روشنی میں اسے جانچا۔ آپ فرماتے ہیں کہ میں نے اسلام کی تاریخ کو اس طرح حل کیا ہے کہ میرے ذہن میں تیرہ سو سال کا یہ طویل زمانہ اب بالکل واضح اور صاف ہو گیا ہے اور یہ بحثیں جن میں پڑ کر مسلمان گروہوں میں بٹ گئے، مجھے ان کے متعلق خدا تعالیٰ نے انشراح عطا فرمایا اور ان کے تضادات کو رفع کرنے کی صلاحیت بخشی۔

الغرض اس تمام گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی تاریخ ان مختلف ادوار میں سے گزر چکی ہے۔ حضرت عثمان کی شہادت تک جب کہ ساری امت متفق و متحد رہی، اسلامی حکومت کا مثالی دور ہے۔ حضرت علیؑ کے دو برس عربی قومی حکومت اور ”السابقین الاولین“ کی مثالی حکومت کی بیج کی کڑی ہیں، امیر معاویہ سے مسلمان عربوں کی حکومت شروع ہوتی ہے اور خلیفہ ہارون الرشید پر عربی سیادت کا دور ختم ہو جاتا ہے۔ ماموں سے زوال بغداد تک عباسی خلافت کے زیر سایہ عجمی قومیں برسر اقتدار آتی ہیں۔

اور اس کے ہم خیال معتوب ہوئے تو بار دیگر اشتراکیت کا نوحہ پڑھ گیا اور کومنٹرن کے ٹوٹنے پر بہترے یہ یقین کر چکے ہوں گے کہ اب تو روس سے اشتراکیت کا جنازہ بالکل ہی نکل گیا اور یہ تحریک جس کے اتنے بڑے بڑے دعوے تھے، بیس سال بھی نہ چل سکی، اسی قسم کی باتیں اکثر وہ لوگ کرتے ہیں جو پرواز فکر تو رکھتے ہیں لیکن فکر کی بلندیوں سے اس زندگی کے ٹھوس حقائق کی پستیوں میں کبھی اترنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔ اسلام کے اس طرح کے نظریہ ساز پہلے تو اسلام کے متعلق ایک موہوم تصور پیش کرتے ہیں اور جب اپنے گرد و پیش کی زندگی اور ماضی کی تاریخ میں کہیں بھی اپنے اس موہوم تصور کو عمل کا جامہ پہنتے نہیں دیکھتے تو پھر اپنی ایک خیالی دنیا بساتے ہیں، لوگوں کو اس دنیا میں آباد ہونے کی بڑی گرم جوشی سے دعوت دیتے ہیں اور چونکہ اس کے لیے محض خیال آفرینی شرط ہے اور ماحول سے چھیڑ چھاڑ کرنا ضروری نہیں ہوتا، اس لیے عمل پر خیال کو ترجیح دینے والے ذوق و شوق سے ادھر متوجہ ہو جاتے ہیں اور بزعم خویش سمجھ لیتے ہیں کہ اسلام کی نئی زندگی کا آغاز ہو رہا ہے۔ ان لوگوں کی حالت یہ ہے کہ خود تو کچھ نہیں کر پاتے اور نہ خیالی دنیا سے کبھی باہر قدم رکھتے ہیں لیکن جو لوگ عملی زندگی کی دشواریوں، رکاوٹوں اور آلائشوں کی پروا نہ کرتے ہوئے اپنی قوم کو جس پستی میں وہ ہے اس سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں اور جن حالات میں وہ قوم گھری ہوئی ہوتی ہے، ان حالات کے مطابق قوم کو پستی سے بلندی کی طرف لے جانے کی تدبیریں کرتے ہیں، وہ ان کے نزدیک مردود اور گھٹیا انسان ہیں۔ دوسرے لفظوں میں جو کہے اور کچھ نہ کرے وہ مجدد ملت اور جو کچھ کرنے کی کوشش کرے اور ظاہر ہے کام ہمیشہ گرد و پیش کے حالات کو مد نظر رکھ کر ہی ہو سکتا ہے اور اس کے لیے بلندی سے نیچے اترنا پڑتا ہے، وہ مردود ٹھہرے۔

مولانا کے نزدیک اسلام قومیتوں کا انکار نہیں کرتا۔ وہ قومیت کی اصلاح ضرور کرتا ہے لیکن اسے مٹاتا نہیں۔ عرب مسلمان ہو کر بھی عرب رہے۔ ایرانی مسلمان ہوئے تو انہوں نے اپنی ایرانی قومیت کو کھویا نہیں۔ اسی طرح ترک اسلام لائے اور بحیثیت ایک مسلمان ترک قوم کے انہوں نے اسلام کی بڑی خدمت کی۔ عربوں کے بعد ایرانیوں کا آنا اسلام کی سر بلندی کی علامت ہے اور عربی زبان کے اثر سے نئی فارسی زبان کا بننا اسلامی فکر کی وسعت پذیری کی دلیل ہے، چنانچہ اسی طرح زمانہ گزرتا جائے گا اور نئی نئی قومیں اسلام میں آتی جائیں گی۔ خود مولانا کے اپنے الفاظ میں اسلام کے پہلے داعی عرب تھے۔ انہوں نے بڑے خلوص اور تن دہی سے اسلام کو پھیلایا، پورے پانچ سو برس تک عرب پیغام اسلام کے محافظ اور داعی رہے۔ اس عرصے میں اموی، عباسی اور فاطمی خلافتیں قائم ہوئیں اور انہوں نے عربی سلطنت اور عربی زبان کے ذریعہ اسلام کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا، یقیناً ان سلطنتوں میں غیر عرب مسلمان بھی شامل ہوئے لیکن عربی بن کر یعنی اس دور کی علمی و ادبی زبان عربی رہی، جب

زوال بغداد سے عربیت کا کلی خاتمہ ہوتا ہے اور خالص ترکی دور شروع ہوتا ہے۔

۱۹۱۸ء میں ترکی دور کی آخری نشانی یعنی عثمانی سلطنت کا چراغ سحری بجھ جاتا ہے اور یہاں سے قومی جمہوریتوں کا آغاز ہوتا ہے، مولانا کے نزدیک ہمارا دور قومی جمہوریتوں کا دور ہے۔ لیکن یہ قومی رنگ اسلام کی بین الاقوامی روح کے خلاف نہیں، مسلمانوں کی نجات اب اس میں ہے کہ وہ اپنے اپنے علاقوں میں آزاد ہوں اور آگے چل کر یہ آزادا کائیاں اپنی کوئی بڑی وحدت بنالیں، لیکن اس وقت تو مقدم یہ ہے کہ ہم اپنے وطن میں آزاد ہوں۔ اسلامی بین الاقوامیت کے نام سے قومی تحریکوں کی مخالفت کرنے والے غلط راستہ پر چل رہے ہیں اور ان کی وجہ سے مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ دوسرے اسلامی ممالک میں اس خیال کے لوگ عوام کی نظروں سے گر چکے ہیں، لیکن بد قسمتی سے ہندوستان میں اب تک ان لوگوں کا اثر ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمان اپنے ملک کی آزادی میں ہمسایہ قوموں سے نسبتاً پیچھے رہ گئے ہیں۔

اسلامی افکار میں قومی اور ملکی رجحانات

دین اسلام کسی ایک ملک، قوم یا زمانہ کے لیے مخصوص نہیں۔ اسلام تمام انسانیت کا دین ہے اور قرآن کریم انسانیت کے اس دین کا ترجمان ہے، قرآن کی تعلیم عالمگیر اور ہمہ گیر ہے جتنی کہ خود انسانیت ہے، مشیت ایزدی کا ظہور انسانیت کے تقاضوں کی صورت ہی میں ہوتا ہے۔ قرآن چونکہ انسانیت کے انہیں تقاضوں کا آئینہ دار ہے، اس لیے وہ خدا کا قانون ہے۔

اس عالمگیر قانون کو حجاز میں عملی جامہ پہنایا گیا، یہ جامہ اس عالمگیر قانون کی ایک تعبیر ہے جو زمانہ، ماحول اور اہل حجاز کی طبیعت کے مطابق کی گئی۔ اس تعبیر کو اصل قانون کی طرح عمومی اور ابدی سمجھنا ٹھیک نہیں، لیکن اس تعبیر کی عالمگیر قانون کے خلاف یا اس پر زائد جانا بھی غلط ہے، سنت اس عالمگیر قانون کے حجازی جامہ کی ایک تصویر ہے اور اس سے قرآن کے عالمگیر قانون کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ بعد ازاں جب اسلام کی سلطنت میں توسیع ہوئی اور عربوں کے علاوہ غیر عرب قومیں بھی مسلمان ہو گئیں تو قرآن کی عمومی تعلیم اور اس کی حجازی تعبیر کی روشنی میں فقہ کے دوسرے مذاہب وجود میں آئے، اب اسلام ایک قوم تک محدود نہ رہا تھا بلکہ دنیا کی دوسری بڑی بڑی قومیں بھی مسلمان ہو چکی تھیں۔ اس لیے ہر قوم اور ملک میں وہاں کے خاص حالات اور طبعی رجحانات کے مطابق فقہ کے مذاہب بنے۔

مولانا فرماتے ہیں کہ دین صرف قرآن میں منحصر ہے اور قرآن ہی دین کا قانون اساسی ہے اور آیت ”وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ“ سے مراد صرف قرآن مجید ہے۔ حدیث قرآن سے مستنبط ہے اور فقہ حدیث سے استنباط کی گئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید سے خود سمجھ کر (جیسا کہ شاہ ولی اللہ صاحب فرماتے ہیں) یا مستقل وحی سے اخذ کر کے (جیسا عام اہل علم کہتے ہیں) قرآن پر عمل کرنے کا مفصل پروگرام بنایا، جسے علماء حدیث نے بڑی محنتوں سے دو سو برس کے عرصہ میں جمع کیا۔ مولانا کا کہنا یہ ہے کہ اسلام کی اساسی تعلیم قرآن شریف میں منضبط ہے اور وہ غیر متبدل رہے گی، لیکن جہاں کہیں کسی تعلیم پر عمل ہوتا ہے، تو مخاطبین کی حالت کے مطابق چند تمہیدی قوانین بنائے جاتے ہیں، تعلیم اساسی تو غیر متبدل ہوتی ہے لیکن تمہیدی قوانین ضرورت کے وقت بدل سکتے ہیں۔ ہم سنت ان تمہیدی قوانین کو کہتے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بعد خلفاء ثلاثہ نے مسلمانوں کی

مرکزی جماعت کے مشورے سے تجویز کیے، مولانا کے نزدیک یہ سنت قرآن ہی سے مستخرج ہے۔
الغرض دین کا اصل اساس قرآن ہے، قرآن نے جس قسم کی زندگی پیدا کی اور اس سلسلے میں جو تمہیدی قوانین بنے، اس کی صحیح ترین تصویر امام مالک کی کتاب مؤطا میں ہے، مولانا فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجاز کی رجعت پسند قوتوں کو زیر کیا۔ حضرت ابو بکرؓ کا عہد عرب قبائل کی رجعت پسند طاقتوں کو ختم کرنے میں گزرا۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں دو ترقی یافتہ لیکن زوال پذیر دشمن سلطنتوں کو ختم کیا گیا اور ایک نیا نظام معرض وجود میں آیا، جو بنو امیہ کے زمانے میں گو حکومت پر عربی رنگ غالب آ گیا، لیکن مسلمان کا علمی و ذہنی مرکز بدستور مدینہ ہی رہا۔ چنانچہ اس مرکز کا حاصل علم مؤطا ہے اور یہی سارے فقہی مذاہب کی اصل ہے۔ ایک طرف امام شافعی نے جو عربی فقہ کے بانی ہیں، امام مالک سے مؤطا پڑھی۔ دوسری طرف امام ابو حنیفہ کے دونوں شاگردوں نے جو اپنے استاد کے ساتھ حنفی فقہ کو ترتیب دینے میں برابر کے شریک تھے، مؤطا سے استفادہ کیا اور بعد میں جب حدیثوں کے دوسرے مجموعے مرتب ہوئے تو ان آئمہ حدیث کے پیش نظر بھی مؤطا کی شرح و تفصیل رہی۔

مولانا کے نزدیک مؤطا امام مالک ایسی مرکزی کتاب ہے جس پر سارے فقہاء اور محدثین متفق ہیں۔ نیز مؤطا میں جو روایتیں درج ہیں، ان کی خصوصیت یہ ہے کہ روایت کرنے والوں کی پرکھ زیادہ مشکل نہیں، کیونکہ عموماً ایک سلسلہ روایت میں ایک دو ہی راوی ہوتے ہیں۔ ان کا اکثر حصہ علماء مدینہ سے ہے جن کو آئمہ مسلمین معتمد اور ثقہ مانتے ہیں۔ مؤطا کے بارے میں شاہ ولی اللہ صاحب فرماتے ہیں کہ جو شخص ان کے مذاہب کی چھان بین کرے اور وہ انصاف سے کام لے تو لا محالہ اسے ماننا پڑے گا کہ امام مالک کے مذاہب کی اساس اور مدار مؤطا ہے ہی، شافعی اور احمد حنبلی کے مذاہب کی بنیاد بھی اسی پر ہے اور ابو حنیفہ اور ان کے دونوں شاگردوں کے مذاہب کے لیے مؤطا ہی شمع ہدایت ہے۔ گویا یہ مذاہب شرح ہیں اور مؤطا متن، یہ شاخیں ہیں اور وہ تنہا۔ یہ لوگ امام مالک کے استنباط کی تو مخالفت کرتے ہیں مگر ان کی روایت کا انکار نہیں کرتے اس کے علاوہ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ حدیث کی کتابیں مثلاً صحیح مسلم ابو داؤد، نسائی، صحیح بخاری اور ترمذی مؤطا ہی کی شرحیں ہیں۔ ایک دفعہ مولانا سے عرض کیا گیا کہ فلاں صاحب حدیث کا انکار کرتے ہیں، ان کا کہنا یہ ہے کہ حدیث کی کتابوں میں ایسی حدیثیں مروی ہیں کہ ان کی وجہ سے مجبوراً حدیث کا انکار کرنا پڑتا ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ ہمارے نزدیک حدیث یا سنت اس زندگی کی تصویر پیش کرتی ہے، جو قرآن کی تعلیمات کی بدولت وجود میں آئی۔ اب اگر قرآن کو اس کے عملی نتیجے سے الگ کر کے پڑھیے تو ذہنی پریشانی اور انتشار کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ لیکن اگر یہ پیش نظر رہے کہ قرآن نے ایک زمانہ میں انسانوں کے ایک گروہ کو یوں بدلاتھا۔ اس

گروہ نے قرآن کے اصولوں کو اس طرح کی عملی شکل دی تھی اور اس سے یہ نتائج نکلے تھے تو نئی زندگی کی تشکیل میں آئندہ بھی قرآن اساس بن سکتا ہے۔ ورنہ اگر معاملہ محض نظریات ہی کا رہے اور نظری اعتبار سے ہی یہ ثابت کیا جائے کہ قرآن کی تعلیمات اتنی اعلیٰ اور عمدہ ہیں کہ دوسری الہامی کتابیں اس کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں، تو اس زمانے میں ان بحثوں سے کوئی متاثر نہیں ہوگا۔ دیکھنا تو یہ ہے کہ ایک سوسائٹی پر قرآن کی تعلیمات کا کیا اثر ہوا۔ چنانچہ اگر ہم سنت کو حذف کر دیں تو ان تعلیمات کے اثر کا کیسے پتہ چلے گا۔

قرآن تو خدا کے فضل سے محفوظ ہے ہی، لیکن قرآن نے جس قسم کی سوسائٹی بنائی۔ اس کا خاکہ بھی مؤطا میں موجود ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ قرآن کو اس نظر سے دیکھنا چاہیے کہ وہ خارج میں معاشرہ پر کیا اثر ڈالتا ہے۔ ورنہ کتابوں میں تو سب کچھ لکھا ہے اور ہر شخص اپنی مذہبی کتاب کو نادر سے نادر اور بلند سے بلند فکر کا حامل ثابت کر سکتا ہے۔ سوال نظریات کا نہیں بلکہ ان کے عملی نتائج کا ہے۔ منوسمرتی کو آج کون سمجھتا ہے، لیکن اس کے اثر سے جو سوسائٹی بنی وہ دیکھی جائے گی۔ اس طرح قرآن کی اصل حقیقت آج کتنی مبہم ہو رہی ہے، لیکن قرآن نے جو سوسائٹی بنائی، اس سے قرآن کی عظمت کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔ سنت کا انکار کرنے والے دراصل قرآن سے مترتب ہونے والے نتائج کا انکار کرتے ہیں۔ قرآن کے متعلق یہ نقطہ نظر اس بات کی دلیل ہے کہ ایسے لوگ قرآن کی تعلیمات کو عملی زندگی میں منتقل کرنا ضروری نہیں سمجھتے۔ بد قسمتی سے مسلمانوں میں یہ روگ عام ہے۔ وہ قرآن کی حقانیت کو تو بڑے زور شور سے ثابت کرتے ہیں لیکن یہ بھول جاتے ہیں کہ اس حقانیت کا خود ان کی زندگی پر بھی کچھ اثر پڑتا ہے یا نہیں۔ مولانا کے خیال میں اگر مسلمان اسلام کو اس نظر سے دیکھنے لگ جائیں کہ ان کی عملی زندگی میں اس کا کتنا عمل دخل ہے تو پھر شاید ان کو احساس ہو کہ اسلام اور ان کی زندگی میں کس قدر بعد پیدا ہو گیا ہے۔

ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ قرآن کی تعلیمات انسانیت کی طرح عالمگیر، ہمہ گیر اور دائمی ہیں۔ وہ ہر ملک کے لیے ہیں۔ ہر قسم کے لیے ہیں اور ہر زمانہ کے لیے ہیں۔ لیکن یہاں کسی کو یہ گمان نہ گزرے کہ مؤطا میں جس نظام کو مدون کیا گیا ہے، قرآن کی ساری کی ساری تعلیمات اسی میں منحصر ہیں۔ بے شک مدینہ کی سوسائٹی قرآنی تعلیمات کا نتیجہ تھی اور خلافت راشدہ کے دور میں مسلمانوں کی جو زندگی تھی وہ قرآن کے حکام کے مطابق ہی تشکیل ہوئی لیکن اس سے یہ سمجھ لینا کہ قرآن اسی زندگی میں محدود ہو گیا، ٹھیک نہیں۔ مولانا کے نزدیک نبی کی دو حیثیتیں ہوتی ہیں۔ ایک قومی اور دوسری عمومی۔ نبی جس قوم یا ملک میں پیدا ہوتا ہے اور جن لوگوں کو سب سے پہلے خدا کا پیغام پہنچاتا ہے ان کی عادات اور خصوصیات

کا اصرار کی تعلیم صلی اللہ علیہ وسلم میں مبعوث ہوئے اور عرب تعلیمات کے قالب کا عربی ذہنیت کے مطابق ہونا تعلیمات کے اسی عربی قالب کا موقع ہے۔ آگے چل کر مؤطا کی مدد سے اپنے اپنے ملک کے لیے اور فقہی قوانین خصوصیات کی وجہ سے اس میں تبدیلیاں بھی کیں۔

ت کے اے
ماں سکتی ہیں
ب تھے۔ اس
ڈطا دراصل قرآر
مسلمان ہوئیں تو انہ
میں مناسب سمجھا، اپنی

مذہب یا دین مجموعہ ہوتا ہے حکمت اور فقہ کا حکمت درحقیقت ہے۔ قرآن کی حکمت میں جتنی عربیت ہے، اتنی عجمیت اور ہندوستانییت بھی ہے۔ اس حکمت سے جر طرح مستفید ہو سکتا ہے، اسی طرح دوسری قوم کا آدمی بھی، جس کی زبان عربی نہ۔ آئی حکمت سے فیض پاسکتا ہے۔ حکمت انسان میں تلاش و تفحص، نظر و فکر اور تقدم و تبدیلی کا ملکہ پیدا کرتی ہے۔ دماغ حکمت کے اثر سے سوچنے پر مجبور ہوتا ہے وہ ارد گرد کی دنیا پر نظر ڈالتا ہے۔ اپنی زندگی کا جائزہ لیتا ہے اور نئی نئی راہیں ڈھونڈتا ہے۔ فقہ نام ہے نظام کی مدون صورت کا، انسان جس ماحول میں رہتا ہے، اس کے مطابق اسے اپنے لیے قواعد و ضوابط بنانے پڑتے ہیں۔ اگر زندگی ان قواعد و ضوابط سے آزاد ہو جائے اور انسان کسی ایسے قانون کا پابند نہ رہے جو اس کی حرکات و سکنات اور شب و روز کی سرگرمیوں کو ضبط میں نہ رکھے تو اس کا نتیجہ مکمل بد نظمی اور زناج ہے۔ زندگی میں فقہ یعنی مدون قانون کی بھی ضرورت ہے اور حکمت کی بھی۔ اگر حکمت اور فقہ ساتھ ساتھ ہیں تو انسان آگے بھی بڑھتا ہے اور ماضی سے بھی اپنا رشتہ قائم رکھتا ہے۔ حکمت تقدم (Progressiveness) اور فقہ تحقیق (Conservatism) کا باعث بنتی ہے لیکن اگر فقہ سے بالکل بے تعلقی اختیار کی جائے تو لازمی طور پر اس سے جماعت میں انتشار پیدا ہوتا ہے اور اگر فقہ ہی فقہ زندگی پر حاوی ہو جائے تو دماغ جامد ہو جاتا ہے اور ترقی کا کوئی امکان نہیں رہتا۔

مولانا نے مثال کے طور پر ایک دفعہ فرمایا کہ مدرسہ دیوبند کے بانی مولانا محمد قاسم صاحب حکیم تھے اور رشید احمد گنگوہی فقہی۔ نہ اول الذکر فقہ کی اہمیت کے منکر تھے اور نہ مولانا رشید احمد گنگوہی حکمت کے مخالف۔ لیکن آخر الذکر بزرگ جانتے تھے کہ زندگی کے تسلسل کے لیے فقہی نظام کی اشد ضرورت ہے۔ اس لیے وہ اس پر زور دیتے رہے۔ مولانا کے خیال میں بعد میں آنے والے حکمت اور فقہ کا یہ لزوم بھول گئے اور اسی وجہ سے اب مدرسہ دیوبند جمود اور رجحیت کا مرکز بن کر رہ گیا ہے۔

حکمت متقاضی تھی کہ اس کی تعلیمات جتنی بھی عام اور عالمگیر ہو سکیں ہوں، لیکن یعنی تحقیق کا جس کا مظہر فقہ اور قانون ہوتا ہے۔ مطالبہ تھا کہ جس ماحول اور قوم کا ہے، وہاں کے لوگوں کی خصوصیات، عادات اور طبعی رجحانات کا خیال رکھا

زند
میں یہ
جاتا۔

عمومیت اور خصوصیت یا دوسرے لفظوں میں حکمت اور فقہ کا بیان کچھ تفصیل چاہتا ہے۔ اس میں اس موضوع پر بڑی سیر حاصل بحث کی ہے۔ موصوف لکھتے ہیں کہ مذہب۔ بہت بڑی غلطی اس وجہ سے پیدا ہوئی ہے کہ لوگ انبیاء کے اصول طریقہ تعلیم کو ملحوظ نہیں رکھتے، علم کلام کی کتابوں میں اس ضروری نکتہ کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔ لیکن امام رازی نے مطالب عالیہ میں ابن رشد نے کشف الاولیاء میں اور شاہ ولی اللہ صاحب نے حجتہ اللہ البالغہ میں تفصیل کے ساتھ یہ اصول بیان کیے ہیں۔ ان میں سے ضروری ذکر یہ ہیں۔

۱۔ انبیاء کو اگرچہ عوام و خواص دونوں کی ہدایت مقصود ہوتی ہے لیکن چونکہ عوام کے مقابلے میں خواص کی تعداد اقل قلیل ہوتی ہے، اس لیے ان کی طرز تعلیم اور طریقہ ہدایت میں عوام کا یہ پورا پورا ملحوظ ہوتا ہے۔ البتہ ہر جگہ حتمن میں ایسے الفاظ موجود ہوتے ہیں جن سے اصل حقیقت کی طرف اشارہ ہوتا ہے اور جس کے مخاطب خواص ہوتے ہیں۔ امام رازی نے آیات متشابہات کے ورود کے متعلق سب سے قوی وجہ یہ بیان کی ہے کہ ”قرآن ایسی کتاب ہے جس سے خاص و عام سب کو حق کی طرف دعوت دی گئی ہے اور عوام کا یہ حال ہے کہ ان کی طبیعت اکثر امور میں حقائق کے ادراک کا انکار کرتی ہے۔ اسی لیے مصلحت یہ تھی کہ ایسے الفاظ کے ساتھ حقیقت واقعی بھی ملحوظ ہوا۔“ (تفسیر کبیر آل عمران۔ آیت ھُوَ الَّذِي أَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ آيَاتٌ مُحْكَمَاتٌ)۔ ابن رشد فصل المقابل میں لکھتے ہیں۔ شریعت کا مقصود اولیٰ جمہور عوام کے ساتھ اعتناء کرنا ہے، تاہم خواص کی تنبیہ سے بھی چشم پوشی نہیں کی جاتی۔

۲۔ انبیاء لوگوں کی عقل و علم کے لحاظ سے ان سے خطاب کرتے ہیں لیکن اس علم و عقل کے لحاظ سے جو اکثر افراد میں پائی جاتی ہے، اکتساب، مجاہدہ، مراقبہ، ممارست کی وجہ سے جو علم و عقل پیدا ہوتی ہے وہ انبیاء کے خطاب کا موضوع نہیں، شاہ ولی اللہ صاحب حجتہ اللہ البالغہ میں فرماتے ہیں اور انبیاء کے اصول میں سے ایک یہ ہے کہ وہ لوگوں سے ان کی خلقی عقل کے موافق خطاب کرتے ہیں۔ اس لیے انبیاء نے محض اس فہم و ادراک کے لحاظ سے خطاب کیا جو ان لوگوں کی خلقت میں ودیعت ہے، چنانچہ انبیاء نے لوگوں کو یہ تکلیف نہیں دی کہ وہ خدا کو تجلیات، مشاہدات، براہین اور قیاسات کے ذریعہ پہچانیں، نہ ان کو اس بات پر مکلف کیا کہ وہ خدا کو ہر جہت اور ہر حیثیت سے منظرہ خیال کریں۔

۳۔ سب سے زیادہ قابل لحاظ یہ امر ہے کہ انبیاء، تہذیب اور اخلاق اور تزکیہ نفس کے سوا اور قسم کے مسائل اور مباحث اور حقائق سے متعرض نہیں ہوتے اور اس قسم کے امور کے متعلق جو بیان کرتے ہیں تو انہی کی روایات اور خیالات کے مطابق اور اس میں بھی استعارات اور مجازات سے کام لیتے ہیں۔ حجۃ اللہ البالغہ میں لکھا ہے کہ انبیاء کے اصول میں سے ایک یہ بات ہے کہ جو امور تہذیب نفس اور سیاست قومی سے تعلق نہیں رکھتے، ان میں وہ دخل نہیں دیتے۔ مثلاً کائنات الجو، یعنی بارش، گرہن، ہالہ کے پیدا ہونے کے اسباب، نباتات اور حیوانات کے عجائبات، چاند سورج کی رفتار کی مقدار اور حوادث یومیہ کے اسباب انبیاء، سلاطین اور ممالک کے قصے وغیرہ وغیرہ۔ ان چیزوں سے وہ بحث نہیں کرتے۔ مگر وہاں کچھ چند معمولی باتیں جن سے لوگوں کے کان مانوس ہو چکے ہیں اور ان کی عقلوں نے ان باتوں کو قبول کر لیا ہے اور ان باتوں کو بھی وہ لوگ خدا کی شان اور قدرت کے ذکر میں ضمنی طور پر اجمالاً بیان کرتے ہیں اور اس میں مجاز اور استعارہ سے کام لیتے ہیں اور اسی اصول کی بنا پر جب لوگوں نے آنحضرتؐ سے چاند کے گھٹنے بڑھنے کا۔ بپوچھا تو خدا نے اس کے جواب میں اعراض کیا اور اس کے بجائے مہینوں کا فائدہ بیان کر دیا۔ چنانچہ فرمایا: "يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْاَهْلِ" الخ۔ اور اکثر لوگوں کا مذاق ان فنون کے ساتھ مالوف ہونے کی وجہ سے خراب ہو گیا ہے تو یہ لوگ انبیاء کے کلام کو خلاف حقیقت محل پر محمول کرتے ہیں۔

۴۔ ایک عام اصول جس پر تمام انبیاء کا عمل رہا، یہ ہے کہ وہ جس قوم میں مبعوث ہوتے ہیں۔ اس کے اکل و شرب، لباس، مکان، سامان آرائش، طریقہ نکاح، زوجین کے عادات، بیع و شرا، معاصی پر دار و گیر، فصل قضایا، غرض اس قسم کے تمام امور پر نظر ڈالتے ہیں، اگر یہ چیزیں دیسی ہی ہیں۔ جیسا ان کو ہونا چاہیے تو پھر کسی قسم کا تبدل تغیر نہیں کرتے بلکہ ترغیب دلاتے ہیں کہ یہ رسوم و آئین، صحیح اور واجب العمل اور مبنی علی المصالح ہیں۔ التبتہ اگر ان میں کچھ نقص ہوتا ہے مثلاً وہ آزار رسانی کا ذریعہ ہو یا لذات دنیوی میں انتہاک کا باعث ہوں۔ یا اصول احسان کے مخالف ہوں یا انسان کو دنیاوی اور دینی مصالح سے بے پروا کر دینے والے ہوں تو ان کو بدل دیتے ہیں۔ وہ بھی اس طرح نہیں کہ سرے سے انقلاب کر دیں بلکہ اس قسم کی تبدیلی کرتے ہیں جس کے مشابہ کوئی چیز قوم میں پہلے سے موجود ہوتی ہے یا ان لوگوں کے حالات میں اس کی مثالیں پائی جاتی ہیں جن کو قوم اپنا مقتدر اور پیشوا تسلیم کرتی آتی ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب یہ اصول نہایت تفصیل سے بیان کر کے لکھتے ہیں۔ (حجۃ اللہ البالغہ صفحہ ۱۰۹، ۱۱۰) اور اسی وجہ سے انبیاء کی شریعتیں مختلف ہیں اور جو لوگ علم میں پختہ کار ہیں وہ جانتے ہیں کہ شریعت نے نکاح، طلاق، معاملات آرائش، لباس، قضا، تعزیرات، غنیمت میں کوئی ایسی بات پیش نہیں کی جس کو وہ لوگ

سرے سے نہ جانتے ہو یا ایسی جس کے قبول کرنے میں ان کو پس و پیش ہو۔ ہاں یہ ضروری ہوا کہ جو کجی تھی سیدھی کر دی گئی اور جو خرابی تھی رفع کر دی گئی۔

۵۔ انبیاء پر جو شریعت نازل ہوتی ہے اس کے دو حصے ہوتے ہیں۔ ایک وہ عقائد و مسائل جو مذہب کے اصول کلیہ ہوتے ہیں اس حصے میں تمام شریعتیں متحد ہوتی ہیں۔ مثلاً خدا کا وجود، توحید، ثواب، عقاب، شعائر اللہ کی تعظیم، نکاح، وارثت وغیرہ۔ دوسرے وہ احکام و سنن جو خاص خاص انبیاء کے ساتھ مخصوص ہوتے ہیں اور جن کی بنا پر کہا جاتا ہے کہ شریعت موسوی مثلاً شریعت عیسوی سے مختلف ہے۔ شریعت کا حصہ خاص خاص قوموں یا ملکوں کے مصالح اور فوائد پر مبنی ہوتا ہے اور اس کی بنیاد زیادہ تر ان خیالات عقائد عادات معاملات رسوم طریقہ معاشرت اور اصول تمدن پر ہوتی ہے جو پہلے سے اس قوم میں موجود تھے۔ شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں: اس طرح شریعت میں ان علوم اور اعتقادات و عادات کا لحاظ رکھا جاتا ہے، جو قوم میں مخزون اور جاری و ساری ہوتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ اونٹ کا گوشت اور دودھ بنی اسرائیل پر حرام ہوا۔ اور بنی اسمعیل پر حرام نہ ہوا۔ اور یہی وجہ ہے کہ کھانوں میں پاک اور نجس کی تفریق عرب کے مذاق پر محمول کی گئی اور یہی وجہ ہے کہ بھانجی سے شادی کرنا ہمارے مذہب میں حرام ہے اور یہود کے ہاں نہیں۔

آگے چل کر مولانا شبلی لکھتے ہیں کہ مذکورہ بالا اصول تمام انبیاء میں مشترک ہوتے ہیں لیکن جس نبی کی رسالت عام ہوتی ہے اور تمام عالم کی اصلاح کے لیے مبعوث ہوتا ہے اس کی ہدایت اور تلقین میں بعض زائد خصوصیات ہوتی ہیں جو اور انبیاء میں نہیں پائی جاتیں۔

”اد پر بیان ہو چکا ہے کہ پیغمبر جس قوم میں مبعوث ہوتا ہے، اس کی شریعت اس قوم کے عادات اور خصوصیات کا خاص طریقہ پر لحاظ ہوتا ہے لیکن جو پیغمبر تمام عالم کے لیے مبعوث ہوا اس کے طریقہ تعلیم میں یہ اصول چل نہیں سکتا کیونکہ نہ وہ تمام دنیا کی قوموں کے لیے الگ الگ شریعتیں بنا سکتا ہے، نہ تمام قوموں کی عادات اور خصوصیتیں باہم متفق ہو سکتی ہیں۔ اس لیے وہ پہلے اپنی قوم کی تعلیم و تلقین شروع کرتا ہے اور ان کو محاسن اخلاق کا نمونہ بناتا ہے یہ قوم اس کے اعضاء اور جوارح کا کام دیتی ہے اور اسی کے نمونہ پر وہ اپنی تلقین کا دائرہ وسیع کرتا جاتا ہے۔ اس کی شریعت میں اگرچہ زیادہ تر وہ قواعد کلیہ اور اصول عامہ ہوتے ہیں، جو قریباً تمام دنیا کی قوموں میں مشترک ہیں، تاہم خاص اس کی قوم کی عادات اور خصوصیات کا لحاظ زیادہ ہوتا ہے لیکن جو احکام ان عادات اور حالات کی بنا پر قائم ہوتے ہیں۔ ان کی پابندی مقصود بالذات نہیں ہوتی اور نہ ان پر چنداں زیادہ زور دیا جاتا ہے۔“

اس اصول کو شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ (صفحہ ۱۲۳) میں نہایت تفصیل سے لکھا

ہے، چنانچہ فرماتے ہیں: ”یہ امام جو تمام قوموں کو ایک مذہب پر لانا چاہتا ہے، اس کو اور چند اصول کی جو اصول مذکورہ بالا کے علاوہ ہیں، حاجت پڑتی ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ ایک قوم کو راہ راست پر بلاتا ہے۔ اس کی اصلاح کرتا ہے اس کو پاک بنا دیتا ہے پھر اس کو اپنا دست و بازو قرار دیتا ہے۔ یہ اس لیے کہ یہ ہو نہیں سکتا کہ یہ امام تمام دنیا کی قوموں کی اصلاح میں جان کھپائے۔ اس لیے ضروری ہوا کہ اس کی شریعت کی اصل بنیاد تو وہ ہو جو تمام عرب و عجم کا فطری مذہب ہو۔ اس کے ساتھ خاص اس کی قوم کے عادات اور مسلمات کے اصول بھی لیے جائیں اور ان کے حالات کا لحاظ بہ نسبت اور قوموں کے زیادہ تر کیا جائے، پھر تمام لوگوں کو اس شریعت کی پیروی کی تکلیف دی جائے۔ کیونکہ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ہر قوم اور ہر پیشوائے قوم کو ہر زمانے میں اجازت دے دی جائے کہ وہ اپنی شریعت آپ بنا لیں۔ اس سے تو شریعت کا جو مقصود ہے وہ بھی فوت ہو جائے گا۔ نہ یہ ہو سکتا ہے کہ ہر قوم کی عادات اور خصوصیات کا پتہ لگایا جائے اور ہر ایک کے لیے الگ الگ شریعت بنائی جائے اس بناء پر اس سے بہتر اور آسان کوئی اور طریقہ نہیں کہ خاص اس قسم کی عادات، شعائر، تعزیرات اور انتظامات کا لحاظ کیا جائے، جن میں یہ امام پیدا ہوا ہو، اس کے ساتھ آنے والی نسلوں پر ان احکام کے متعلق چنداں سخت گیری نہ کی جائے۔

اس کے بعد مولانا شبلی فرماتے ہیں کہ اس اصول سے یہ بات ظاہر ہوگی کہ شریعت اسلامی میں چوری، زنا نقل وغیرہ کی جو سزائیں مقرر کی گئی ہیں، ان میں کہاں تک عرب کی رسم و رواج کا لحاظ رکھا گیا ہے اور یہ کہ ان سزاؤں کا بعبیہ اور خصوصاً پابند رہنا کہاں تک ضروری ہے۔ یہاں مولانا شبلی کا بیان ختم ہوتا ہے۔

یقیناً قرآن نے جس قوم میں کہ وہ نازل ہوا، اس قوم کی عادات، شعائر، تعزیرات اور انتظامات کا لحاظ رکھا ہے لیکن اس سے قرآن کی عمومیت اور ہمہ گیریت پر کوئی حرف نہیں آتا، کیونکہ بعقول مولانا شبلی ”جو احکام ان عادات اور حالات کی بنا پر قائم ہوتے ہیں، ان کی پابندی مقصود بالذات نہیں ہوتی اور نہ اس پر چنداں زور دیا جاتا ہے، مولانا کے نزدیک بھی قرآن میں کہیں کہیں جو احکام ہیں، وہ دراصل ایک مثال کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس احکام کو اپنی مخصوص شکل میں ابدی اور عالمگیر ماننا صحیح نہیں۔ عرب کے خاص حالات میں قرآن کے عمومی پیغام کو صرف ان احکام کے ذریعہ ہی عملی صورت دی جاسکتی تھی۔

مولانا نے ایک دفعہ اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ علماء جن کے پیش نظر عام انسانیت کی مجموعی ترقی اور بہبود ہوتی ہے وہ انبیاء کی تعلیمات کے عمومی پہلو پر زیادہ زور دیتے ہیں اور ان کے نزدیک انبیاء کے وہ احکام اور قوانین جو کسی خاص قوم اور ایک خاص زمانے کے مخصوص حالات کے

خیال سے مرتب ہوتے ہیں، عالمگیر اور دائمی نہیں ہوتے، مولانا کے خیال میں شاہ صاحب کے حکمت آفرین طبیعت کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے سب سے پہلے انبیاء کی تعلیمات کی اساس متعین کی اور اس اساس کو انسانیت عامہ اور فطرت کے اصولوں کے ساتھ مطابقت دی۔ پھر اپنی حکمت کے اصول وضع فرمائے، چنانچہ شاہ صاحب کی حکمت انبیاء کی تعلیمات اور انسانیت عامہ کے اصولوں دونوں پر شامل اور جامع ہے اور وہ دونوں کو باہم دگر اس طرح سمو دیتی ہے کہ انبیاء کی تعلیمات اور انسانیت عامہ کے اصولوں میں کوئی تضاد اور اختلاف نہیں رہتا۔ شاہ صاحب کی اس حکمت کو ماننے سے میرے دل پر یہ اثر ہوا ہے کہ اگر میں کسی دوسرے مذہب کے آدمی کو یا اس شخص کو جو کسی مذہب کو بھی ہرے سے نہیں مانتا، انسانی فلاح و بہبود کا کام کرتا دیکھوں تو میرے دل میں اس کی عزت اور محبت جاگزیں ہوتی ہے، کیونکہ شاہ صاحب کی حکمت سے میں یہ سمجھا ہوں کہ انبیاء کی تعلیم کا اصل مقصد انسانیت کی ترقی اور تقدم ہے اب اگر کوئی شخص انسانیت کے ارتقاء کے لیے کوشاں ہے تو میں اسے کیسے انبیاء کے مقاصد کا مخالف سمجھوں اور اس سے نفرت کروں۔

مولانا فرماتے ہیں کہ نبوت انسان کی جبلی استعدادوں کا انکار نہیں کرتی اور انسان کی جبلی استعدادیں اس کے خاص ماحول سے ہی بنتی ہیں۔ مثلاً ہندوستان میں فطرتاً ذبح حیوانات پسندیدہ نہیں، اس لیے اگر کوئی ہندوستانی ذبح حیوانات سے بچے، تو اس کا یہ فعل خلاف نبوت نہ ہوگا، کیونکہ انسانوں کی جو فطرت ہوتی ہے، نبوت اس کے بالکل خلاف نہیں جاتی۔ نبوت کا کام یہ ہے کہ وہ افراد کے فطری، رجحانات اور ان کی جبلی استعدادوں کے مطابق ان کے لیے ترقی کی راہیں بتائے، گو نبوت کا موضوع اصلی فرد نہیں بلکہ اجتماع انسانی ہوتا ہے، لیکن اجتماع کے لیے جو وہ قانون تجویز کرتی ہے، اس سے فرد کی شخصیت کی تکمیل بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ نبوت اجتماعیت کا دستور یوں مرتب کرتی ہے کہ اس سے افراد کی شخصیت صحیح طور پر ابھرتی ہے اور وہ اجتماعیت کے لیے ترقی اور رونق کا باعث بنتے ہیں۔ مولانا کا کہنا یہ ہے کہ افراد کی شخصیتیں صرف اس طرح ابھر سکتی ہیں کہ قدرت کی طرف سے جو بھی استعدادیں انہیں ملی ہیں ان کو جلا دی جائے۔ ان کی صحیح تربیت ہو اور ان استعدادوں کے مفید اور صالح بننے کے جو بھی امکانات ہوں ان کی بالقوہ سے بالفعل میں بدلا جائے۔ افراد کی یہ جبلی استعدادیں نتیجہ ہوتی ہیں، ان کے مادی ماحول اور تمدنی اور نفسی رجحانات کا۔ جنہیں ہم دوسرے لفظوں میں ”فطرۃ“ کہتے ہیں۔ شاہ صاحب تفسیرات جزو اول ۶۸ میں فرماتے ہیں کہ ”النہوۃ تحت الفطرۃ“ نبوت کے فطرت کے ماتحت ہونے کا یہی مطلب ہے۔ شاہ صاحب کے بیان کا خلاصہ یہ ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:-

”تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ نبوت فطرت کے ماتحت ہوتی ہے بات یہ ہے کہ انسان جو بچس

عمارت گرا کر نئے سرے سے اسے بنواتا اور اس میں یہ تبدیلیاں کرتا۔

وقتی مصالح قومی رجحانات اور ملکی ضروریات کی حیثیت اپنی جگہ بالکل مسلم ہے اور اس بنا پر جو قاعدے اور ضابطے بنتے ہیں ان کی بھی زندگی میں بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ لیکن ان کو عالمگیر مذہب کے ارکان اصلی بنالینا یہ غلطی ہے۔ مثال کے طور پر آج سیاسی زندگی کی ایک مثال لیجیے، ہندوستان کے موجودہ حالات میں زیر دست رعایا کے پاس حاکموں کی دراز دستیوں کو روکنے کے لیے سوائے عدم تشدد کے اور کوئی حربہ نہیں اور اگر نہتی رعایا تشدد پر اتر بھی آئے تو اس کے پاس نہ تو تشدد کے ہتھیار ہیں اور نہ اس میں اتنی ہمت ہے کہ ان ہتھیاروں سے کام لے۔ اس لیے مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ ظلم کی مدافعت تو ضرور ہو لیکن عدم تشدد کے ذریعہ ہو۔ چنانچہ عدم تشدد کا یہ سیاسی مسلک ہندوستان کے خاص حالات اور پھر ایک خاص زمانے کی ضرورتوں کا نتیجہ ہے لیکن جب اس مسلک کے قائل ساری قوموں کو عدم تشدد کا اپدیش دیتے ہیں اور دنیا کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ عدم تشدد ہی عالمگیر صداقت کا اصل اصول ہے، تو یہ ان کی زیادتی ہوتی ہے۔

مولانا فرماتے ہیں کہ وہ مبادی اور اصول جو تمام قوموں کے مہذب اور عقلمند طبقوں میں مشترک ہیں۔ یہ ہیں دراصل انسانیت کی اساس۔ اسے ہم حکمت کہتے ہیں، قانون نام ہے کسی خاص قوم کا۔ اس حکمت کی اساس پر۔ اپنے لیے دستور بنانا یہ دستور جو وضع کیا جاتا ہے اس میں ماحول کی ضروریات کی مطابقت لازمی ہوتی ہے۔ مولانا نے ایک دفعہ شاہ صاحب کے رسالہ سطعات کو پڑھاتے ہوئے فرمایا کہ ایک خاص زمانے میں جو نظام بنتا ہے وہ آخری یعنی (Final) نہیں ہوتا۔ وہ انسان کو زندگی کے ایک مرحلہ سے دوسرے مرحلہ میں لے جانے کے قابل کرتا ہے۔ جہاں تک اس خاص مرحلہ کا تعلق ہوتا ہے اس کے اعتبار سے تو اس نظام کی حیثیت آخری نظام کی ہوتی ہے، لیکن مجموعی انسانیت کے لیے یہ ایک مثال یا نمونہ کا کام دیتا ہے، لوگ غلطی یہ کرتے ہیں کہ اس مثال کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کل حقیقت کے مرادف سمجھ لیتے ہیں اور ہر زمانے اور ہر قوم و ملک میں اس نظام کو بوجہ نافذ کرنا چاہتے ہیں اور گوحالات بدل جائیں وہ اس نظام میں کسی قسم کی تبدیلی گوارا نہیں کرتے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قوم کے ذہن طبقے میں اس نظام سے بے دلی پیدا ہونے لگتی ہے، چونکہ اسے قطعی اور آخری سمجھا جاتا ہے اور بعض ذہین طبقے بھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ یہ نظام اور اصل حقیقت جس کا یہ نظام ایک پر تو تھا، دونوں ایک ہی چیز ہیں، چنانچہ جب اس نظام کے خلاف جو عارضی ہوتا ہے، بغاوت ہوتی ہے تو انسانیت کے اصل مبادی سے بھی جو دائمی حیثیت رکھتے ہیں، انکار کر دیا جاتا ہے۔ مولانا کے خیال میں تبدیلی کا یہ طریقہ انتشار اور فساد کا باعث ہوتا ہے اس کے بجائے اگر یہ ہوتا کہ نظام کو

علوم اور معلومات حاصل کرتا ہے، وہ اس کے دل کے اندر اور نفس کے باطن میں جا کر جاگزین ہو جاتے ہیں۔ اور جب کبھی وہ کوئی خواب دیکھتا ہے تو جو کچھ اس کے دماغ میں پہلے سے محفوظ ہوتا ہے، وہی حالت خواب میں اس کے سامنے منعکس ہو جاتا ہے، چنانچہ اس طرح ہر قوم اور ہر ملک کی ایک مخصوص فطرت بن جاتی ہے اور اسی پر اس قوم اور ملک والوں کی زندگی کا سارا دار و مدار ہوتا ہے۔ مثلاً ہندو قوم کی فطرت ذبح حیوانات کو ناپسند کرتی ہے اور عالم کے قدیم ہونے کی قائل ہے۔ اور ذبح حیوانات کو جائز اور عالم کو حادث جاننا سامی عربوں اور اہل فارس کی فطرت کا طبعی خاصہ ہے۔ کسی قوم میں جب کوئی نبی مبعوث ہوتا ہے تو وہ اپنی قوم کے حالات پر نظر ڈالتا ہے اور اس کے اعتقادات اور اعمال کو دیکھتا ہے۔ جو اعمال اور اعتقادات تہذیب نفس کے لیے مفید و معاون ہوتے ہیں ان کو تو وہ رہنے دیتا ہے اور ان پر عمل پیرا ہونے کی اپنی قوم کو دعوت دیتا ہے اور جو تہذیب نفس کے لیے مضر ہوں ان سے منع کرتا ہے۔۔۔۔۔ نبوت کا اصل مقصد تہذیب نفس ہے، تاکہ انسان میں قدرت نے جو بھی استعداد و دیعت کی ہو، وہ اپنے کمال کو پہنچ سکے۔“

مولانا نے شاہ صاحب کے اس قول ”ان النبوة تحت الفطرة“ کی تشریح کرتے ہوئے ایک دفعہ فرمایا ”مثلاً ہندوستان میں قدیم الایام سے گائے کا گوشت نہیں کھایا جاتا، اس کو ہم کہیں گے کہ گائے کا گوشت ہندو قوم کے مزاج میں مکروہ ہے، لیکن زیادتی یہ ہے کہ ہندوؤں نے گائے کے گوشت کو کل انسانیت کے لیے حرام سمجھ لیا۔ اس طرح حضرت یعقوب علیہ السلام اپنی طبیعت کی افتاد کی وجہ سے نہ تو اونٹ کا گوشت کھاتے تھے اور نہ اس کا دودھ پیتے تھے۔ ان کی اولاد نے حضرت یعقوب کی تقلید میں ان دونوں چیزوں کو حرام مان لیا۔ یہ اصل میں صرف جماعتی تحریم یا کراہت تھی۔ اس تحریم اور کراہت کی عام انسانی حیثیت سے زیادہ اہمیت نہ تھی۔ غلطی سے یہود نے اسے اپنے مذہب کی اساس بنا لیا اور اس حتمی دین کا ایک اصول سمجھ لیا۔ قرآن نے یہود کے اسی خیال کی تردید کی چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: ”كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حَلَالًا لِّیْنِیْ اِسْرَآئِیْلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَآئِیْلُ عَلَیْ نَفْسِہِ مِنْ قَبْلِ اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرَآةُ“ الخ۔

مولانا فرماتے ہیں کہ اطمینان کی تحلیل اور تحریم بیشتر قومی پسندیدگی یا مزاج کے مطابق ہوتی ہے اس کو عالمگیر مذہب کی تعلیم کا اس بنا نا ٹھیک نہیں ہوتا۔ کھانوں کے علاوہ دوسری باتوں میں بھی اگر قوم کے مزاج کا لحاظ رکھا جائے، لیکن اس شرط پر کہ اس سے انسانیت کے عمومی مفاد میں کوئی رخنہ نہ پیدا ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اگر مصلح اور انبیاء قوم کے مزاج کے خلاف غیر ضروری باتوں میں پڑ جائیں تو اصل مقصود فوت ہو جاتا ہے۔ حدیث میں مروی ہے کہ رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت عائشہؓ کو مخالف کرتے ہوئے ایک دفعہ فرمایا کہ اے عائشہ! اگر تیری قوم نئی نئی مسلمان نہ ہوتی تو میں کعبہ کی

کسی قانون کو دنیا میں یہ عزت ملتی ہے کہ وہ حکومت کا قانون بن جاتا ہے، تو عوام اس کو آسانی سے قبول کر لیتے ہیں، البتہ دوسری قوموں کے خواص کے لیے اس قانون کو اپنانے میں جو رکاوٹ ہو سکتی تھی وہ یوں دور ہو گئی کہ اس قانون میں لچک تھی۔ غیر عرب اقوام کے خواص کو اجازت تھی کہ اگر وہ چاہیں تو عربی قانون کو بھنہ قبول کر کے عرب بن جائیں یا اس کی روشنی میں اپنے لیے ایک قومی قانون بنالیں، جو وہی مقصد پورا کرے جس کی دعوت عربی قانون دیتا تھا۔ یہ قوم اگر چاہے تو وہ اس قانون کو اپنی قومی زبان اور قومی رسم و رواج میں منتقل کر کے اسے ہر خاص و عام کے ذہن اور اس کی زندگی کے قریب کر سکتی تھی۔

مولانا کے نزدیک اسلامی فتوحات کے بعد قرآن کے قانون کو چلانے کے لیے فقہاء کے مختلف مذاہب اسی مقصد کو پورا کرنے کے لیے معرض وجود میں آئے۔ ان میں حنفی فقہ خاص طور پر ممتاز ہے۔ اس فقہ میں عربوں کی وہ چیزیں جو غیر مسلمانوں کو کھلتی تھیں، ان کا بدل تجویز کر دیا گیا، چنانچہ خلفائے عباسیہ نے اسی کو اپنی خلافت کا قانون مان لیا اور ان کے بعد مشرق میں جو بھی سلطنتیں بروئے کار آئیں، سب نے فقہ حنفی کو ہی اپنا دستور بنایا، مختلف قوموں کے باہمی جھگڑوں اور آپس کی رقابتوں کو سلجھانے کا یہ بہترین طریقہ تھا۔

عرب اقوام میں زیادہ تر شافعی فقہ کا رواج ہوا اور ایرانی، ترک اور ہندوستانی فقہ حنفی کے پیرو بنے۔ اسلام کے ابتدائی دور میں جب عرب مفتوحہ قوموں کے حاکم ہوئے تو ان میں ایک بہت بڑا گروہ تو ایسا تھا کہ جو بھی غیر عرب مسلمان ہو جاتے یہ لوگ ان کو اپنی برادری میں شامل کر لیتے اور عرب اور غیر عرب مسلمانوں میں فرق مراتب روانہ رکھتے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ یہ گروہ اس دور میں اسلام کی صحیح نمائندگی کرتا تھا مگر عربوں کا ایک گروہ ایسا بھی تھا جو غیر عربوں پر حکومت کرنا اپنی قومی خصوصیت سمجھتا تھا۔ یہ عرب کی رجعت پسند طاقت تھی اور اسے ہم اسلام کی صحیح نمائندہ جماعت نہیں کہہ سکتے۔ اس قسم کے لوگوں کا ایک حصہ عجمی ممالک میں بھی آباد ہو گیا اور ان کی برابر یہ کوشش رہی کہ وہ عجمیوں میں رہتے ہوئے عربیت کی نسلی فضیلت پر زور دیتے رہیں۔ یہ لوگ فقہ حنفی کے سخت دشمن تھے اور صرف شافعی فقہ کو اسلام کے مرادف ثابت کرنے پر مصر تھے۔ حنفی ان سے اس طرح بازی لے گئے کہ انہوں نے فقہ حنفی کا فارسی میں ترجمہ کر کے اسے دیہات میں عام کر دیا اور فقہ حنفی غیر عرب قوموں کا ایک لحاظ سے قومی مذہب بن گئی۔ یہی فقہ ایران اور ترکستان میں پھیلی وہاں سے ہندوستان میں پہنچی اور مدتوں تک قومی مذہب کے نام سے یہاں حکمران رہی۔ الغرض قرآن کے بین الاقوامی قانون کی حجازی تعبیر عربوں کے لیے قومی مذہب تھی اور اس کی حنفی تعبیر عجم کا قومی مذہب قرار پائی۔ اس طرح سے اسلام ایک قوم سے دوسری قوم تک پہنچا اور ہر قوم اسے اپنا مذہب ماننے پر راضی ہو گئی۔

176

ایک مثال کی حیثیت دی جاتی اور افراد کو اجازت ہوتی کہ وہ اس نظام کے اندر رہ کر اس کو ضرورتوں کے مطابق بدلتے رہتے اور زمانے کی ترقی کے ساتھ ساتھ اس کو بھی ترقی دیتے جاتے تو انسانیت آسانی سے راہ ترقی پر گامزن ہوتی اور یہ ضرورت نہ پڑتی کہ پہلے کے نظام کو سرے سے مٹا کر اس کی جگہ بالکل نیا نظام بنایا جاتا۔ یقیناً زندگی ایک حد تک تسلسل چاہتی ہے اور اگر تغیر و تبدل کا یہ راستہ اختیار کیا جائے تو زندگی کا تسلسل بھی قائم رہتا ہے اور ترقی کی رفتار بھی نہیں رکتی۔ ہر خرابی پر از سر نو نیا نظام بنانا نہ مفید ہے اور نہ مدد ترقی۔

مولانا کے نزدیک زندگی کی ابتداء معدنیات نباتات اور حیوانات سے ہوئی۔ پھر انسان کا وجود عمل میں آیا، انسان کی مذہبی فکر کی ابتدائی صورت صابنیت تھی، اس کے بعد حنیفیت کی منزل آئی اور یہودیت، عیسائیت اور اسلام نے جنم لیا۔ اسلام کے نظام کی ظاہری ٹھوس صورت جو مروی زمانہ سے بن گئی ہے غیر متبدل نہیں، ضرورت اس کی ہے کہ اس نظام کو زمانے کے مطابق اعلیٰ سے اعلیٰ جامہ میں پیش کیا جائے ورنہ جس طرح اور مذاہب کے نظام پرانے ہو گئے، نعوذ باللہ اگر اسلام کو بھی اسی طرح ایک خاص نظام کا پابند بنا دیا گیا تو اس کے پرانے ہونے میں کیا کسر رہ جائے گی۔

مولانا نے فرمایا کہ روٹی پکانے کے لیے ایلے جلانے جاتے ہیں، اگر کوئی شخص یہ کہے کہ ایلے کیوں بیکار جلانے جا رہے ہیں تو اس کا جواب کیا ہو سکتا ہے۔ اسی طرح نوع انسانی کو اپنے مقصد تک پہنچنے کے لیے ہزار ہا وجودوں کو فنا کرنا ہوگا، لیکن تکمیل کے لیے یہ فنا ضروری ہے۔ ایک مرحلہ فنا ہوتا ہے تو اس سے دوسرے مرحلہ کا ظہور ہوتا ہے۔ انسان کی ترقی کی کوئی حد نہیں۔ اسے اپنے اصلی مقام پہ پہنچنے کے لیے معلوم نہیں ابھی کتنے مراحل سے گزرنا ہے۔

ہر نبی کسی نہ کسی حد تک اس عمومی حکمت کی طرف اپنی اپنی قوم کو دعوت دیتا چلا آیا ہے، چنانچہ مولانا کے نزدیک قرآن کا اصل مقصد تمام اقوام کو اس عمومی حکمت پر جمع کرنا تھا۔ گو اس کا پیغام حقیقت میں خالص بین الاقوامی تھا لیکن اس نے شروع میں عربوں کو اس پیغام کو دوسروں تک پہنچانے کا ذریعہ بنایا۔ مولانا فرماتے ہیں کہ قرآن کا بین الاقوامی پیغام رسول اللہ صلعم کی قومی زبان اور ان کی قوم کے مزاج کے مطابق معین ہوا۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ عربوں نے اس پیغام کو اپنا لیا اور اس کو پھیلانے اور دنیا میں اسے نافذ کرنے کے کام کو اپنے لیے قومی عزت سمجھا، چنانچہ ان کی ہمت سے دنیا کا ایک بہت بڑا حصہ قرآن کے پیغام سے متعارف ہو گیا۔ غیر عرب اقوام کے لیے اس پیغام کو جو عربی شکل میں تھا، اپنانے میں جو دقتیں پیش آئیں، انہیں دو طرح سے حل کیا گیا۔ عربوں کو دوسری قوموں پر حکمرانی حاصل ہو گئی تھی، ان قوموں کے عوام نے تو شریعت کو اس لیے مان لیا کہ یہ حکمرانوں کا قانون تھا، کیونکہ جب

ساری کوششیں ایرانی اثر کو پس پشت ڈالنے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔ ماموں کا زمانہ آیا تو ایرانیوں کا سیاسی اور ذہنی اقتدار خلافت کے سارے شعبوں پر چھا گیا۔ ماموں کے وزیر اور سلطنت کے کرتا دھرتا سب کے سب ایرانی تھے۔ اس کے بڑے بڑے سرداران فوج بھی ایرانی تھے۔ امین کی شکست دراصل عربی عناصر کی سیادت کی شکست تھی۔ علمی و ذہنی دنیا میں یہ ایرانیوں کا پہلے ہی سے اقتدار قائم تھا اور تو اور عربی زبانوں کے سب سے بڑے ممتاز شاعر بھی اس زمانے میں ایرانی تھے۔ زمانے کی اس بدلی ہوئی فضا میں کیسے ممکن تھی کہ اموی دور کی عربی ذہنیت یا منصور اور ہارون کے عہد میں عربی سیادت کی جو شکل تھی۔ وہ سلطنت کی حکمت عملی میں دخیل رہ سکتی۔ ایرانی قوم اسلام کے زندگی بخش پیغام کی برکت سے اب اپنے عروج کو پہنچ چکی تھی اور ایرانی کسی معاملہ میں بھی عربوں سے پیچھے نہ رہتے تھے۔ تلوار کے وہ دھنی تھے، جنگوں میں وہ قیادت کرتے اور سیاست کے گھوڑے وہ دوڑاتے، قرآن کی تفسیریں وہ کرتے، حدیثوں کی ترتیب و تدوین انہوں نے کی اور دوسری قوموں سے جو علوم عربی زبان میں منتقل ہوئے، ان میں یہی لوگ پیش پیش تھے۔ ان حالات میں بھی اگر سلطنت کو پہلے کے اس اصولوں پر چلایا جاتا تو لازمی طور پر ایرانیوں اور عربوں میں کھلم کھلا ٹکراتی اور دونوں قومیں آپس میں لڑ کر خود کو عباسی خلافت کو اور اسلام کی بین الاقوامی تحریک کو کمزور کرنے کا باعث بنتیں۔ اس وقت دونوں قوموں میں توافق (Adjustment) کی سخت ضرورت تھی، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ضروری تھا کہ اس توافق میں اسلام کو بھی گزند نہ آئے۔ مامون الرشید عربوں اور ایرانیوں کے اس بین الاقوامی توافق کا نمونہ ہے۔ اتفاق سے نسلی اعتبار سے بھی اس کا مسلمانوں کی ان دونوں قوموں سے تعلق تھا اس کا باپ ہارون الرشید عربی اور ماں ایرانی تھی۔ نیز اس کی ابتدائی تعلیم و تربیت ایرانی وزراء نے کی اور ہارون نے اسے والی بھی بنایا تو خراسان کا۔ چنانچہ وہ کافی عرصے تک مرو میں مقیم رہا۔ الغرض مامون کی اپنی ذات جسمانی، ذہنی اور علمی لحاظ سے عربیت اور ایرانیت کا صحیح امتزاج تھی۔ وہ مسلمان تھا اور اس میں شک نہیں کہ سچا مسلمان تھا۔ عربی اس کی زبان تھی اور اپنی عربیت اور قریشیت پر اسے فخر بھی تھا۔ لیکن اسے عجم کے صالح اثرات اور یونان کے اعلیٰ افکار کو اپنانے سے بھی انکار نہ تھا، جس طرح مامون کی اپنی ذات اس وقت کے بین الاقوامی اسلامی عناصر کی جامع تھی، اسی طرح اس نے اپنی حکومت کی حکمت عملی کی جو طرح ڈالی وہ بین الاقوامی اسلامی سیاست کا ایک اچھا نمونہ تھی۔

مولانا مامون الرشید کی علمی عظمت اور اس کی سیاسی اصابت رائے کے بڑے معترف ہیں، جس طرح وہ امیر معاویہ، عبدالملک اور ولید کو قابل عزت مسلمان عرب بادشاہ مانتے ہیں اور حضرت عمر بن عبدالعزیز کو عربیت کو معتدل کر کے اسلام کی حقیقی تعلیم سے قریب کرنے والا سمجھتے ہیں، اسی طرح وہ

بنو امیہ کی خلافت خالص عربی سیادت کا دور تھا، جب خلافت عباسیوں میں منتقل ہوئی تو عجم بھی اس میں برابر کے شریک ہو گئے۔ یہ شرکت محض سیاست تک محدود نہ رہی۔ بلکہ زندگی کے ہر شعبہ میں عجم کے اثرات غالب آتے گئے۔ تفسیر حدیث عربی ادب نظم و نثر صرف و نحو معانی و بیان اور عروض میں عجمیوں کا پلہ عربوں سے بھاری تھا اور جب دوسری زبانوں سے عربی میں علوم منتقل کیے گئے تو ان میں بھی پیش پیش عجمی ہی تھے۔ چنانچہ سلطنت کا تفصیلی قانون بنا تو اس میں عجمی اثر کیوں نہ غالب ہوتا۔ آہستہ آہستہ بغداد میں عربی تفوق کم ہوتا گیا، اسی زمانے میں ارسطو کے فلسفے کا عربی میں ترجمہ ہوا۔ اس سے علم کلام کی داغ بیل پڑی اور اشراقی فلسفہ کے ترجموں نے تصوف کو علمی شکل دی۔ اہل تصوف صرف اشراقی مفکرین تک محدود نہ رہے بلکہ انہوں نے ایرانیوں کے علوم سے بھی استفادہ کیا۔ اس سے پہلے فقہ حنفی مرتب ہو چکی تھی اور ہارون الرشید کے عہد میں تو ساری عباسی سلطنت کا یہ دستور بھی بن گئی تھی، چنانچہ اسی طرح خلافت عباسی کے تمام مشرقی علاقوں میں عجمیوں کو عربوں پر عملی غلبہ حاصل ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی سیاسی اقتدار کی باگ ڈور بھی ان کے ہاتھوں میں آ گئی۔

لیکن عربوں کے اندر ابھی تک سیادت کا جذبہ موجود تھا اور وہ عجمیوں کے اس غلبے کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ گو عباسی سلطنت سے انہیں کسی قسم کی مدد نہیں مل سکتی تھی لیکن فکری طور پر عجم کے سامنے سر جھکانا ان کو ناگوار تھا۔ اس عربی ذہنیت کا فقہی مظہر فقہ شافعی ہے۔ بغداد سے مشرق کی طرف کے ملکوں میں جہاں عجمی آباد تھے فقہ حنفی کا رواج ہوا اور مغرب کے علاقوں میں جہاں عربی اثر غالب تھا فقہ شافعی کا سکہ چلا۔

امویوں کے پایہ تخت دمشق میں ایرانی اثر سرے سے ناپید تھا اور اگر کبھی کوئی سر پھر ایرانی دربار خلافت میں اپنے ایرانی بزرگوں پر فخر کرنے کی جرات کرتا تو اس کی خوب گوشمالی ہوتی۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک شاعر نے جو اتفاق سے ایرانی النسل تھا ایک اموی خلیفہ کے سامنے اس کی تعریف میں عربی میں ایک قصیدہ پڑھا۔ قصیدہ کے ابتدائی ابیات میں ایرانیوں کی قدیم عظمت کی طرف کہیں اشارہ تھا۔ اموی خلیفہ نے یہ شعر سنے تو جلال میں آ گیا، چنانچہ چوب داروں کو اس گستاخ شاعر کی فہمائش کا حکم ہوا۔ انہوں نے شاعر کو پکڑا اور سامنے کے حوض میں اسے اتنے غوطے دیئے کہ وہ ادھ مواسا ہو گیا۔

بغداد بنا تو عربی تمدن اور عربی اقوام کے پہلو پہ پہلو ایرانی تمدن اور ایرانی اقوام بھی خلافت کے اس نئے دار السلطنت میں آ موجود ہوئیں۔ شروع شروع میں تو جیسا کہ ہم پہلے بیان کر آئے ہیں۔ عربی سیادت اپنے غلبہ کو برقرار رکھنے کے لیے برابر مصر رہی، لیکن منصور، مہدی، ہادی اور ہارون کی

منصور، مہدی اور ہارون کی بھی بڑی عزت کرتے ہیں اور مامون کے متعلق ان کا خیال ہے کہ اس نے عربی اور عجمی اقوام کی مخالفت کو باہمی موافقت میں تبدیل کر کے اسلام کی بہت بڑی خدمت کی۔

مامون کے زمانے میں خلق قرآن کا مسئلہ اٹھا۔ ایک گروہ کہتا تھا کہ کلام الہی جو خدا کی صفات قدیمہ میں سے ہے، وہ تو قدیم ہے، لیکن جو الفاظ آنحضرت صلعم پر نازل ہوتے تھے، وہ مخلوق اور حادث تھے، محدثین کہتے تھے کہ کلام الہی ہر حال میں قدیم ہے۔ مامون نے پہلے گروہ کی حمایت کی اور اس خیال کو سلطنت کا اصولی مسئلہ بنا دیا اور محدثین کی قیادت امام حنبل نے فرمائی، خلق قرآن کے اس نزاع کے متعلق مولانا فرماتے ہیں کہ مامون کے زمانے میں عربوں کے ہاتھ سے سیادت کے سب ذرائع چھن چکے تھے۔ لے دے کر ایک زبان رہ گئی تھی اور اب وہ اسے خاص الہی زبان منوانے پر مصر تھے۔ عجمی مسلمان قرآن کی تعلیم کو تو من جانب اللہ مانتے تھے، لیکن قرآن کے الفاظ کو وہ قرآن کے معانی یعنی اصل تعلیم کی طرح قدیم اور غیر فانی تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے۔ عربی الفاظ پر زور دینے والے حقیقت میں عربی تفوق کے قائل تھے، کیونکہ عربی زبان کا تفوق خود عربوں کا تفوق ہے، چنانچہ اکثر عرب اہل فکر اس قومی اور لسانی تفوق کے علمبردار رہے ہیں، امام شافعیؒ عربی تفوق کے قائل تھے۔ ان کے برعکس امام ابوحنیفہؒ ہیں، ایک کے نزدیک خواہ آدمی عربی زبان نہ بھی جانے اس کا عربی ہی میں نماز پڑھنا ضروری ہے اور دوسرے کے ہاں مفہوم کو سمجھنا مقدم ہے اور زبان کی حیثیت دوسرے درجہ کی ہے۔

محدثین کا اصرار تھا کہ قرآن کے الفاظ کو غیر مخلوق مانا جائے، یا اس مسئلہ کو گول مول ہی رکھا جائے، کیونکہ عربی الفاظ کو مخلوق ماننے سے عربی تفوق پر زور پڑتی تھی، چنانچہ اس گروہ کو قرآن کے الفاظ کے غیر مخلوق ہونے پر اتنا غلو تھا کہ حیرت ہوتی ہے اس زمانے کے علماء میں سے ایک وکیع بن الجراح تھے، ان کا کہنا تھا کہ جس شخص کا یہ خیال ہے کہ قرآن حادث ہے وہ کافر ہے۔ یزید بن ہارون کا قول ہے کہ جو شخص کہتا ہے کہ کلام الہی مخلوق ہے، وہ خدا کی قسم زندیق ہے۔ امام شافعی کے شاگرد مزی نے کہتے ہیں کہ جو شخص کہتا ہے کہ قرآن مخلوق ہے وہ کافر ہے۔ عبدالرحمن بن مہدی کا قول ہے کہ اگر میرے ہاتھ میں ہو اور کسی کو پل پر یہ کہتے سن لوں کہ قرآن مخلوق ہے تو اس کی گردن مار دوں۔ امام بخاری نے اس مسئلہ میں یہ تفریق کی تھی کہ قرآن مجید کا جو تلفظ کیا جاتا ہے، وہ حادث اور مخلوق ہے، لیکن محدثین نے اس کی بھی سخت مخالفت کی اور اس کو اس کی پاداش میں مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ قرآن جس صورت میں ہو غیر مخلوق ہے، اس کے خلاف دوسرے گروہ والوں نے بھی اپنی طرف سے غلو اور تشدد میں حد کر دی۔

مولانا کے خیال میں قرآن کی تعلیم کا اصل مقصود اس کے معانی ہیں۔ الفاظ پر زور دینے والے عربی تفوق کے داعی ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں کہ مولانا جامی کا یہ شعر

مثنوی مولوی معنوی ہست قرآن در زبان پہلوی

عجمی ذہنیت کو ظاہر کرتا ہے، چنانچہ امام ابوحنیفہ فارسی زبان میں نماز پڑھنے کو جائز سمجھتے تھے اور ان کی طرف جو رجوع کا قصہ گھڑا گیا ہے میرے نزدیک وہ صحیح نہیں۔ دراصل بات یہ ہے کہ ایک عجمی کی عقل یہ سمجھ ہی نہیں سکتی کہ اللہ کی تعلیم جو تمام زمانوں اور سب دنیا کے لیے ہے، وہ عربی اسلوب بیان اور عربی نظام الفاظ کی پابند ہو، عجمی ذہن کے لیے قرآن کے الفاظ کا غیر مخلوق سمجھنا ناممکن ہے۔ وہ تو معانی ہی کو قرآن سمجھے گا اور اسی میں تفکر اور تدبر کر کے ایمان کو جلا دے گا۔

مختصر خلق قرآن کے مسئلہ میں مامون کا یہ اقدام عربی ذہنیت کے اس تباہی کی اصلاح کے لیے تھا، اس کے نزدیک محدثین کا قرآن کے الفاظ کو غیر مخلوق سمجھنا عربی اور ایرانی ذہنیت کے صحیح امتزاج اور توفیق میں حائل تھا۔ اور چونکہ یہ بات اس کی سلطنت کے سیاسی مسلک کے خلاف پڑتی تھی، اس لیے مامون نے اس میں بڑی سرگرمی دکھائی۔ مولانا فرماتے ہیں کہ اس زمانے کے بہت سے غیر عرب علماء جو اپنے علم میں دوسروں سے کسی طرح کم نہ تھے، قرآن کے الفاظ کو امام احمد بن حنبل کی طرح غیر مخلوق نہ سمجھتے تھے۔ مثال کے طور پر امام بخاری کو لیجیے۔ موصوف الفاظ قرآن کو مخلوق مانتے تھے، چنانچہ ذہلی جو امام احمد کے شاگرد تھے اور امام بخاری کو ان سے تلمذ بھی تھا۔ اسی بناء پر امام بخاری کے خلاف ہو گئے، ایک عربی ذہنیت سے متاثر تھے اور دوسرے عجمی مسلمان کا طبعی رجحان رکھتے تھے۔

عباسیوں کے زمانے میں دنیائے اسلام کے دو حصے ہو چکے تھے ایک حصہ بغداد سے شروع ہو کر مغرب میں اسپین تک جاتا تھا، اس کی زبان عربی تھی اور وہاں کی تمام مفتوحہ قوموں نے بھی عربی زبان اور عربی تمدن کو اختیار کر لیا تھا۔ بغداد سے مشرق کی طرف کے ملکوں میں اہل عجم کی کثرت تھی۔ گو کہ زمانے میں یہ بھی عربوں کے محکوم رہ چکے تھے اور عربوں کے سیاسی اقتدار کی وجہ سے ان کی علمی اور مذہبی زبان بھی عربی بن گئی تھی، لیکن آہستہ آہستہ ان کی قومی شخصیت ابھر رہی تھی، یہ لوگ سب کے سب مسلمان ہو چکے تھے اور انہوں نے اسلام کو یوں اپنا لیا تھا جس طرح عربوں نے اسے اپنا لیا تھا۔ اب ایرانی مسلمان ایک عرب مسلمان کا مد مقابل بن کر زندگی میں اپنی جگہ پیدا کرنا چاہتا تھا، بے شک اسلام کا رشتہ دونوں میں مشترک تھا، لیکن ہر فریق اسلام کو اپنے قومی مزاج کے مطابق سمجھنے کی کوشش کرتا تھا اور اسی کا نتیجہ تھا کہ دونوں قوموں کی زندگی کے ہر شعبہ میں کشمکش نظر آتی تھی یہ کشمکش عربی اور عجمی ذہنیت کی تھی۔ اسلام اور اسلام دشمن رجحانات کے درمیان نہ تھی، جیسا کہ عام طور پر عرب مورخوں نے سمجھا اور

ہندوستان میں اس وقت بھی بعض مسلمان اہل قلم اس مغالطہ میں گرفتار ہیں۔ عجم کو خدا نخواستہ اسلام کا انکار مقصود نہ تھا، لیکن طبعاً وہ یہ چاہتے تھے کہ اسلام کو اپنی ذہنیت کے مطابق ڈھالیں قدرتی طور پر ان کی قومی غیرت یہ بھی گوارا نہ کر سکتی تھی کہ وہ عربوں کے نسلی تفوق کو قبول کریں اور ذہنی طور پر ان کے دیمل بن کر رہیں۔ وہ سمجھتے تھے اور ان کا یہ سمجھنا بالکل حق بجانب تھا کہ اسلام جتنا عربوں کا ہے اسی قدر ان کا بھی ہے۔ ایرانیوں کی نئی قومی شخصیت اسلام کے خمیر سے اٹھی تھی۔ چنانچہ انہوں نے اپنی فقہ بنائی، اپنا علم کلام مرتب کیا اور الگ اپنی زبان بھی بنائی۔ لیکن ان کی یہ سب کوششیں اسلام کے وسیع دائرہ کے اندر ہی تھیں، محکوم اور پس ماندہ ایرانیوں کو آزاد اور مستقل قوم بننے کے لیے اسلام سے انکار کرنے کی ضرورت نہیں پڑی، بلکہ اسلام کی وجہ سے ان کو اپنی قومی شخصیت کی تکمیل میں مدد ملی۔ البتہ عربی ذہنیت کے ترفع اور تفاخر کے جذبات کے خلاف جو فتوحات اور حکومت کی وجہ سے لازمی طور پر عربوں میں پیدا ہو گئے تھے۔ ایرانیوں کو ضرور جدوجہد کرنی پڑی اور اس کا سلسلہ صدیوں تک جاری رہا، کہیں کہیں ایرانیوں کے اس رد عمل نے شعوبی تحریک کی شکل بھی اختیار کی۔ اس تحریک کے حامی عرب کی ہر چیز سے متنفر تھے لیکن یہ افراط دراصل اموی عہد کی انتہا پسندی کا نتیجہ تھا۔ لیکن بتدریج دونوں طرف کے لوگ اعتدل کی جانب مائل ہوتے گئے اور اسلام کے اثرات نے بھی عربیت اور عجمیت کو شیر و شکر کرنے میں بڑا کام کیا۔

فقہ میں عجمی اور عربی رجحانوں نے حنفی اور شافعی مذہب کو پیدا کیا تھا لیکن اسے اسلام کی ہمہ گیر اور جامع تعلیم کا فیض کہیے کہ ان دونوں فقہی مذاہب کے درمیان اختلاف کی جو خلیج تھی، اسے بعد والوں نے ہمیشہ بانٹنے کی کوشش کی اور ہر فقہی مذہب والوں کے پیش نظر یہ رہا کہ وہ اپنے آپ کو قرآن اور حدیث سے زیادہ قریب ثابت کریں۔ عقائد یعنی علم کلام میں بھی عجمی اور عربی ذہنیتوں نے اپنی الگ الگ راہ بنائی۔ مامون کے بعد عجم کو ذہنی طور پر کچھ تفوق حاصل ہو گیا تھا اور معتزلہ کی تحریک ایک حد تک عجمی تفوق کا ہی اظہار تھی۔ اس کے خلاف اشعری علم کلام وجود میں آیا۔ امام ابو الحسن اشعری امام شافعی کے پیروؤں میں سے تھے اور اس لحاظ سے وہ عربی ذہنیت کے ترجمان اور عجم کے ذہنی تفوق کے انکار کرنے والوں میں سے تھے۔ آپ ۲۷۰ھ میں بصرہ میں پیدا ہوئے اور ۳۳۰ھ میں بغداد میں انتقال فرمایا۔ ان کی ابتدائی تعلیم معتزلہ کے ہاں ہوئی لیکن ایک دن بصرہ کی جامع مسجد میں آپ نے مذہب اعتزال سے براءت کا اعلان کیا۔ اس کے بعد بغداد جا کر حدیث و فقہ کی تکمیل کی اور معتزلہ کے رد میں نہایت کثرت سے کتابیں لکھیں۔ شافعیوں میں ان کی بڑی قدر و منزلت ہوئی اور سینکڑوں ہزاروں علماء ان کے شاگرد ہو گئے۔

اموی عربی سیادت کا رد عمل عباسیوں کی دو قومی عربی عجمی حکومت تھی۔ حنفی فقہ کا جواب عربی

ذہن نے شافعی فقہ سے دیا۔ معتزلہ کی آزاد خیالی اور خالص عقلیت کا نتیجہ امام احمد بن حنبل کی ظاہریت اور تقلید حدیث کی صورت میں نکلا اور معتزلہ کے علم کلام کا رد اشعری علم کلام تھا۔

امام اشعری کے مابے میں امام ابو منصور ماتریدی نے عجمی ذہنیت کے مطابق علم کلام کی ترتیب دی۔ آپ ماتریدی کے ایک قصبہ کے رہنے والے تھے جو سمرقند کے مضافات میں ہے۔ آپ دو واسطے سے قاضی ابو یوسف اور امام محمد کے شاگرد تھے۔ ۳۳۳ھ میں آپ نے وفات پائی فرقہ حنیفہ جو تمام فرقہ ہائے اسلامیہ سے تعداد میں زیادہ ہے اعتقادات کے لحاظ سے ماتریدیہ ہے۔

اس وقت کی عربی اور عجمی ذہنیت کو سمجھنے کے لیے بے محل نہ ہوگا اگر یہاں اشعری اور ماتریدی عقائد کے چند مبادی درج کر دیئے جائیں۔

اشعری عقائد یہ ہیں ۲۔

۱۔ خدا کو جائز ہے کہ انسان کو اس کام کی تکلیف دے جو اس کی طاقت سے باہر ہے۔

۲۔ خدا کو حق ہے کہ وہ مخلوقات کو عذاب دے۔ بغیر اس کے کہ ان کا کوئی جرم ہو یا ان کو ثواب

۱۔

۳۔ خدا اپنے بندوں کے ساتھ جو چاہے کرے۔ اس کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ کام کرے

جو مخلوقات کے لیے مناسب ہوں۔

۴۔ خدا کا پچھانا شریعت کی رو سے واجب ہے نہ عقل کی رو سے

ماتریدی عقائد ملاحظہ ہوں۔

۱۔ اشیاء کا حسن و قبح عقلی ہے۔

۲۔ خدا کسی کو تکلیف مالا یطاق نہیں دیتا۔

۳۔ خدا ظلم نہیں کرتا اور اس کا ظالم ہونا عقلاً محال ہے۔

۴۔ خدا کے تمام افعال مصالح پر مبنی ہیں۔

۵۔ آدمی کو اپنے افعال پر قدرت اور اختیار حاصل ہے اور یہ قدرت ان افعال کے

وجود میں اثر رکھتی ہے۔

مولانا فرماتے ہیں کہ بغداد عربی اور ایرانی دونوں قوموں کا سنگم تھا اور یہاں دونوں تمدن پہلو پہلو موجود تھے۔ بغداد میں جیسے فارسی بولی جاتی تھی اسی طرح عربی بھی استعمال ہوتی تھی۔ فارسی بولنے والوں نے ادھر مشرق میں بخارا میں اپنا مستقل سیاسی مرکز بنایا اور یہی فقہ حنفی کا بھی مرکز بن گیا۔

۱۔ علم الکلام ص ۹۰ ۲۔ علم الکلام ص ۵۹

علم کلام میں ماتریدی مذہب کا یہاں رواج ہوا۔ بخارا سے غزنی کی شیع علم جلی اور اس سے سے لاہور اور
دہلی کے چراغ روشن ہوئے، تاتاریوں کے ہاتھ سے جب بغداد تباہ ہوا اور بخارا کے علمی مرکز بھی راکھ کا
ڈھیر بن گئے تو بغداد اور بخارا کا فارسی بولنے والی قوموں نے دہلی کا رخ کیا اور عربی بولنے والے مصر میں
جمع ہو گئے۔

مولانا کے نزدیک دہلی بھی دمشق، بغداد اور بخارا کی طرح مسلمانوں کے ایک مستقل مرکز کی
حیثیت رکھتی ہے جس طرح عرب مسلمان ایک مستقل قوم تھی ان کا سیاسی مرکز دمشق اور بغداد رہا اور
ایرانی مسلمان ایک مستقل قوم ہیں اور انہوں نے بخارا کو اپنا مرکز بنایا اسی طرح ہندوستانی مسلمان بھی
ایک مستقل حیثیت رکھتے ہیں ان کی اپنی زبان ہے۔ اپنا فقہی مذہب ہے اپنا علم کلام اور اپنی خاص حکمت
ہے جس طرح ایرانیوں نے عربوں سے اپنی قومی شخصیت منوائی اور ایرانی زبان، ایرانی فقہ، ایرانی علم
کلام اور ایرانی تمدن مسلمانوں کی بین الاقوامی برادری کا ایک مستقل جزو بن گئے اسی طرح ہندوستانی
مسلمان بھی ایک مستقل قوم ہیں۔ آئندہ باب میں اس قوم کی تاریخ سے بحث کی جائیگی۔

اسلامی ہندوستان

مولانا فرماتے ہیں ”قدیم آریوں نے شمالی ہند کے اس خطہ کو جو پشتو بولنے والی قوموں کے
وطن سے شروع ہو کر بنگال اور بندھیا چل پر ختم ہوتا ہے۔ اپنی تہذیب کا مرکز بنایا۔ قدیم ہندوستان میں
پشاور، لاہور، دہلی، مٹھرا، اجودھیا، اجین اور گیا کی تاریخ اس قدر خوبیوں کی مالک ہے کہ قوموں کی
برادری میں پرانا ہندی اول قطار میں بیٹھتا ہے۔

”۱۰۰۱ء سے ہندوستان کی نئی تاریخ شروع ہوتی ہے۔ قدیم آریا اقوام کے نقش قدم پر چل کر
مسلم آریا اقوام ہندوستان پر حملہ کرتی ہیں اس سے پہلے یہ قومیں قرآن کی تہذیب میں رنگ چکی تھیں۔
ان میں سنائی، رومی، فردوسی، نظامی اور سعدی پیدا ہوتے ہیں۔ یہ وہی آریں نسل ہے جو نئی ذہنیت اور
نئے تمدن کی مالک بن چکی تھی۔ ایک بار تاریخ نے پھر اپنے آپ کو دہرایا۔ سلطان محمود کے زمانے میں
آریوں نے پھر ہندوستان کا رخ کیا اور دو سو سال کے قلیل عرصے میں یہ لوگ آریہ ورت پر ہر پہلو سے
قابل ہو گئے۔ چنانچہ نئے مسلم آریوں اور پرانے آریوں نے مل کر سندھ اور گنگا جمنی کی وادیوں میں نئی
قومیت اور نئے تمدن کی تشکیل کی اور ان دونوں کے امتزاج سے نئی زبان وجود میں آئی۔ بے شک ان
مسلم آریوں کے ساتھ اسلام کا سامی عنصر بطور مرشد اور استاد ضرور شامل رہا۔ مگر اکثریت آریں قوموں
کی تھی۔

ایران، ترکستان اور خراسان کی آریں قومیں عربوں کی فتوحات کی بدولت اسلام سے
متعارف ہوئی تھیں۔ تقریباً تین سو برس بعد اسی طرح ان قوموں نے بھی اپنی فتوحات سے ہندوستان
میں رہنے والوں کو اسلام سے آشنا کیا۔ مولانا فرماتے ہیں کہ ”امیر المومنین معاویہ بن ابی سفیان کی
فتوحات اور قسطنطنیہ پر ان کے حملہ کو ہم جس قدر عزت و احترام سے دیکھتے ہیں، سلطان محمود غزنوی کی
مختوں کی بھی ہم ویسی ہی قدر کرتے ہیں۔“

فوج کشیوں کے ساتھ خون خرابہ کا ہونا ضروری ہوتا ہے اور حملہ آور جب مفتوحہ ملکوں پر اپنی
حکومت قائم کرتے ہیں تو ابتدا میں لامحالہ ان کو سختی کرنی پڑتی ہے۔ لیکن آہستہ آہستہ جب دونوں قومیں
ایک دوسرے سے مانوس ہونے لگتی ہیں ان کو ایک جگہ مل جل کر رہنا پڑتا ہے اور دونوں ایک دوسرے کی

خوبیوں سے واقف ہو جاتی ہیں تو پھر ان میں آپس میں میل ملاپ پیدا ہوتا ہے ایک سے دوسری قوم متاثر ہوتی ہے ان میں افکار کا تبادلہ ہوتا ہے اور حملہ آور جو نیا تمدن اور بلند نظام حیات ساتھ لائے تھے اس کا اثر دوسروں پر پڑتا ہے۔ چنانچہ ان کے افکار بدلتے ہیں ان کے عقائد میں انقلاب آتا ہے۔ وہ زندگی کے نئے نظریوں سے واقف ہوتے ہیں، ان کا سماج، تمدن اور رسوم نئے سیلاب فکر سے متاثر ہوتے ہیں اور اس طرح فاتح جو شروع میں محض ملکوں کو لوٹے اور راجوں اور ان کے تختوں کو تہ و بالا کرتے نظر آتے تھے، ایک صدی کے بعد مفتوحہ قوموں میں نئی زندگی پیدا کرنے کا باعث بن جاتے ہیں۔ تلواریکی جگہ قلم لے لیتا ہے، میدان رزم کے بجائے علم و بحث کی مجالیں جمتی ہیں، زندگی نئی کروٹ لیتی ہے اور جس طرح زمین جت کر اور کھد کر دنیا کو نئی کھیتی دیتی ہے، اسی طرح فرسودہ تمدنوں پر ہل چلتے ہیں، غفلت میں پڑی ہوئی قومیں حملہ آوروں کے پاؤں تلے روندی جاتی ہیں اور پھر انسانیت کو ایک نئی قوم، نئی تہذیب اور نیا فکر نصیب ہوتا ہے۔ اسلام کی ابتدائی تاریخ میں مہاجرین اور انصار کے ہاتھوں جو مکہ کے قریش پر گزری تھی، جس طرح مکہ کے قریش نے فتنہ ارتداد پر عربوں کی سرکوبی کی تھی اور پھر ان عربوں نے جیسے ایران، ترکستان اور خراسان کو اپنی نبرد آزمائیوں اور فتوحات سے خون میں رنگا تھا، بعدیہ غزنی اور غور سے آنے والوں کے دھاووں نے ہندوستان کے امن کو اگر اسے واقعی امن کہا جاسکتا تھا تہ و بالا کر دیا۔ پرانے راج نہ رہے، راجوڑے ناپید ہو گئے، حکمران طبقے مرمرا گئے، پہلے کے بندھن کچھ اس رستخیر میں ٹوٹ گئے اور جو ٹوٹے نہیں تھے وہ قدرے ڈھیلے پڑ گئے اور اس طرح سے نیچے کے طبقوں میں زندگی کی جو قوتیں پنہاں تھیں، ان کو سر اٹھانے کا موقع ملا۔ ”خون صد ہزارانچم سے سحر کا پیدا ہونا“ محض شاعرانہ تخیل نہیں بلکہ ایک امر واقعہ ہے، جو دنیا کے ہر ملک میں ہوتا رہا ہے اور آئندہ بھی ہوتا رہے گا۔

ان حملہ آوروں نے ہندوستان کی زندگی کے ہر پہلو پر جو اثر ڈالا اور ان کے طفیل عام اہل ہند کو جو نئی ذہنی زندگی ملی اس کا اجمالی خاکہ ڈاکٹر تارا چند نے اپنی مشہور کتاب (INFLUENCE OF ISLAM ON INDIAN CULTURE) بڑی خوبی اور وضاحت سے کھینچا ہے۔ موسیولہبان (LEBLON) کے الفاظ میں جس کا کہیں پہلے بھی اس کتاب میں حوالہ دیا جا چکا ہے، خون ریزی کے اس گرداب میں نئے تمدن کا بیج جو ایک قدیم زمین میں بویا گیا تھا از سر نو پھوٹتا ہے اور جب طوفان تھم جاتا ہے تو امویوں (یہاں خلیجیوں اور تعلقوں کا کہہ لیجئے) ستارہ غروب ہو جاتا ہے اور عباسیوں (مغلوں) کے کوکب اقبال کی درخشانی سے افق منور ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں عظمت و جلال کے ایک شان دار منظر سے دو چار ہوتی ہیں۔ ایک قوم کا دوسری قوم پر چڑھ دوڑنا آج کی دنیا میں بہت معیوب سمجھا جاتا ہے اور اسی معیار

بعض حلقوں میں ان دنوں ماضی کی ساری تاریخ کو جانچنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یقیناً زبردست قوموں کی کمزور قوموں پر یہ ترکتازیاں اس زمانہ میں طبیعت پر گراں گزرتی ہیں اور قوم پرستی کے جذبات کو جن میں آج کل ہر ملک والے سرشار ہیں، اس قسم کے واقعات سے بڑی ٹھیس لگتی ہے لیکن اس سلسلے میں یہ بات ضرور ملحوظ رکھنی چاہیے کہ حملہ آوروں میں بڑا فرق ہوتا ہے بعض حملہ آور موسمی سیلابوں کی طرح آتے ہیں اور اپنا چند روزہ جوش و خروش دکھا کر پھر سمٹ سمٹا جاتے ہیں۔ ان کی مثال آندھیوں کی طرح ہوتی ہے گو خدا کی خدائی کو ان سے بڑے بڑے نقصان پہنے پڑتے ہیں لیکن کم سے کم بیماریوں اور آلائشوں کے جراثیم جو انسانیت کو بری طرح چٹھے ہوئے ہوتے ہیں ان کی وجہ سے چھٹ جاتے ہیں لیکن بعض حملہ آور ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنے ساتھ ایک زندگی بخش تصور حیات اور ارفع اور اعلیٰ نظام تمدن لے کر آتے ہیں۔ اگرچہ ان حملہ آوروں کا آنا بھی دوسرے ملکوں کے لیے شروع شروع میں بڑی خون ریزی کا باعث ہوتا ہے لیکن جوں ہی فتح و تسخیر کا عمل مکمل ہو جاتا ہے تو حملہ آور جو صالح فکر اور بہتر تمدن اپنے ساتھ لے کر آئے تھے ان کے اچھے اثرات مفتوحہ ممالک پر پڑنے لگتے ہیں، چنانچہ ان کی وجہ سے محکوم قوموں کی زندگی میں ایک نئی حرکت پیدا ہو جاتی ہے۔ وسط ایشیا سے آنے والے مسلمانوں کے ہندوستان پر حملے بھی اسی قسم کے تھے۔

ڈاکٹر تارا چند مسلمان حملہ آوروں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں ”یہاں خود شکار شکاری کا نشانہ بننے کو تیار تھا، مسلمان حملہ آوروں کے آنے سے پہلے ہندوستان کی بالکل وہی حالت ہو رہی تھی جو یونانی ریاستوں کی مقدونیہ کے برسر اقتدار آنے کے وقت تھی۔ دونوں ملکوں میں اپنی بکھری ہوئی ریاستوں کو ایک سیاسی وحدت میں منسلک کرنے کی مطلق صلاحیت نہ تھی۔ گو اس طوائف الملوکی میں بھی ان کے ہاں ادب سائنس اور فنون کا ذوق ضرور موجود تھا۔ ہندوستان ایک اور لحاظ سے بھی اس وقت کے یونان سے بہت ملتا تھا جس طرح یونانی ریاستوں کے فاتح اہل مقدونیہ خود یونانی ہی تھے اور اسی تہذیب میں لایک حد تک رنگے جا چکے تھے اسی طرح ہندوستان کے راجپوتوں پر جن ترکوں نے حملہ کیا تھا وہ بھی دراصل راجپوت ہی تھے۔ البتہ فرق صرف اتنا تھا کہ وہ ہندو نہ بنے تھے۔“

محمود غزنوی نے جس زمانے میں ہندوستان پر حملے کرنے شروع کیے اس وقت ہندوستان میں کوئی سیاسی وحدت نہ تھی۔ شہنشاہیت کا وہ نظام جو ملک کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک سب کو ایک شیرازے میں پروئے ہوئے تھا، فنا ہو چکا تھا اور اس کے بجائے چھوٹی چھوٹی ریاستیں معرض وجود میں آ گئی تھیں، جو آپس میں جوڑ توڑ کرتیں، دھڑے بنا تیں اور آپس میں گتھم گتھارہا کرتیں۔ خانہ جنگی ان کی روز کی زندگی کا معمول بن گئی تھی اور قومی اتحاد ان کے لیے بس خواب و خیال ہو گیا تھا۔“

آریا آئے اور ہندوستان کے ہی ہو رہے۔ اس طرح مسلمان آریاں اقوام ہندوستان میں آئیں اور یہیں بس گئیں اور انہوں نے اسی ملک کو اپنا وطن بنا لیا۔ ایک دفعہ مولانا سے عرض کیا گیا کہ ہندوؤں کی موجودہ قومی تحریک ہندوستان کی تاریخ سے اسلامی دور کو حذف کرنا چاہتی ہے ان کی کوشش یہ ہے کہ نئے ہندوستان کی بنیاد پر اچھین ہند پر رکھی جائے۔ مولانا نے فرمایا کہ یورپی اقوام نے اپنی موجودہ اٹھان میں بھی یہی کیا۔ وہ یورپ کی تاریخ سے ایک طرف اسپین کے مسلم عہد اور دوسری طرف ترکوں کے دور کو حذف کر دیتے ہیں اور اپنے تاریخی اور تہذیبی سلسلے کو براہ راست روم اور یونان سے جوڑتے ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں کہ یورپ والوں کی یہ بات تو ایک حد تک سمجھ میں آجاتی ہے کیونکہ یورپ میں ایسی کوئی قوم نہ تھی جو مسلمان ہوئی ہو۔ ترکوں کی سیادت محض سیاسی طاقت کے بل پر تھی جب وہ نہ رہی تو ظاہر ہے ترکوں کے اثر کو یہ اقوام کیوں باقی رہنے دیتیں، لیکن ہندوستان کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے ایک تو خود یہاں کی بہت بڑی آبادی مسلمان ہو گئی ہے۔ دوسرے باہر سے جو مسلمان آئے وہ بھی ہندوستانی بن گئے اور انہوں نے ہندوستان کو اپنا وطن سمجھا۔ ان ہندوستانی مسلمانوں نے باہر کی دنیا سے بہت کچھ سیکھا، باہر والوں کو اپنے ہاں دعوت دے کر بلایا اور انہیں اس ملک میں آباد کیا۔ اہمیش کے زمانے میں ہندوستان ایک بین الاقوامی مرکز تھا جہاں تاتاری سیلاب کے مارے ہوؤں کو پناہ ملی، ان کے طفیل ہندوستان کا ادب، فن تعمیر، تمدن اور فکر دوسری قوموں کے باقیات صالحات کا مالک بنا اور ہندو تمدن بھی گوشہ گمنامی اور جمود سے نکلنے پر مجبور ہوا۔ مولانا کا کہنا یہ ہے کہ اگر ہم ان ہندو قوم پرستوں کا اوپر کا دعویٰ قبول کر لیں تو یہ محض اسلام اور ہندوستان کے اسلامی دور سے خیانت نہ ہوگی بلکہ ہم اپنے اس وطن سے بھی دشمنی کریں گے یعنی اس وطن کی تاریخ سے سات سو سال کے زمانہ کو حذف کرے گا مطلب یہ ہوگا کہ اس طویل عرصے میں ہندوستان نے ادب، فن، علم، سیاست اور اجتماع میں جو کچھ پیدا کیا ہے، ہم اس کا الٹا لکھیں اور اس سے زیادہ وہ اپنے وطن کے ساتھ کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟

مولانا نے فرمایا کہ عجیب بات ہے کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے سیکرٹری مسٹر کرپلانی کا بھائی مسلمان ہو جائے تو وہ اس وطن کی تاریخ سے بے دخل کر دیا جائے اور مسٹر کرپلانی کے مالک بنے رہیں۔ میں اسلام کے بلند فکر اور بہتر نظام سے متاثر ہو کر ہندو مذہب چھوڑ دوں تو اجنبی قرار دیا جاؤں اور گاندھی جی خالص ہندوستانی بنے رہیں۔ آخر یہ کہاں کا انصاف ہے، ہمارا تمدن تو خارجی سمجھا جائے اور آریائی تمدن کو ہندوستان کے نکسالی تمدن کا درجہ ملے۔

مولانا کے نزدیک ایک مسلمان بھی اتنا ہی ہندوستانی ہے، جتنا ایک ہندو۔ اپنے آپ کو ہندوستانی کہہ سکتا ہے، بلکہ مولانا تو یہاں تک کہتے ہیں کہ اگر ایک انگریز ہندوستان کو اپنا وطن بنا لے تو وہ

بھی ہندوستانی کا اسی قدر حقدار ہے جس قدر ہم ہندو اور مسلمان ہیں، بلکہ ہم دونوں سے بہتر ہندوستانی ہوگا۔ مولانا اپنے اس خیال کی توضیح یوں فرماتے ہیں: ”صحیح معنوں میں ہندوستانی وہ ہے جس نے ہندوستان کا انتشار دور کر کے اس میں وحدت پیدا کر دی اور اسے ایک راستہ پر لگا دیا۔ اس نقطہ نگاہ سے ہندوستان کی تاریخ پر ایک نظر ڈالی جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ پہلے یہاں بھیل اور گونڈ تو میں بستی تھیں ان کی تاریخ کا ہمیں زیادہ علم نہیں۔ ہم فی الحال صرف اتنا جانتے ہیں کہ آریوں نے ہندوستان میں پہلے پہل ایک قسم کی وحدت پیدا کی اور اشوک اعظم جیسا شہنشاہ پیدا کیا جس نے تقریباً سارے ہندوستان پر ایک مرکزی حکومت پیدا کر کے داخلی افتراق کو دور کر دیا آریہ لوگ پہلے ہندوستانی ہیں، جنہوں نے بھیل اور گونڈ کی ہندوستانی کو منسوخ کر دیا۔ بشرطیکہ انہوں نے یہاں کوئی ہندوستانی پیدا کی ہو۔“

”اس کے بعد اسلام اپنے پہلے دور میں سرحدات ہند تک پہنچ گیا، کابل اور غزنی جو تاریخی اعتبار سے ہندوستان کے آخری اضلاع تھے، حضرت عثمان ذوالنورین کے عہد خلافت میں فتح ہو چکے تھے۔ مگر ہندوستان کے اندر ایک نئی تحریک کی حیثیت سے اسلام چار سو سال کے بعد داخل ہوا۔“

”غزنی کے مرکز سے محمود نے بڑھنا شروع کیا۔ اور اس کے بعد مسلمانوں نے پانچ چھ سو برس کے عرصہ میں ہندوستان کی منتشر طاقتوں کو از سر نو جمع کر دیا۔ اور اشوک کے بعد پھر ہندوستان میں عالمگیر جیسا ہندوستان گیر بادشاہ پیدا ہوا جس نے سارے ملک پر پچاس برس تک حکمرانی کی اور تمام ملک میں ایک قانون جاری کر دکھایا۔ یہ دوسری ہندوستانی طاقت تھی جس نے آریوں کو ہندوستانی سے اس طرح گرا دیا جس طرح آریوں نے گونڈ اور بھیل کو ہندوستانی سے گرایا تھا۔ مگر آریوں کی گراوٹ ایسی نہ تھی جیسی گونڈ اور بھیل کی تھی۔ اس لیے یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ مسلمان اول درجے کے ہندوستانی ہیں اور ہندو یعنی آریہ دوم درجہ کے ہندوستانی ہیں۔“

”عالمگیر کے بعد ہندوستان میں پھر بد نظمی شروع ہو گئی۔ اس پریشانی اور طوائف الملو کی کو برطانوی طاقت نے آکر دور کر دیا۔ اب اگر برطانیہ والے اپنے آپ کو ہندوستانی کہنے پر راضی ہوں اور ان کی ایک شاخ اینگلو انڈینوں کی طرح ہندوستان کو اپنا وطن بنا لے۔ اور وہی اس اجتماعیت کا مرکز بن جائے تو آج یہ لوگ اول درجے کے ہندوستانی کہے جائیں گے اور مسلمان اور ہندو دوم اور سوم درجے کے ہندوستانی ہوں گے۔“

مولانا غزنی سے ہندوستانی تاریخ کی اس دور کے ابتدا کرتے ہیں، موصوف غزنی و کابل کو ہندوستان کا ایک حصہ سمجھتے ہیں چنانچہ ان کا کہنا یہ ہے کہ شروع سے ہی یہ اضلاع ہندوستان میں سے شمار

ہوتے چلے آئے ہیں اور اشوک سے لے کر محمد شاہ کے عہد تک ہندوستان کی شمالی سرحد ہمیشہ غزنی کا بل سے آگے ہرات رہی ہے اس سلسلے میں مولانا نے ایک دفعہ فرمایا کہ جب اکبر نے آگرہ شہر کو پایہ تخت بنایا اور وہاں قلعے اور شاہی محل تعمیر کیے تو اس نے اپنے مصاحبوں سے شہر کے بارے میں رائے پوچھی۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ شہر تو خوب ہے لیکن اس میں ایک کمی رہ گئی ہے اور وہ یہ کہ شہر کی فصیل نہیں بنائی گئی۔ اکبر اعظم نے جواب دیا کہ آگرہ کی فصیل کا بل ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ غزنی اس وقت کے نئے ہندوستان کا پہلا مرکز تھا۔ پھر یہ مرکز لاہور میں منتقل ہوا اور لاہور سے ہندوستان کی مرکزیت کی یہ سعادت دہلی کو نصیب ہوئی۔ بعینہ جس طرح سات سو برس بعد بمبئی، مدارس اور کلکتہ سے چلتے چلتے موجودہ ہندوستان کا مرکز دہلی بنا۔ بغداد ایرانی اور سامی دونوں قوموں کا مرکز تھا۔ بعد میں ایرانیوں نے اپنا مستقل مرکز بخارا کو بنایا۔ بخارا سے ایک شخص ہندوستان کے پنجتون علاقہ (غزنی) میں حکومت قائم کرتا ہے اور یہ حکومت آگے چل کر ہندوستان کے مرکز پر قابض ہو جاتی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ یہ لوگ ہندوستان میں آئے تو انہوں نے ہندوستان سے بہت سی چیزیں لیں، لیکن ان کے تمدن کا منبع ویدک اور بدھ ہندوستان نہ تھا، ان نواردوں کی ذہنیت پر اسلام کا اثر غالب تھا۔ وہ جس چیز کو اپنی ذہنیت کے خلاف پاتے، اسے رد کر دیتے اور جو چیز اپنے رجحان کے مطابق ہوتی اسے قبول کرتے اس رد و قبول میں مسلمانوں کی اپنی شخصیت محفوظ رہی، چنانچہ ان لوگوں کو ہندو تہذیب اپنا نہ سکی، جس طرح اس نے ان سے پہلے آنے والے ان کے بھائی ہندوں کو اپنے رنگ میں رنگ دیا اور انہیں اپنے سماج کا حصہ بنا لیا تھا۔

مسلمانوں کی شخصیت کا منبع وہی اسلام کی سادہ تعلیم اور اس کا اخوت اور مساوات کا نظام رہا۔ مولانا فرماتے ہیں کہ اگر مسلمان کبھی اس منبع سے کٹ گئے اور ان کی زندگی کا سرچشمہ فیض قرآن اور اس کا فکر نہ رہا۔ تو یہ مسلمانوں کی مذہبی اور اجتماعی موت ہوگی اور وہ بھی اسی طرح ہندو رجحیت کا شکار ہو جائیں گے جس طرح ان سے پہلے ستھین تو میں ہو گئی تھیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ مسلمان ہندو فکر یا ہندو تمدن سے مطلق کوئی استفادہ نہ کریں یا انہوں نے کبھی پہلے اس طرح کا استفادہ نہیں کیا۔ محمود غزنوی نے تو اپنی فوج میں ہندوؤں کو بھرتی کیا۔ وسط ایشیا میں ان کی مدد سے اس نے بڑے بڑے معرکے سر کیے تھے اور خاص طور پر سلطنت کے نظم و نسق میں تو ہندو اہلکاروں سے مسلمان حاکموں کو بہت کچھ سیکھنا پڑا۔

بات یہ ہے کہ مسلمان حملہ آور اپنے ساتھ منشی، متصدی، محاسب کارِ گیر اور پیشہ ور تو ساتھ لائے نہیں تھے اور فرض کیا کہ اگر باہر سے یہ لوگ آ بھی جاتے تو نئے ملک اور نئے حالات میں ان سے

کام ایسے چل سکتا تھا۔ لامحالہ جب مسلمانوں نے اس ملک کو وطن بنایا اور یہیں رہنا شروع کیا تو اصلی باشندوں سے انہیں لین دین کرنا پڑا اور اس طرح دونوں قوموں کے میل ملاپ سے ایک نئی تہذیب کا پیدا ہونا ضروری تھا۔

مولانا فرماتے ہیں کہ بنو امیہ کے عہد میں مسلمانوں کی جماعتی زندگی میں قدیم عربی اثرات کے ساتھ ساتھ شام کے عیسائیوں اور یہودیوں کے عناصر تمدن بھی موجود تھے۔ عباسی دور میں مسلمانوں کی سوسائٹی پر ایرانی تہذیب اور یونانی فلسفہ کا اثر پڑا، چنانچہ اسی زمانہ میں علوم کی تدوین ہوئی اور علم تصوف معرض وجود میں آیا اور آگے چل کر اسلام کی اشاعت اور ترقی میں یہ چیزیں بڑی مدد ثابت ہوئیں۔ اسی طرح لاہور اور دہلی میں اسلامی اجتماع نے ہندوؤں کی جو باتیں اپنے مذاق کے مطابق پائیں انہیں اخذ کر لیا، لیکن اب حالت یہ ہے کہ اسلامی تاریخ میں عربوں کے دور کو تو مقدس سمجھ لیا گیا ہے اور ایرانیوں، ترکوں اور ہندوستانیوں کے دور کو زوال کا عہد بتایا جاتا ہے۔

اندرون ہند میں مسلمانوں کا پہلا مرکز لاہور تھا۔ یہاں مسلمانوں کو ہندوؤں کے رسوم و اطوار دیکھنے اور ان کے علوم سے استفادہ کرنے کا موقع ملا۔ مسعود سعد سلمان جو غزنوی دور کا ممتاز شاعر ہے اس کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ عربی، فارسی کے علاوہ ہندی میں بھی شعر موزوں کرتا تھا۔ لاہور کے بعد دہلی کی باری آئی، شمس الدین التمش کے زمانے میں دہلی کا شہر مجمع الاقوام بن گیا تھا، تاریخ میں لکھا ہے کہ التمش کے عہد میں چنگیز خان کی تباہ کاریوں سے جان بچا کر بڑے بڑے سردار اور امیر جو ساہا سال سے حکومتوں کے مالک چلے آتے تھے اور نامی گرامی علماء اور وزراء دہلی میں جمع ہو گئے ان جلیل القدر نو واردوں کی نظیر دنیا میں مشکل سے مل سکتی تھی۔ ان کی بدولت التمش کا دربار محمود، غزنوی اور سلطان سنجر کے دربار کا نقش ثانی بن گیا۔ ابتدائے سلطنت سے ہی بادشاہ کی کوشش یہ رہی کہ وہ دنیا بھر کے علماء، سادات، لوگ، امراء اور عظام کبار کو اپنے دارالسلطنت میں جمع کرے، چنانچہ اس سلسلے میں وہ ہر سال ایک کروڑ روپیہ صرف کرتا تھا اس زمانے میں دہلی میں ہر طرف سے اہل علم آگئے تھے چنانچہ التمش کے فضل و کرم سے یہ شہر دنیا بھر کے بڑے آدمیوں کا مرجع بن گیا۔

سلطان غیاث الدین نے بلین کے زمانے میں بھی ماوراء النہر، خراسان، عراق، آذربائیجان، فارس اور روم و شام سے آنے والے کا سلسلہ جاری رہا۔ ان نو واردوں کے ناموں پر دہلی میں پندرہ محلے آباد ہوئے۔ علاؤ الدین خلجی کے زمانے میں دہلی کی جو شان و شوکت تھی، اس کا نقشہ امیر خسرو نے ان کبھی نہ بھولنے والے الفاظ میں یوں کھینچا ہے۔

خوشا ہندوستان رونق دین
ز علم پامل دہلی بخارا
مسلمانان بہ نعمانی روشن خاک
نہ کیس باشافی نے مہر بازید

شریعت را کمال غر و تمکین
ز شاہان گشتہ اسلام آشکارا
زول ہر چار آئیں را بہ اخلاص
جماعت را وسنت را بجاں صید

شمال سے یہ نو وارد نئے نئے علوم اور معارف ساتھ لائے اور ادھر ہندوستان کے قدیم ادب و فنون سے استفادہ کیا جاتا، چنانچہ جوں جوں دن گزرتے گئے اور ان دو بڑی قوموں اور تمدنوں کا اختلاط بڑھا، ہندوستان کا نیا تمدن برگ و بار لاتا چلا گیا۔ جس زمانے کی ہم بات کر رہے ہیں، اس زمانے میں مشرق قریب اور وسط ایشیا کے ممالک تہذیب و تمدن میں وہی حیثیت رکھتے تھے، جو اس صدی میں یورپ کو حاصل ہے۔ عربی و فارسی اس عہد میں علم و فلسفہ اور ادب و کلمہ کی زبانیں تھیں ان میں دنیا جہاں کے علوم و فنون کے ترجمے ہو چکے تھے اور ان زبانوں کے بولنے والے اس وقت کی فکری اور علمی دنیا کے صحیح معنوں میں امام تھے۔ یورپ میں قرطبہ، افریقہ میں قاہرہ، عراق میں بغداد اور خراسان میں بخارا، ایک ہمہ گیر تہذیب، ایک بین الاقوامی سوسائٹی اور ایک وسیع النظر ادب و فلسفہ کے مراکز تھے۔ یہاں یونان کے علوم نے نئی زندگی پائی۔ ایران کا پرانا ادب از سر نو زندہ ہوا۔ طب کو ترقی ملی۔ ہیئت اور جغرافیہ میں نئی تحقیقات کی گئیں اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ ان علمی سرگرمیوں میں دنیا کی سب قوموں نے حصہ لیا۔ محمود غزنوی سے لے کر اکبر اور عالمگیر کے زمانے تک شمال سے جو بھی اہل علم اور اصحاب کمال آئے وہ اپنے ساتھ علم و فلسفہ اور تہذیب و تمدن کی ان شان دار روایات کو ساتھ لائے۔ یہ لوگ آنے سے پہلے ہندوستان کے علوم اور یہاں کی حکمت سے بھی ایک حد تک واقف ہو چکے تھے۔ خلیفہ منصور، ہارون اور ماموں کے زمانے میں سنسکرت کی بہت سی کتابوں کا عربی میں ترجمہ ہوا اور چونکہ سندھ میں مسلمانوں کی حکومت تھی اس لیے ہندوستان کے ساتھ ان کے سیاسی تعلقات قائم تھے اور اس کی وجہ سے علمی روابط بھی پیدا ہو گئے اور خاص طور پر مسلمانوں کا علم تصوف تو ہندی افکار سے بہت زیادہ متاثر ہوا۔

بے شک شمال سے محمود غزنوی، محمد غوری، تیمور اور بابر ایسے متعین زن اور جری سپہ سالار بھی آئے، لیکن ان کے ساتھ البیرونی ایسے محقق، حضرت داتا گنج بخش، ججویری، حضرت معین الدین چشتی اور حضرت بختیار کاکی جیسے اصحاب ارشاد و ہدایت بھی تشریف لائے۔ پھر محمود گاو، بیرم خان اور آصف جاہ ایسے مدبر اور سیاست دان بھی آئے اور عرفی، نظیری جیسے شاعر اور حکیم فتح اللہ شیرازی ایسے حکیم اور ان کے علاوہ بڑے بڑے مصوروں، مہندسوں اور اصحاب فن نے بھی اس ملک کو اپنا وطن بنایا۔ ان لوگوں کا اس وقت کی دنیا میں علمی پایہ کتنا بلند تھا اس کا اندازہ البیرونی کی شخصیت سے ہوتا ہے۔

البیرونی سلطان محمود غزنوی کے زمانے میں ہندوستان آیا، اس نے یہاں رہ کر سنسکرت زبان سیکھی اور ہندوؤں کے علوم و فنون کا برسوں مطالعہ کیا اور "کتاب الہند" کے نام سے ایک بے نظیر کتاب تصنیف کی۔ البیرونی کئی زبانوں کا عالم تھا۔ فارسی تو اس کی زبان ہی تھی، لیکن اس کے علاوہ عربی، عبرانی، سریانی اور سنسکرت پر بھی اسے پوری قدرت حاصل تھی۔ زبانوں سے زیادہ البیرونی علوم میں دست گاہ رکھتا تھا۔ وہ ریاضی، طبیعیات، منطق، ہیئت مساحت و ہندسہ، علم المناظر، ارضیات، علم الآثار، علم کیمیا، تاریخ مذاہب، جغرافیہ اور فلسفہ وغیرہ کا بڑا فاضل تھا۔ لیکن خاص کر ریاضی، ہیئت اور جغرافیہ میں تو اسے تبحر تھا اور ان علوم میں اس نے بڑی تحقیقات اور اصلاحیں کیں۔ البیرونی کی تصنیفات کا شمار کرنا مشکل ہے۔ تحقیق کرنے سے معلوم ہوا ہے کہ اس نے مختلف علوم و فنون پر ایک سو چودہ سے زیادہ کتابیں لکھیں۔ اس کی تصانیف سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک بے تعصب، صلح کل، آزاد خیال اور حق پرست حکیم تھا اس کے حلقہ احباب میں عیسائی، یہودی، زردشتی، صوفی اور ہندو غرضیکہ ہر قوم اور ہر مذہب کے لوگ تھے۔

البیرونی اس زمانے میں ہندوستان آیا، جس وقت کسی اجنبی کا ہندوؤں میں آنا اور ان کے ساتھ رہنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ وہ غزنی سے جب ہندوستان پہنچا ہے تو مغربی ہند میں محمود غزنوی کے حملوں کی وجہ سے بڑی ابتری اور پریشانی پھیلی ہوئی تھی۔ اس کی ہمت استقلال اور شوق کی داد دینی پڑتی ہے کہ اس نے اس زمانے میں ہندوستان کا سفر کیا اور سنسکرت جو اس کے لیے بالکل اجنبی اور غیر مانوس زبان تھی، سیکھی اور ہندوستان کے مذاہب اور فلسفہ ادب، جغرافیہ، ہیئت، جوش، رسم و رواج اور قوانین میں تحقیقات کیں، بیان کیا جاتا ہے کہ برہمن اس کی ذہانت اور علم و فضل کو دیکھ کر حیرت کرتے تھے اور اسے ساگر یعنی علم کا سمندر کہتے تھے۔

البیرونی ہندوستان آیا اور سیر و سیاحت اور استفادہ تحصیل علم کر کے واپس چلا گیا، لیکن اس کے بعد البیرونی کے اور ہزاروں بھائی بند اس ملک میں آئے اور یہیں بس گئے۔ گوانتس اور بلین کے زمانہ میں تاتاریوں کے ہاتھ سے وسط ایشیا اور عراق کی تہذیب اور علمی مرکز تباہ ہو گئے، لیکن اس مٹی ہوئی عظمت میں بھی علم و حکمت کی چنگاریاں ابھی باقی تھیں۔ چنانچہ کافی عرصہ تک شمال سے آنے والوں کا تاننا ہندھا رہا۔ یہ لوگ اگر لشکروں کے سپہ سالار ہوتے تو اپنی سلطنتیں بنا لیتے۔ سیاست دان ہوتے تو ان کو ظم و نسق ملک میں اعلیٰ عہدے دیئے جاتے۔ عالم اور فاضل ہوتے تو علم اور ادب کی مجلسوں میں صدر نشین ہوتے۔ فن تعمیر سے دلچسپی ہوتی تو عمارتوں کے لیے نقشے بناتے، مصور اور شاعر ہوتے تو درباروں کی زینت اور عزت بنتے۔ الغرض کئی سو سال تک ان ارباب کمال کی بدولت ہندوستان کی تمدنی اور علمی زندگی میں وسعت، گہرائی اور جلا پیدا ہوتی چلی گئی۔

ایک طرف شمال سے علم و حکمت کے یہ سرچشمے بہ بہ کرا اس سرزمین کو سیراب کر رہے تھے اور دوسری طرف ہندوستان کے قدیم علوم کو کھنگالا جا رہا تھا۔ چنانچہ فاتح مسلمان ان سے کھلے دل سے مستفید ہوتے تھے۔ لیکن ہندوؤں کو بھی نئے اثرات قبول کرنے میں باک نہ تھا۔ مولانا فرماتے ہیں کہ فیروز شاہ تغلق کے زمانے میں دونوں قوموں میں اخذ و قبول کے تعلقات بڑے وسیع ہو گئے تھے۔ اس عہد میں ہندوستانی اسلامی سلطنت کے لیے قانون مرتب کرنے کی کوشش بھی کی گئی۔ یہ فقہ کی کتاب فتاویٰ تاتار خانہ تھی۔ تاتار خانہ دراصل بخارا کی حنفی فقہ کا عکس ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان جواب تک حاکم تھا ہندوستان میں اپنا ذہنی تفوق قائم کرنے میں کوشاں ہے اور اپنے فکری سلسلہ کو اصل سرچشمہ یعنی بخارا سے وابستہ رکھتا ہے۔

تغلقوں کے بعد لودھی اور سوری آئے تو ہندوستانی سوسائٹی سے مسلمان حکمران اور بھی قریب ہو گئے۔ سکندر لودھی اور شیر شاہ سوری دراصل ہندوستانی اسلامی قومیت کی طرح ڈالنے والے ہیں، جسے بعد میں اکبر نے پروان چڑھایا، اکبر کے زمانے میں ہندوستانی مسلمان نے خود اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی سکت پیدا کر لی تھی۔ اب وہ شمال سے آنے والوں کی سیاسی قیادت اور علمی اور ذہنی برتری کا محتاج نہ رہا تھا اور اس کی نظریں بخارا، سمرقند اور قاہرہ کے بجائے دہلی اور آگرہ کی طرف اٹھنے لگی تھیں۔ اکبر تغلقوں کی طرح نہ تو قاہرہ کے عباسی خلفاء کی دینی حاکمیت کو تسلیم کرتا تھا اور نہ اسے اپنے باپ ہمایوں کی تقلید میں ایران کے شیعہ بادشاہوں کی سرداری گوارا تھی۔ چنانچہ اس نے ہندوستان میں ایک مستقل صاحب اقتدار سلطنت کی بنیاد رکھی۔ یہ خالص ہندوستانی سلطنت کی ابتداء تھی جس طرح ماموں نے عربوں اور ایرانیوں کی ذہنی مخالفت دور کر کے دونوں قوموں کو بغداد کے سیاسی مرکز کے تابع کرنے کی کوشش کی تھی، بعینہ اکبر نے ہندوستان کے مسلمانوں اور ہندوؤں کو مغل تخت سے وابستہ رکھنے کے لیے ایک فکری اور سیاسی وحدت کی تشکیل کی۔ اتفاق سے عربوں کی طرح ایرانی بھی مسلمان تھے اس لیے دونوں قوموں کو ملانے کے لیے اسلام کی ایسی تعبیر ہو سکتی تھی جو قرآن کے حقیقی منشا کے مطابق بھی ہو اور دونوں قوموں کی مخصوص ذہنیات کو مطمئن بھی کر دے۔ اس کے برعکس یہاں دو الگ الگ مذاہب تھے اور ہر مذہب اپنی اپنی جگہ ایک مستقل حیثیت رکھتا تھا۔ چنانچہ ہندو مذہب اور اسلام کے ماننے والوں میں سیاسی یک جہتی اور ذہنی موافقت پیدا کرنے کے لیے ایک ایسے فکر کی ضرورت تھی جو مختلف مذاہب کو اپنے اندر لے سکے اور اس میں الگ الگ تمدن رکھنے والی قوموں کی سمائی ہو جائے۔ یہ وحدت الوجود کا لکڑھا، جو اسلامی تصوف کی وجہ سے مسلمانوں میں بھی ہر دل عزیز تھا اور ہندوؤں کے مذہب میں بھی اس کی ممتاز حیثیت تھی۔

اکبر کی ہندوستانی سلطنت کا بنیادی اصول یہ فکر تھا۔ بد قسمتی سے ہندوستان کے حالات کچھ اس قسم کے تھے کہ اس فکر سے ملک کی سیاسی زندگی میں خاطرہ خواہ نتائج نہ نکل سکے، بلکہ اس کے خلاف مسلمانوں کے حکمران طبقوں میں سخت رد عمل ہوا۔ بات یہ ہے کہ جس طرح ماموں کے اقدام سے عربی ذہن کے تفوق پر زد پڑتی تھی اور عرب یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ سیاسی اقتدار کے ساتھ ساتھ اب ان کی ذہنی برتری بھی خطرے میں ہے۔ چنانچہ خلیفہ متوکل کے زمانے میں ماموں کے فکر اعتراض کے خلاف امام احمد بن حنبل کے مسلک کو غلبہ نصیب ہوا اس طرح اکبر کے زمانے میں بھی ہندوستان کے مسلمان حکمران طبقوں نے محسوس کیا کہ اکبری مسلک سے اسلام کی برتری کو صدمہ پہنچے گا اور اس کے ساتھ ان کی سیادت بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔ چنانچہ یہاں بھی اکبری فکر کے خلاف خوات ہوئی اور عالمگیر کے زمانے میں امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی کے مسلک کو حکومت کا اصول تسلیم کر لیا گیا۔

عالمگیر نے سیاسی طاقت کے زور سے مسلمانوں کے حکمران طبقوں کا ذہنی تفوق قائم رکھنا چاہا اور اس سلسلے میں امام ربانی کے عقیدہ وحدت الشہود سے بڑی مدد ملی، لیکن اس میں وہ پورا کامیاب نہ ہو سکا اور مزید بد نصیبی یہ ہوئی کہ اس کے جانشین اس قابل نہ نکلے کہ وہ اتنی بڑی ذمہ داری کو سنبھال سکتے۔ چنانچہ اورنگ زیب کے مرتے ہی سلطنت میں انتشار پیدا ہو گیا اور ظاہر ہے جب سیاسی قوت نہ رہی تو اس سیاسی قوت کا مظہر یعنی ذہنی تفوق کیسے قائم رہ سکتا ہے۔ محمد شاہ کے زمانے میں مغلوں کی سیاسی قوت کا بالکل خاتمہ ہو جاتا ہے۔ نادر شاہ کے حملہ کے بعد حقیقت میں اکبر اور عالمگیر کی بنائی ہوئی سلطنت کا محض دم واپس تھا۔

مسلمانوں کی سیاسی قوت فنا ہو گئی لیکن وہ فکر جس نے اس سیاسی قوت کو عملی شکل دی تھی وہ اب تک موجود تھا۔ شاہ ولی اللہ صاحب اور ان کا خاندان اس فکر کے ترجمان ہیں، یہ فکر سیاسی قوت کے بل پر اپنی برتری ثابت نہیں کرتا کیونکہ اس وقت مسلمانوں کی سیاسی قوت میں تو اتنا دم خم ہی نہ رہا تھا۔ یہ فکر انسانی فہم و بصیرت اور اپنی عمومیت اور اقادیت پر اپنی برتری کی بنیاد رکھتا ہے اور ہندو مسلمان، عیسائی اور یہودی کو یکساں طور پر اپنا مخاطب بناتا ہے۔

شاہ صاحب کا یہ فکر کیا ہے؟ اور انہوں نے اسے کس طرح نشر کرنے کی کوشش کی۔ یہ بیان کچھ تفصیل چاہتا ہے اور چونکہ شاہ ولی اللہ صاحب اور ان کے اس فکر کا اکبر اعظم اور اورنگ زیب عالمگیر کے عہد سلطنت اور ان کی سیاسی حکمت عملیوں سے بڑا گہرا تعلق ہے، اس لیے نامناسب نہ ہوگا اگر ہم یہاں ہندوستان کے ان دو الو العزم اور عظیم المرتبت شہنشاہوں کے بارے میں مولانا کے جو خیالات ہیں ان کا ذکر کر دیں۔

اکبر اعظم

اکبر ایک اولوالعزم بادشاہ تھا، اس کے حوصلے بڑے اور دل ان سے بھی بڑا تھا۔ قدرت نے اسے غیر معمولی صلاحیتیں عطا کی تھیں اور اس جیسی طبیعت والے بادشاہ کے لیے ممکن نہ تھا کہ وہ کسی دوسرے کا وکیل بن کر رہے۔ اکبر کے سر پر جب تاج رکھا گیا تو اس کی عمر بارہ برس کی تھی، چنانچہ اس کا اتالیق بیرم خان ہی سلطنت کے سیاہ و سفید کا مالک بنا، لیکن اکبر جب جوان ہوا اور اس کی فطری استعدادوں کے بروئے کار آنے کا وقت آیا تو اس نے محسوس کیا کہ اگر وہ اپنے ہم قوم تورانیوں کے بھروسہ پر رہا تو جو اس کے باپ کا حشر ہوا تھا، وہی اس کا بھی ہوگا۔ ایرانی اثر دربار میں پہلے موجود تھا اور بیرم خان کی علیحدگی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ ایرانیوں کے اس عمل و عمل کو کم کیا جائے۔ اس لیے ادھر سے متنبہ رہنا ضروری تھا۔ ہندوستانی تو مغلوں کو غیر سمجھتے ہی تھے، پانی پت میں ہندوستانی مسلمان ابراہیم لودھی کے جھنڈے تلے باہر سے لڑے اور اگرہ کے پاس ہندوؤں کی طرف سے رانا ساٹگانے جنگ کی۔ باہر اس وقت ہندوستانیوں کے مقابلے میں گوکامیاب ہوا، لیکن انہوں نے بعد میں اس کے بیٹے ہمایوں کو ہندوستان سے بھاگ کر جان بچانے پر مجبور کیا۔ اس کے بعد جب ہمایوں پھر ہندوستان پر حملہ آور ہوا اور اس کے مرنے کے بعد اکبر کو دہلی کا تخت دوبارہ حاصل کرنے کے لیے لڑنا پڑا تو پانی پت کے میدان میں پٹھان اور راجپوت ایک ہندو سپہ سالار کے ماتحت لڑنے کو نکلے تھے، مختصر اُسارے کے سارے ہندوستانی کیا پٹھان اور کیا راجپوت مغلوں کو اجنبی اور دشمن سمجھتے تھے، گو اکبر نے ہیمو بقال کو شکست دے کر دہلی کی سلطنت حاصل کر لی تھی، لیکن ہر وقت اس کا امکان تھا کہ جس طرح ہندوستانیوں نے شیر خان کی ماتحتی میں اکبر کے باپ کو ملک سے نکال باہر کیا تھا۔ اس طرح وہ دوبارہ اکبر کو بھی تخت و تاج سے محروم کر سکتے تھے اور خاص طور پر جب اکبر کے ہم قوم تورانی آئے دن بغاوتوں پر آمادہ ہوں اور ایرانیوں سے بھی ایک حد تک بے چکا ہو، نیز خود ہندوستان کے ہمسائے میں ان کی اپنی ایک آزاد سلطنت ہو۔

اکبر کو ان حالات سے سابقہ پڑا۔ بے شک وہ باہر سے کم تیج آزمانہ تھا، لیکن وہ جانتا تھا کہ اگر تیج آزمائی کے ساتھ ساتھ سلطنت کی بنیادیں مستحکم اور پائیدار نہ بنائی جائیں تو سلطنت سے ہاتھ دھونے پڑتے ہیں۔ اکبر اگر صحیح معنوں میں بڑا بادشاہ نہ ہوتا تو ان حریف قوتوں کے مقابلے میں سپردال

دیتا لیکن اس کی قسمت میں تو ہندوستان کی تاریخ میں ایک نئے نظام کا ڈول ڈالنا لکھا تھا اور خدا نے اس کو اس بڑے کام کی پوری صلاحیت بھی دی تھی۔ چنانچہ اکبر نے اس عہد کے تاریخی تقاضوں کو پورا کرنے کی ہمت کی۔ اس وقت ہندوستان میں ضرورت تھی ایک ایسی سلطنت کی جو ہندوؤں کو جن پر ملک کی بیشتر آبادی مشتمل تھی اور جن میں اب سیاسی بیداری اور قومی شعور پیدا ہو چلا تھا اپنا سکتی۔ وہ ہندوستان میں آباد کار مسلمانوں کو بھی مطمئن کرتی اور باہر اور ہمایوں کے ماتحت جوئے عناصر ملک میں آگئے تھے ان کو بھی ساتھ ملاتی، اگر خلیجیوں اور تعلقوں کی طرح محض فوجی طاقت کے زور پر نئے عناصر حکومت کرنا چاہتے تو ہندو اور ہندوستانی مسلمان مل کر ان کو ہمایوں کی طرح سلطنت سے بے دخل کر سکتے تھے اور اگر ہندوؤں کو حکومت میں شریک نہ کیا جاتا تو ان کی ریشہ دوانیوں سے کبھی چین نصیب نہ ہوتا، کیونکہ اب ہندوستان کی سیاسی حالت ایسی تھی کہ ہندوؤں کو ناراض کر کے اس ملک میں امن قائم کرنا مشکل ہو گیا تھا۔

ہندوستان کا یہ تاریخی دور ایک ایسے نظام کا متقاضی تھا جو ہندوؤں، ہندوستانی مسلمانوں اور مغلوں کو ایک جھنڈے تلے جمع کرتا، اس وقت جس طرح ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل ملاپ سے ایک متحدہ کلچر بن رہا تھا اور ایک مشترکہ زبان کی بنا پڑ رہی تھی، نیز ہندوؤں میں بھگت کیر اور گورو نانک ایسے مصلح پیدا ہو رہے تھے جو دونوں قوموں، دونوں تمدنوں اور دونوں مذہبوں کو ایک دوسرے سے قریب لانے میں کوشاں تھے، اسی طرح سلطنت اور سیاست میں بھی ایک ایسے نظام کی ضرورت تھی جو دونوں قوموں میں مشترک ہوتا، وہ اسلامی بھی ہوتا، ہندوستانی بھی ہوتا اور ظاہر ہے آزاد بھی ہوتا۔ چنانچہ اکبر پہلا مسلمان فرماں روا ہے جس نے اس ملک میں آزاد اسلامی ہندوستانی سلطنت کی بنیاد رکھی جو نہ ایران کی حلقہ بگوش تھی اور نہ عثمانی سلاطین کے تابع۔ یہ مسلمانوں کی قیادت میں ہندوستان میں قومی حکومت کی تشکیل تھی اور اسلام کے اصول و قوانین کے اندر ہندوستانی قومیت اور اس کے تمدن اور تہذیب کو زندہ کرنے کی کوشش۔

اس وقت کوئی ہندوستانی حکومت خواہ اس کا اقتدار کلیہً مسلمانوں ہی کے ہاتھ میں ہوتا غیر مسلم ہندوستانیوں کو شریک کیے بغیر نہیں بن سکتی تھی۔ اکبر نے راجپوتوں کو اپنے ساتھ ملایا، حاکم حکومتوں کو زور بازو سے بھی اپنے ساتھ ملا سکتے تھے، لیکن یہ ملاپ اوپرے دل سے ہوتا اور دیر پا نہیں ہوتا۔ اکبر نے راجپوتوں کے دلوں کو ہاتھ میں لینے کی کوشش کی، اس نے راجپوتوں سے ناٹھ جوڑا، ان کی بعض رسمیں قبول کر کے ان کو اپنے سے قریب کیا ہندوؤں سے جزیہ لینا بند کر دیا اور وحدت الوجود کے عقیدہ کو اپنے عقیدہ کا بنیاد برقرار دے کر یہ واضح کر دیا کہ صدائیں سب مذاہب میں ہیں۔ اور ایک ہی منبع سے ہر

قوم کو رشد و ہدایت کی نعمتیں ملتی رہی ہیں۔ اکبر کی یہ باتیں محض سیاسی مصلحت کی بنا پر نہ تھیں۔ وہ دل سے بھی ان کا قائل تھا۔ فیضی اور ابوالفضل نے اکبر کو ان باتوں کے سچا ہونے کا پورا یقین دلایا تھا اور وہ یہ بھی سمجھتا تھا کہ اس کے مسلک سے اسلام کو گزند نہیں پہنچے گا۔

اکبر کا دین الہی کیا تھا؟ اس کے متعلق اس عہد کے مورخ ملا عبدالقادر بدایونی نے بہت تفصیل سے لکھا ہے، ملا صاحب بڑے سخت گیر مورخ ہیں، ہمیں یہاں ان کے بیانات کی تردید مقصود نہیں لیکن ہمارے خیال میں ملا صاحب نے اکبر کے ان واقعات کو سطحی نظر سے دیکھا ہے اور انہوں نے زیادہ تعمق سے کام نہیں لیا۔ خود ہمارے زمانے میں مصطفیٰ کمال کی ایک مثال موجود ہے، مرحوم کی بے دینی اور الحاد کے متعلق کئی عینی شواہد پیش کیے جاتے ہیں اور ایک نہیں سینکڑوں کتابیں اس قسم کے واقعات سے پر ہیں، لیکن دیکھنے والوں میں بھی بڑا فرق ہوتا ہے۔ مصطفیٰ کمال کو ترکی میں ایک نئے دور کا آغاز کرنا پڑا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو ترکی کے حالات کچھ ایسے تھے کہ ترکی قوم کا وجود ہی خطرے میں پڑ جاتا اور مخالف قوتیں اسے ابھرنے کا موقع نہ دیتیں۔ مصطفیٰ کمال نے نئے دور کی داغ بیل ڈالی جو اسے طرز نو کا حامی نظر آیا، اسے اپنے ساتھ ملایا، جن لوگوں نے اس کی مخالفت کی ان کو اور ان کی ہر چیز کو مردود قرار دیا۔ ممکن ہے کہ اس کے معاون اپنے ساتھ بری عادتیں بھی لائے ہوں، لیکن چونکہ ضرورت مددگاروں کی تھی، اس لیے انہیں قبول کر لیا گیا۔ اسی طرح اکبر کو بھی اپنے نئے مسلک کے لیے حمایتی چاہیے تھے، وہ اسے جس گروہ سے بھی ملے اس نے انہیں اپنے ارد گرد جمع کر لیا اور ان سے اپنا کام چلایا۔

جب کسی نئے فکر پر عمل ہوتا ہے تو شروع میں بعض دفعہ بڑی گڑبڑ ہوتی ہے، فکر خواہ کتنا واضح اور صاف ہی کیوں نہ ہو لیکن چونکہ اکثر کام کے لیے موزوں آدمی میسر نہیں آتے، اس لیے اس پر بالعموم نہایت بے ڈھنگے پن سے کام ہوتا ہے اور اکثر اوقات اس سے عجیب خلفشار سا پیدا ہو جاتا ہے۔ اکبر کا دور اس قسم کے خلفشار کا دور ہے، لیکن اکبر کے بعد بھی اکبر کی سیاست پر برابر عمل ہوتا رہا۔ چنانچہ زمانے کے ساتھ ساتھ اکبر عہد کی فروگذاشتوں کی بھی اصلاح ہوتی گئی، جہانگیر کے بعد شاہ جہان کا عہد آیا، تو ہندوستان کی سلطنت اپنے پورے عروج پر پہنچ چکی تھی۔ یہ سلطنت نمونہ تھی اس زمانے کے سرمایہ دارانہ نظام کے کمال کا۔ اس نظام میں بیرون ہند کے اسلامی اثرات، نو مسلم ہندوؤں کے اثرات اور مطع ہندوؤں کے اثرات سب جمع ہو گئے تھے۔ البتہ ہندوؤں کی ایک جماعت جو تقریباً نہ ہونے کے برابر تھی اور اپنے قدیم نظام پر مستقل مزاجی سے اڑی ہوئی تھی وہ اس نئے ہندوستانی نظام کی برابر مخالف رہی۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر اکبر اس نظام کی داغ بیل نہ ڈالتا تو جہانگیر، شاہ جہان اور رنگ زیب کے عہد میں ہندوستانی تہذیب نے تعمیر، سیاست، فن اور علم کی دنیاؤں میں جو معجزات دکھائے وہ کیسے ظہور پذیر

ہوتے۔ ان فرماں رواؤں کی عظمتیں درحقیقت اکبر اعظم کی عظمت کا نتیجہ ہیں۔

اکبری عہد کی غلطیاں ایسی غلطیاں نہ تھیں جو بے علمی یا جہالت کی وجہ سے کی جاتی ہیں۔ پرانی ڈگر کو چھوڑ کر نئی راہ پر چلنے والے کے سامنے ظاہر ہے ہموار راستہ نہیں ہوتا، وہ اپنی راہ خود بناتا ہے۔ کیونکہ زمانے کی ضرورتیں اسے مجبور کرتی ہیں اور حالات اس کے متقاضی ہوتے ہیں۔ بعد میں آنے والوں کو چونکہ بنے بنائے نقشے ملتے ہیں اس لیے ان نقشوں کو بناتے وقت جو ادھر ادھر خطوط کھینچے گئے تھے ان کو وہ غلط کہہ کر اپنی فرزانگی کا ثبوت دیتے ہیں۔ وہ غلطی سے سمجھ لیتے ہیں کہ پہلے یہ قیوف تھے۔ انہوں نے ایسا نہ کیا، ہم ہوتے تو یوں کرتے۔ اکبر کے معترضین کا بھی کچھ ایسا ہی حال ہے، وہ اکبر کو اس کے حالات اور ماحول سے الگ کر کے دیکھتے ہیں، انہیں اس کی مشکلات کا صحیح اندازہ نہیں ہوتا۔ اس لیے وہ اس کی شخصیت کے ساتھ انصاف نہیں کر پاتے۔

اکبر نے راجپوتوں میں اپنے نئے حلیف بنائے اور سکندر لودھی اور شیر شاہ سے زیادہ ہندوؤں سے رعایتیں کیں۔ اکبر دیکھ چکا تھا کہ ہندوستانیوں کو اپنا بنائے بغیر مغل اس ملک پر حکومت نہیں کر سکتے۔ سیاسی روابط ہوں تو لامحالہ ذہنی ملاپ کا بھی ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اکبر کے اس کام میں شیخ مبارک اور ان کے دونوں بیٹوں فیضی اور ابوالفضل سے بڑی مدد ملی، چنانچہ اس سیاسی اتحاد کے لیے مشہور صوفی بزرگ شیخ اکبر محمدی الدین ابن عربی کے عقیدہ وحدت الوجود کو فکری اساس بنایا گیا۔ وحدت الوجود کا یہ فکر مسلمانوں کے حکمران طبقوں میں پہلے سے موجود تھا اور تصوف کی وجہ سے اسے بڑی مقبولیت حاصل تھی۔ ہندوؤں کے ہاں بھی یہ فکر تھا۔ اس اشتراک ذہنی کو اکبری سیاست کی اساس مانا گیا اور مذہب اسلام کی برتری جو اب تک حکومت کا دستور تھی۔ اور غیر مسلم اس حکومت میں برابر کے شریک نہ تھے اس کے بجائے اسلام بحیثیت ایک دین کے تو برتر اور اعلیٰ ہی تسلیم کیا گیا لیکن حکومت کا دین پہلے کی طرح اسلام نہ رہا۔ اکبر اب صرف مسلمانوں کا بادشاہ نہ تھا بلکہ سارے ہندوستانیوں کا فرماں روا تھا اور ساری رعایا بادشاہ کی نظروں میں یکساں اور مساوی تھی۔

وحدت الوجود کے عقیدے کے یہ معنی ہیں کہ سارے مذاہب ایک ہی صداقت کی مختلف تعبیریں ہیں، فرق صرف شکلوں کا ہے، اب یہ مانا کہ اصل دین ایک ہی ہے لیکن اس کا پتہ کیسے چلایا جائے کہ اصل دین کیا ہے۔ اور پھر وہ کون سی صداقت ہے جس کی یہ سب تعبیریں ہیں۔ اور وہ اصول و مبادی کیا ہیں، جو سب مذاہب میں مشترک ہیں۔ شیخ ابن عربی اور ان کے پیروؤں کے نزدیک اسلام ہی اس سچائی کا معیار ہے یہی ایک کھسوٹی ہے جس پر سب دین پرکھے جاسکتے ہیں اور تمام مذاہب میں اس کی حیثیت ایک میزان کی ہے، وحدت الوجود کو اس طرح ماننے سے نعوذ باللہ اسلام کی برتری کا انکار

بعد میں یورپ والوں نے تو ان مذہبی نزاعات کا یہ حل نکالا کہ حکومت کو مذہب سے بالکل بے تعلق کر دیا۔ ان کے ہاں آہستہ آہستہ حکومت کا دائرہ اثر اتنا وسیع ہوتا چلا گیا کہ مذہب سمٹ سمٹا کر صرف شخصی زندگی تک محدود ہو گیا۔ لیکن آخر شخصی زندگی بھی کسی نہ کسی حد تک تو اجتماعی زندگی ہی کا پرتو ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ یورپ میں انسانوں کی عملی زندگی میں مذہب کا وجود اور عدم وجود یکساں ہو کر رہ گئے، جب عمومی زندگی اخلاقی ضابطوں سے آزاد ہو گئی اور فرد قومی اخلاق کے شکنجے میں کسا گیا تو نتیجہ یہ نکلا کہ ایک قوم دوسری قوم کے ساتھ معاملہ کرنے میں کسی ایسے اصول اور قواعد کی پابند نہ رہی، جو دونوں میں مشترک ہوتے اور دونوں اسے احترام کی نظروں سے دیکھتے۔ مذہبی نزاع کو مٹانے کا یہ طریقہ لابدی طور پر مذہب کو سرے سے ختم کرنے کا سبب بنتا ہے۔ اور مذہب کو انسانوں کی زندگی سے ناپید کرنا ان کی مشکلات کو کم نہیں کرتا۔ بلکہ ان مشکلات میں اور اضافہ کرتا ہے کیونکہ ایک فرد پر تو وہ جماعت جس میں وہ رہتا ہے، دار و گیر کر سکتی ہے اور جماعت پر کل قوم کے اخلاقی ضابطے اثر انداز ہو سکتے ہیں، لیکن قوموں کو آپس کے معاملات میں کسی اصول کا پابند بنانے کے لیے ایسے اخلاقی ضابطوں کی ضرورت پڑتی ہے جو سب قوموں میں مشترک ہوں۔ سب قومیں ان کی صداقت کو تسلیم کرتی ہوں اور سب کا ان پر اتفاق ہو سکتا ہوں۔

اہل یورپ نے رعایا کے مذہبی جھگڑوں کو ختم کرنے کے لیے سیاست کا رشتہ مذہب سے بالکل قطع کر دیا ان کے برعکس اکبر نے ان نزاعات کو سلجھانے کے لیے مذہب کا انکار نہیں کیا، بلکہ انہی اپنی سیاست کی بنیاد مذہب پر رکھنے کی کوشش کی۔ لیکن یہ مذہب کسی ایک گروہ، جماعت یا قوم کا مذہب نہ تھا بلکہ اس کے نزدیک یہ مذہب تھا اپنے وسیع ترین معنوں میں اور اپنی عمومی حیثیت کے اعتبار سے۔ اس مذہب سے مراد انسانیت کے وہ اخلاقی اصول تھے جو سب مذاہب میں موجود ہیں اور اس کی بنیاد یہ خیال تھا کہ ہر قوم کو ایک ہی سرچشمہ ہدایت سے وقتاً فوقتاً خدا کا پیغام ملتا رہا ہے۔ گو مورور زمانہ کی وجہ سے بعد میں لوگوں نے اس پیغام کی شکلیں مسخ کر دی ہیں۔ لیکن پھر بھی ان میں اصل کا پتہ مل سکتا ہے۔ یہ ہے اکبر کے دین الہی کا تصور اور اسی کو اکبر نے سلطنت کا مذہب بنانے کی کوشش کی۔

ممکن ہے اس سے کسی کو یہ غلط فہمی ہو کہ ہمارے نزدیک مذہبی حکومت مذموم ہے اور اس کے مقابلہ میں دنیاوی حکومت کو ہم بہتر سمجھتے ہیں، دراصل یہاں (Religious Government) مذہبی حکومت اور (SECULAR) دنیاوی حکومت کا مقابلہ یا ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا مقصود نہ تھا۔ مذہب میں جب تک کہ انقلاب کی روح باقی رہتی ہے، اس کی بنیادوں پر جو بھی حکومت بنے وہ بہترین حکومت ہوتی ہے۔ اس قسم کی مذہبی حکومت کے ارکان اور

لازم نہیں لانا، بلکہ اس سے اسلام کی حقانیت اور اجاگر ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ شیخ اکبر ابن عربی جو مسلمانوں میں اس فکر کے بانی اور مبلغ ہیں، ان کی اپنی زندگی، اتباع حدیث کا نمونہ تھی۔ چنانچہ وہ خود فرماتے ہیں کہ ہر حقیقت جو خلاف شریعت ہو گمراہی ہے۔

یہ ہے عقیدہ وحدت الوجود کی اصل حقیقت جس پر اکبر کے نئے رجحان فکر کی، جسے دین الہی کا نام دیا گیا، بنا پڑی اس ضمن میں اکبر نے جو سیاسی مسلک اختیار کیا، وہ بھی کچھ تشریح چاہتا ہے۔ بات یہ ہے کہ اکبر سے پہلے ہندوستان میں جہاں تک اصول کا تعلق ہے مسلمانوں کی بحیثیت ایک مذہبی گروہ کے حکومت تھی جو شخص بھی مسلمان ہوتا قانوناً اس مذہبی حکومت کا رکن سمجھا جاتا۔ غیر مسلم کی حیثیت اس میں ذمی کی ہوتی۔ یعنی وہ جزیہ دے کر اس حکومت میں رہ سکتا تھا، بے شک انصاف پسند بادشاہ رعیت کے ہر فرد سے برابر انصاف کرتے تھے لیکن جہاں تک نظام حکومت کا تعلق تھا وہ مذہبی تھا اور غیر مسلم اس میں ثانوی حیثیت رکھتے تھے۔ اکبر کی کوشش یہ تھی کہ وہ اس مذہبی حکومت کو دنیوی حکومت میں تبدیل کر دے، دوسرے لفظوں میں اکبر نے یعنی ایک خاص مذہبی گروہ کی حکومت کے بجائے ریاست کو ملک میں تمام بسنے والوں کی نمائندہ اور ترجمان بنانے کے تصور کو جس پر یورپ میں انقلاب فرانس کے بعد عمل ہوا اور اسلامی ملکوں میں آج اس کو دستوری حیثیت دی جا رہی ہے۔ سولہویں صدی کے وسط میں ہندوستان میں نافذ کیا۔

اکبر کا یہ اقدام برا تھا یا اچھا۔ اس کا اندازہ آپ اس زمانے کے حالات سے لگائیے۔ اکبر کے ہم عصر عثمانی سلاطین کا ذکر ہے کہ ان کی ایران کے حکمرانوں سے سخت خون ریز جنگیں ہوتی رہتیں، اتفاق سے عثمانی ترک سنی تھے اور ایران کی حکومت کا مذہب شیعہ تھا۔ چنانچہ ترکی اور ایران کی جنگ سنی اور شیعہ کی جنگ بن گئی۔ اور اس سے مسلمانوں کے ان دونوں فرقوں میں اتنی منافرت پیدا ہو گئی کہ ایک دفعہ سلطان سلیم عثمانی نے اپنی رعایا کے ایک بہت بڑے گروہ کو جس کی تعداد کئی ہزار تک پہنچی تھی، محض اس بنا پر قتل کرادیا کہ وہ شیعہ تھے اور سنی حکومت ان پر اعتماد نہ کر سکتی تھی۔ صفوی شیعہ فرماں رواؤں نے بھی سرزمین ایران کو سنیوں سے پاک کرنے میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی۔ اسی طرح اس زمانے میں یورپ کے کسی ملک میں اگر حکمران کیتھولک فرقے کا ہوتا تو پروٹسٹنٹ کی شامت آجاتی اور اگر کہیں پروٹسٹنٹ برسر اقتدار آجاتے تو کیتھولک پر بے پناہ مظالم توڑے جاتے۔ الغرض اس وقت یورپ میں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ، مشرق وسطیٰ میں شیعہ، سنی اور ادھر ہندوستان میں شیعہ سنی کے علاوہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا جھگڑا تھا۔ اکبر یہ چاہتا تھا کہ ملک کی سب رعایا بلا تمیز مذہب و ملت حکومت کو اپنا سمجھے اور ایک گروہ دوسرے مذہبی گروہ پر جبر و استبداد نہ کر سکے اور نہ مذہب کی بنا پر ان پر اپنی حاکمیت و برتری جتلائے۔

کارکنوں کی زندگیوں میں چونکہ نئے مذہب نے ایک انقلابی روح پھونکی ہوتی ہے اس سے وہ اس روح کو عام کرنے اور اسے دوسروں تک پہنچانے میں غیر معمولی جوش و خروش سے سرگرم کار رہتے ہیں۔ ان کا نصب العین حکومت نہیں ہوتی، بلکہ وہ اسے محض "اعلائے کلمۃ الحق" کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اس طرح کی حکومتیں ہر انقلاب کے بعد معرض وجود میں آتی ہیں، گو ان کی عمر زیادہ نہیں ہوتی لیکن ان کا اثر بعد میں صدیوں تک اپنا کام کرتا رہتا ہے۔ ان حکومتوں کو مذہبی حکومتیں کہہ لیجئے یا انہیں انقلابی حکومتوں کا نام دیجیے۔ بہر حال ان کے اچھا ہونے سے کون سا صحیح العقل انسان ہوگا جو انکار کرے، لیکن جب مذہب کسی ایک جماعت یا مخصوص قوم کا اجتماعی دین بن جائے اور اس میں خود کو بدلنے اور دوسرے کو تبدیل کرنے کا جنون یا انقلابی جذبہ سر د پڑ جائے اس وقت اس مذہب کے ہاتھ میں زمام اقتدار دے دینا دراصل قوم کے رجعت پسند طبقہ کو حکومت سونپ دینا ہوتا ہے۔ اور رجعت پسند طبقہ کی حکومت اور پھر جب وہ مذہب کا نام لیا بھی ہو! خدا اس کے شر سے ہر قوم کو مامون رکھے۔

جب مذہب اس طرح سے رجعت کا پشتیبان بن جائے اور ترقی دشمن طبقے اس مذہب کی پناہ ڈھونڈیں، رجعت مذہب محض رسوم کا نام ہو اور اس میں ولولہ انقلاب ناپید ہو جائے۔ اس وقت مذہب کا نام لے کر تو سن اقتدار پر ہاتھ ڈالنے والے اکثر رجعت پسند افراد ہوتے ہیں۔ ممکن ہے وہ زبان سے بڑے ترقی پسند بنیں، لیکن ان کا عمل عموماً ترقی کے خلاف جاتا ہے، چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ ترکی میں، مصر میں، ایران میں اور مراکش میں جن لوگوں نے ان آخری سالوں میں مذہب کے نام سے اپنی اپنی قوموں کو کارا، وہ آخر میں اپنی قوموں کی آزادی اور ترقی کے دشمن ثابت ہوئے اور جمہور نے یا تو انہیں بچ و بن سے اکھاڑ کر ارض وطن سے باہر پھینک دیا۔ یا انہیں اس قابل نہ چھوڑا کہ کوئی ان کی طرف دیکھے یا ان کی بات سنے۔

اکبر کے دین الہی کا یہ اساسی فکر تھا۔ جہاں تک اصل فکر کا تعلق ہے، اکبر کے مشیروں کی اصابت رائے پر شک کرنا صریحاً نا انصافی ہوگی۔ ہندوستان ایسے براعظم میں جہاں اتنی مختلف قومیں اور اتنے مختلف مذاہب ہیں اور پھر ملک اتنا وسیع اور قوموں کی آبادی اس قدر زیادہ ہے کہ نہ ایک قوم دوسری قوم کو اپنے اندر ہضم کر سکتی ہے اور نہ اس کا فنا کرنا اس کے لیے ممکن ہے۔ اس براعظم میں اگر کوئی حکومت خدا کی اتنی مخلوق کو اپنے قابو میں رکھ سکتی ہے تو یا تو وہ انگریزوں کی طرح کوئی ایسی حکومت ہو سکتی ہے جو کسی مذہب کو بھی قابل التفات نہ سمجھے اور سیاست کو صرف اپنے مخصوص مفاد کا تابع بنائے اور یا پھر اکبر جیسی حکومت ہو، جو سب مذاہب کی اصل کو ایک جانے اور ہر قوم کو اجازت دے کہ وہ اپنی اپنی شریعت کے مطابق زندگی بسر کریں۔ لیکن مذہب کی صحیح روح سے منحرف نہ ہوں۔

اکبر کے زمانے میں ہندوستان کی اسلامی حکومت جس ارتقائی دور میں پہنچ چکی تھی، اس وقت ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک مشترک فکر کے تابع کر کے ان میں سیاسی وحدت پیدا کرنا حالات کا طبعی تقاضا تھا۔ لیکن اگر اس مشترک فکر کو سلیقہ سے خیال سے عمل کی دنیا میں لایا جاتا تو نہ اتنی بدعنوانیاں پیدا ہوتیں نہ اسلام کی برتری پر کوئی حرف آتا اور نہ مسلمانوں کے حکمران طبقے بدظن ہوتے۔ لیکن بد قسمتی یہ تھی کہ اس فکر کی داغ بیل دربار شاہی میں پڑی، اس لیے اول روز سے اس میں خرابیاں پیدا ہو گئیں۔ اس کے کئی ایک اسباب تھے۔ سب سے بڑا سبب تو یہ تھا کہ چونکہ بادشاہ اس نئے فکر کا داعی تھا اس لیے منفعت طلبوں کو موقع مل گیا اور خلوص کے بجائے محض دنیوی اعزاز کے لیے لوگ ہاں میں ہاں ملانے لگے۔ اس خلفشار کا ایک سبب اور تھا۔ دین الہی کے بانیوں نے مختلف مذاہب میں وحدت فکر تو ڈھونڈ لی، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ضروری تھا کہ ہر مذہب زندگی گزارنے کے لیے جو ضابطے مقرر کرتا ہے ان کی حیثیت اور ضرورت کو بھی سمجھا جاتا۔ بے شک وحدت ادیان اپنی جگہ پر ٹھیک ہے لیکن ہر دین کی شریعت کے قاعدوں اور قوانین کی پابندی کے بغیر جماعتی زندگی بھی تو قائم نہیں رہ سکتی۔

الغرض دین الہی کے داعیوں نے "شرع و منہاج" کی اہمیت کو صحیح طور پر محسوس نہ کیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ارباب فکر پر تو یہ حقیقت عیاں ہو، لیکن عام پیروؤں نے اخلاقی ضابطوں سے بچنے کے لیے شریعت سے عمداً بے پروائی برتی ہو۔ بہر حال وجہ کوئی ہو، اکبر کے دین الہی کو اس ذہنی انتشار سے بڑا گزند پہنچا۔ اکبر اور اس کے درباریوں کے متعلق یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ وہ علی الاعلان شریعت کا مضحکہ اڑاتے تھے۔ قیاس غالب یہ ہے کہ اس فکر کے ممتاز افراد مذہب کی تضحیک اور اس سے استہزاء روانہ رکھتے ہوں گے۔ چنانچہ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ کسی نئی تحریک کے دوسرے درجے کے داعی ہی پہلی تحریکوں کا مذاق اڑانے میں پیش پیش رہتے ہیں۔ مثلاً اشتراکیت کے بڑے رہنما مذہب کے خلاف اس طرح کی بے سرو پا باتیں نہیں کرتے جس طرح عام پروپیگنڈا کرنے والے کیا کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ اس قسم کی فضا اکبر کے دربار شاہی میں پیدا ہو گئی ہو، نیز مذہبی طبقوں کی طرف سے جتنی مخالفت بڑھتی گئی ہوگی۔ اسی نسبت سے نئی تحریک کے کارکن بھی تضحیک اور استہزاء پر اتر آئے ہوں گے۔

دراصل ضرورت اس وقت اس امر کی تھی کہ وحدت ادیان کے ساتھ ساتھ یہ حقیقت بھی ملحوظ رہتی کہ سارے مذاہب کے بنیادی اصول تو ایک ہو سکتے ہیں لیکن ہر مذہب کی اپنی ایک ظاہری شکل ہوتی ہے جو احکام اور قوانین کی شکل میں ہمارے سامنے آتی ہے اور ہر قوم کے افراد ان کے پابند رہ کر ہی اپنی زندگی کو مفید اور باکار بنا سکتے ہیں۔ قرآن کی زبان میں یوں کہہ لیجئے کہ ساری دنیا کا دین تو ایک ہی ہے لیکن اس کی شریعتیں الگ الگ ہیں، اگر وحدت ادیان سے یہ سمجھ لیا جائے کہ ان ادیان کی مختلف

شریعتیں بے کار محض ہیں تو اس سے زندگی بے ضابطہ ہو جاتی ہے اور کوئی انسانی جمعیت بن نہیں سکتی اور اس طرح شریعتوں کا انکار آگے چل کر اصل دین کا انکار ہو جاتا ہے۔ چنانچہ شریعت اور اصل دین یعنی حکمت کے اس فرق کو ملحوظ نہ رکھنے سے اکبری عہد میں ساری ابتری پھیلی۔ چاہئے تو یہ تھا کہ ادیان کی وحدت کا فکر بھی موجود رہتا اور مختلف مذاہب کے قوانین کی علیحدہ حیثیت کو بھی برقرار رکھا جاتا۔ ہندوؤں کے لیے ان کا قانون نافذ ہوتا اور مسلمان اپنی شریعت پر چلتے۔ دین الہی کے اس اضطراب فکری نے نہ ہندوؤں کو اپنی طرف کھینچا اور نہ مسلمان ادھر مائل ہوئے اور مسلمان کے حکمران طبقے تو اس سے اور بھی بدک گئے اور ان میں رد عمل کے طور پر ایک اور فعال تحریک پیدا ہوئی جس کی قیادت امام ربانی نے فرمائی، لیکن اس تحریک کو سمجھنے کے لیے کچھ تفصیل کی ضرورت ہے۔

جیسا کہ ہم پہلے بیان کر آئے ہیں، اس وقت ہندوستانی مسلمانوں کے دو گروہ تھے، ایک ملکی اور دوسرا غیر ملکی۔ شیر شاہ نے ملکوں کی مدد سے غیر ملکی مغلوں کو شکست دی تھی۔ ہمایوں نے پھر غیر ملکیوں کی امداد سے دہلی کی سلطنت پر قبضہ کر لیا۔ اکبر نے اپنی حکومت کی جڑیں مضبوط کرنے کے لیے راجپوتوں سے معاملہ کیا اور اس طرح مغلوں کے تخت و تاج کے لیے نئے محافظ پیدا ہو گئے۔ جب دین الہی کا چرچا ہوا تو خاص طور پر غیر ملکی اور جوان کے ہم خیال ملکی مسلمان تھے، انہوں نے محسوس کیا کہ سلطنت میں ہندو تو برابر کے شریک تھے ہی اب تو ان کی مذہبی برتری جو انہیں ہندوؤں پر حاصل تھی وہ بھی خطرے میں ہے۔ اس خیال نے غیر ملکی حکمران طبقوں کو چونکا کر دیا اور ان کے دماغوں میں ایک عام ہلچل پیدا ہو گئی۔

غیر ملکی حکمران طبقوں کا سیاسی اور فکری مرکز بخارا تھا۔ بخارا کی فقہ، بخارا کا علم کلام اور بخارا کے علماء کی کتابیں ہندوستان میں آئیں اور یہی مدرسوں کا نصاب بنا۔ علم و فقہ کی طرح بخارا سے حکمرانوں کے گروہ بھی آتے رہتے تھے۔ اکبر کے عہد تک یہ ہوتا رہا کہ جب کبھی ہندوستان میں مسلمانوں کی قوت کمزور پڑتی تو اس نواح سے تازہ دم مسلمان آجاتے اور اسلامی حکومت کے لیے یہ لوگ تقویت کا باعث بنتے۔ اکبر نے جب ہندوؤں کو مراعات دیں اور ایک حد تک مذہب میں ان کا مساوی درجہ ماننے کی بھی جرات کی تو ان غیر ملکی اور ان کے ہم خیال مسلمانوں میں بڑی بے چینی پھیلی۔ دوسری بات یہ ہوئی کہ اکبری سیاست کو چلانے میں شیعوں کا بھی بڑا ہاتھ تھا۔ بخارا چونکہ سنیوں کا مرکز تھا اور یہ لوگ شیعیت کی مخالفت میں بڑے سرگرم بھی تھے۔ یہاں تک کہ بخارا میں تصوف کا جو نقشبندی طریقہ رائج تھا اس میں بھی شیعوں کے خلاف کافی رجحان موجود ہے۔ شیعہ سمجھتے تھے کہ وہ اکبری سیاست کی تائید کر کے دربار سے بخاری اور سنی اثر کو کم کر سکیں گے، چنانچہ جب اکبر کے خلاف رد عمل ہوا تو شیعوں

اور ہندوؤں دونوں پر عتاب آیا اور سنی حکمران طبقے دونوں کے مخالف ہو گئے۔ ہندو تو سیاسی اقتدار میں ان کے مد مقابل بن رہے تھے، اس لیے ان سے یہ لوگ ناراض تھے اور شیعوں سے بخارا کے ترکمانوں کی پرانی چشمک تھی۔ اسلام سے پہلے بھی ایران اور توران کی آویزش پھیلی، اسلام لانے کے بعد اس دور میں شیعہ اور سنی کے نام سے یہ ایک دوسرے کے خلاف ہو گئے، الغرض ترکمانی اور ایرانی یا اسے آپ سنی اور شیعہ کہہ لیجئے کشمکش ایک طرف اور ہندو اور مسلم طبقوں کی رقابت دوسری طرف۔ یہ حریف طاقتیں تھیں جن کو اکبر نے قابو میں رکھنے کی کوشش کی تھی۔ وہ اس میں بہت حد تک کامیاب رہا، جہانگیر اور شاہ جہان کے عہد میں بھی یہ توازن ایک حد تک قائم رہ سکا۔ لیکن اورنگزیب عالمگیر کے زمانے میں تورانیوں کا پلہ بھاری ہو گیا اور شیعہ اور ہندو دونوں عالمگیری سیاست سے برگشتہ خاطر ہو گئے۔

سیاسی مسلک کے اعتبار سے اکبر کا نقش ثانی تھا۔ وہ اگر برسرِ اقتدار آجاتا تو اکبر کی سیاست اس کے لیے شمعِ ہدایت بنتی۔ اس کے برعکس اور نگزیب کو ان طبقوں کی مدد حاصل تھی، جو اکبر کی سیاست کے مخالف تھے اور کاروبار سلطنت میں مسلمانوں کی دینی برتری چاہتے تھے۔

اکبری سیاست جیسا کہ تفصیل سے بیان کیا جا چکا ہے، ایک دینی فکر کا نتیجہ تھی، جس کی اساس وحدت الوجود کا عقیدہ تھا۔ اکبری سیاست کے مخالفوں کو وحدت الوجود کے بجائے وحدۃ الشہود کا عقیدہ مل گیا۔ جہانگیر کے زمانے میں امام ربانی نے ابن عربی کے عقیدہ وحدت الوجود کی تردید کی اور اس پر جس سیاست کی بنا پڑی تھی، اسے غلط ٹھہرایا۔ امام ربانی کے مکتوبات سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطنت کے بڑے بڑے باقتدار سرداروں سے ان کی خط و کتاب رہتی تھی اور یوں بھی مسلمانوں کے حکمران طبقوں کا ان کی طرف مائل ہونا ایک طبعی امر تھا۔ اس سے ان کی سیاسی برتری قائم رہتی وہ دوسروں سے اعلیٰ و افضل ٹھہرتے اور ان کی مذہبی تسکین بھی ہوتی، چنانچہ عالمگیر کی کامیابی اصل میں ان طبقوں کی کامیابی تھی اور لازمی طور پر اس کی سیاست پر بھی ان طبقوں کا اثر پڑا۔

اور نگزیب خود نفس نفیس امام ربانی کے صاحب زادہ کا مرید تھا اور ظاہر ہے اس کی یہ دلی خواہش ہوگی کہ وہ امام ربانی کے طریقہ پر اپنی سلطنت چلائے۔ امام ربانی کا ایک منصب تو یہ تھا کہ وہ اکبر کی بدعنوانیوں کی اصلاح کرنا چاہتے تھے، لیکن ان کا ایک منصب اور بھی تھا اور وہ اسلام کی تجدید تھی۔ امام ربانی ملت اسلامیہ کے مجدد ہونے کے مدعی تھے۔ اور ان کی اس تجدید دین کا دائرہ صرف ہندوستان تک محدود نہ تھا اور پھر اس وقت تو وطن کا محدود مفہوم بھی نہ تھا۔ الغرض امام ربانی کل عالم اسلام کے مجدد تھے اس لیے ہندوستان سے باہر دوسرے ملکوں میں بھی ان کے تجدیدی پیغام کو پہنچانا ضروری تھا اور یہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ حکومت کارنگ اسلامی ہوتا۔

جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں، اس زمانے میں ہندوستان آج کی طرح افغانستان، ترکستان اور ایران وغیرہ سے بے تعلق نہ تھا، اس وقت ہندوستان پر ان ملکوں سے آنے والوں کی حکومت تھی۔ چنانچہ اگر کبھی بخارا، سمرقند، بدخشاں اور ایران میں کوئی گڑ بڑ ہوتی تو اس کا اثر ہندوستان پر بھی پڑتا اور اگر یہاں کے حالات بدلتے تو لامحالہ ان سے یہ ملک متاثر ہوتے۔ شروع شروع میں تو سیاسی قوت کا اصل مرکز خیبر سے اس طرف رہا۔ اس نواح میں غزنویوں کا دور دورہ ہوا، تو ہندوستان کو انہوں نے اپنا میدان کارزار بنایا، غزنویوں کو غوریوں نے شکست دی تو وہ لاہور کے مالک بنے اور آگے بڑھ کر دہلی پر بھی قابض ہو گئے۔

قطب الدین ایبک نے شہاب الدین غوری کے نائب السلطنت کی حیثیت سے ہندوستان

اورنگ زیب عالمگیر

اکبر نے غیر ملکی اور ملکی مسلمانوں اور ہندو راجپوتوں کو ایک فکری اور سیاسی وحدت میں سمونے کی کوشش کی۔ ہندوستان کی اسلامی سیاست میں اکبر کی یہ روش نئی تھی، چنانچہ مسلمانوں کے حکمران طبقوں کو طبعاً یہ بدعت ناگوار گزری اور اس کے خلاف بڑی شورشیں ہوئیں۔ جہانگیر کا زمانہ آیا تو حضرت مجدد الف ثانی نے اکبری عہد کی بعض بدعنوانیوں کی اصلاح کے لیے جدوجہد شروع کی۔ ابتداء میں جہانگیر نے آپ کو گوالیار کے قلعہ میں قید کر دیا، لیکن بعد میں آپ رہا کر دیئے گئے اور جہانگیر نے اپنے باپ کی بعض بدعات سے توبہ بھی کر لی۔ شاہجان کا زمانہ اعتدال کا زمانہ ہے۔ اس عہد میں اکبری افراط اپنے صحیح مقام پر آگئی اور ہندوستانی اسلامی تہذیب کو اپنے نقطہ عروج پر پہنچنے کا پورا موقع ملا۔

اکبر غیر ملکی مسلمانوں کی مدد سے ہندوستان کے تخت کا مالک بنا تھا۔ لیکن بعد میں اس نے اپنے تخت کے استحکام اور غیر ملکیوں کے پلڑے کو برابر رکھنے کے لیے ہندو راجپوتوں کو اپنے ارد گرد جمع کر لیا۔ چنانچہ اس طرح سے دربار میں یہ دو بڑے سیاسی گروہ پیدا ہو گئے اور اکبر کے زمانہ سے ہی ان میں آپس میں کشمکش رہنے لگی۔ اکبر کی جانشینی کے متعلق جہانگیر اور اس کے بیٹے خسرو کا جھگڑا اور اصل میں ان دھڑے بندیوں کا نتیجہ تھا۔ خسرو اگر کامیاب ہوتا تو لازمی طور پر اس کے ننھیال راجپوت سلطنت میں

زیادہ دخل ہو جاتے، لیکن جہانگیر اور اس کے بعد شاہجہان نے اپنے اپنے زمانے میں سلطنت کے مختلف سیاسی گروہوں کا توازن بگڑنے نہیں دیا۔ آخری عمر میں شاہجہان بیمار پڑا اور شہزادوں میں خانہ جنگی شروع ہو گئی تو پھر وہی پرانی کشمکش عود کر آئی۔ داراشکوہ اپنے فکری رجحانات اور

جن امراء کی مدد سے جہانگیر باپ کا جانشین بننے میں کامیاب ہوا۔ ان میں سب سے پیش پیش نواب مرتضیٰ خان تھے۔ موصوف بخاری سید تھے، اکبری عہد میں ان کا اثر و رسوخ بہت بڑھ گیا تھا۔ انہوں نے جہانگیر سے پاس شریعت کا عہد لیا تھا۔ نواب مرتضیٰ خان حضرت خواجہ باقی باللہ کے جو حضرت مجدد الف ثانی کے مرشد تھے، بڑے معتقد تھے۔ حضرت مجدد الف ثانی کے بہت سے مکتوبات ان کے نام ہیں۔

میں حکومت شروع کی تھی۔ لیکن اتفاق سے تاتاریوں کی وجہ سے وسط ایشیا کے سیاسی مرکز کمزور ہو گئے اور ادھر ہندوستان میں آتش، بلبلیں اور علاؤ الدین ایبے بیدار مغز اور زبردست حکمران برسرِ اقتدار ہوئے جن کی بدولت ہندوستان کی اسلامی سلطنت کو بڑا استحکام مل گیا۔ محمد تغلق اور فیروز تغلق تک یہ سلسلہ جاری رہا، لیکن پھر یہاں ابتری پھیلی اور ادھر وسط ایشیا میں ایک نئی قوت پیدا ہو گئی۔ چنانچہ تیمور آندھی کی طرح آیا اور دہلی کو تہ و بالا کر کے واپس چلا گیا۔ تیمور کے بعد بابر نے بخارا اور سمرقند سے دہلی کا رخ کیا اور وہ اور اس کی اولاد یہیں بس گئی۔

اکبر نے سمرقند اور کابل کے سیاسی اور ایران اور قاہرہ کے دینی اثر سے بالکل آزاد ہو کر آگرہ اور دہلی کو ہندوستان کا سیاسی مرکز بنایا۔ اس لیے اسے ہندوستان کے اندرونی مسائل سے زیادہ الجھنا پڑا اور ایران اور توران کے بجائے راجپوتوں کے ساتھ تعلقات بڑھانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اکبر کی حکومت حقیقت میں ہندوستانی اسلامی حکومت تھی۔ اس کے سیاسی مسلک میں ہندوستانی کو اسلامیت پر ترجیح دی گئی تھی کیونکہ ابتدائے کار میں اسلامی حکومت کو ہندوستانی بنانے کے لیے لابدی طور پر ہندوستانی پر زیادہ زور دینا چاہئے تھا۔ پہلے طریقے کے بجائے جب کوئی نیا طریقہ جاری کیا جاتا ہے تو نئے طریقے کو نافذ کرنے کے لیے ایک حد تک انتہا پسندی سے کام لینا پڑتا ہے۔ اگر روز اول سے ہی اعتدال کا دامن پکڑا جائے، تو قدیم رجحانات آسانی سے پھر غالب آجاتے ہیں، کیونکہ انسان بالطبع ماضی پرست ہے اور وہ بڑی مشکل سے اپنے آپ کو بدلنے پر راضی ہوتا ہے۔ چنانچہ اکثر نئے دور کے بانی معتدل مزاج کے نہیں ہوتے، بلکہ ان کا رجحان کچھ نہ کچھ انتہا پسندانہ ہوتا ہے۔ لیکن ان کے بعد جو لوگ آتے ہیں، ان کے زمانے میں افراط و تفریط سمٹ سمٹا کر ایک راہ پر آجاتے ہیں۔

لیکن اس سے کسی کو یہ گمان نہ گزرے کہ اکبر کی ہندوستانی اسلامی حکومت کی تمام تر توجہ کابل اور ہرات کی سرحدوں سے ہمیشہ اس طرف رہی۔ اکبر کی نظریں ایک طرف اگر دکن، بہار اور بنگال کی طرف رہتی تھی تو دوسری طرف وہ سمرقند، بخارا، بدخشاں اور ایران پر بھی نگاہ رکھتا تھا اور حجاز کے معاملات سے بھی اسے غیر معمولی دلچسپی تھی۔ حجاز تو مغلوں کا انڈمان تھا جس سیاسی مجرم کو وہ گوالیار کے قلعے میں قید کرنا مناسب نہ سمجھتے اسے وہ مکہ و مدینہ بھیج دیتے۔ یہ سب کچھ صحیح تھا لیکن اس کے باوجود اکبر کو اپنی زندگی میں ہندوستانی مہوں کو سر کرنے میں زیادہ توجہ کرنی پڑی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اکبر کی سیاست میں ایک حد تک ہندوستانی کارنگ غالب پاتے ہیں۔

اکبر نے جس سلطنت کی بنیاد ڈالی تھی۔ جہانگیر اور شاہجہان کے زمانے میں وہ اپنے عروج کو پہنچ گئی۔ اب اس ہندوستانی اسلامی سلطنت کے سامنے دوراں کھلی تھیں۔ یا تو یہ ہندوستانی میں اور

آگے بڑھتی اور غیر مسلم عناصر کو مسلمانوں سے اور مسلمانوں کو غیر مسلم گروہوں سے قریب کر کے قومی رنگ کو اور گہرا کرتی۔ یا وہ طبقے جو اکبر کی ہندوستانی سے ناراض تھے اور جہانگیر اور شاہجہان کے عہد میں اندر ہی اندر زور پکڑ رہے تھے، وہ سلطنت کی زمام اقتدار کو ہاتھ میں لیتے اور ہندوستان کی سلطنت کو اسلامی بین الاقوامیت کا مرکز بنا کر خیبر کے اس طرف کے ملکوں کو اپنے اثر میں لانے کی کوشش کرتے۔

قدرت کے کارخانے میں سکون محال ہے۔ اسی طرح سلطنتیں بھی کسی مقام پر جا کر رک جائیں اور وہ آگے بڑھنے کا خیال نہ کریں، تو یہ سلطنتوں کی موت ہوتی ہے۔ ایک فرد جب اپنی تکمیل کر لیتا ہے تو وہ دوسرے فرد کو اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کرتا ہے اسی طرح ایک ترقی یافتہ جماعت دوسری جماعت کو اپنے حلقہ اثر میں لانے میں کوشاں ہوتی ہے۔ چنانچہ قومی حکومت بھی ایک منزل پر جا کر مجبور ہو جاتی ہے کہ وہ دوسری قوموں کے مقابلوں میں آئے۔ ان کو اپنے فکر میں رنگے اور ان پر اپنا سیاسی اخلاقی یا کلچرل اقتدار جمائے۔ کسی جغرافیائی حدود میں کوئی قوم محدود ہو کر نہیں رہ سکتی، کبھی نہ کبھی اسے اس چار دیواری سے نکل کر قوموں کو بڑی برادری میں شامل ہونے کی تگ و دو کرنی پڑتی ہے۔

شاہجہان کے زمانے میں ہندوستان کی حکومت اس منزل پر پہنچ گئی تھی۔ اگر اس وقت ہندی گروہ غالب آجاتا اور داراشکوہ تخت پر بیٹھتا تو شاید ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک قوم بنانے کا عمل اور تیز کر دیا جاتا۔ معلوم نہیں اس سے اسلام کو ناقابل تلافی نقصان پہنچتا۔ یا ممکن ہے اس وقت دونوں قوموں کا ملنا بچھیت مجموعی مسلمانوں کے لیے مفید ہوتا۔ بہر حال یہ محض مفروضات ہیں اور ان پر رائے زنی کرنا لا حاصل ہے۔ البتہ جہاں تک اصل واقعہ کا تعلق ہے، ہو یا یہ کہ سلطنت کا دوسرا گروہ جو مسلمانوں کی قومی برتری کا علمبردار تھا، وہ کامیاب ہوا اور ہندوستان کی حکومت کو ہندوستانی سے زیادہ اسلامی بنانے پر توجہ دی جانے لگی۔

حقیقت میں بات یہ تھی کہ اس وقت ہندوستان کی زمین مغلوں کے لیے تنگ ہو چلی تھی، چنانچہ ان کی نظریں برابر باہر اٹھتی تھیں۔ بحری راستوں سے یہ لوگ بے پروا تھے اور طبعاً ان کا رجحان اپنے آبائی ملکوں کی طرف زیادہ تھا۔ نیز ان کی خواہش تھی کہ وہ حجاز کو بھی اپنے اثر میں لے لیں اور اس طرح دہلی قسطنطنیہ کا مقابل بن جائے۔ عالمگیر کا زمانہ آیا اور مسلم عناصر کو اپنے حریفوں پر کئی غلبہ نصیب ہوا، تو پھر ان ارادوں کو عمل میں لانے کی طرف قدم بڑھایا گیا۔ اس میں مذہب نے ان کی رہنمائی کی اور امام ربانی کی دعوت تجدید اور انگلیب عالمگیر کی اسلامی حکومت ہندوستان کی اس بین الاقوامی تحریک کے مدد و معاون بنے۔

اکبر نے جب دین الہی کو رواج دینے کی کوشش کی تھی تو ہندوستان کے مسلمانوں کے علاوہ

خیبر پار کے اسلامی ملکوں میں بھی اس کے خلاف نفرت اور ناراضگی کا جذبہ پھیل گیا تھا اور لوگوں نے یہ مشہور کر دیا تھا کہ اکبر بے دین ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ حجاز میں بھی اس پر کفر کے فتوے لگے تھے۔ اندرون ملک مسلمان طبقوں کی مخالفت ایک طرف اور بیرون ہند کے مسلمانوں میں اکبر سے بیزاری دوسری طرف۔ ان حالات میں کچھ بعید نہ تھا کہ اکبر کو تاج و تخت سے ہاتھ دھونے پڑتے۔ گواکبر کی اس روش کے خلاف بغاوتیں بھی ہوئیں اور باہر سے بھی حملہ کی کوشش کی گئی پر اس نے حالات پر قابو پا لیا۔ لیکن اس کے باوجود پھر بھی وہ مجبور ہو گیا کہ وہ مسلمانوں کے سامنے اپنی صفائی پیش کرے اور ان کو یہ یقین دلائے کہ اس نے خدا نخواستہ اسلام کی کوئی بے حرمتی نہیں کی۔ دراصل اس زمانے میں کوئی بادشاہ خواہ وہ اکبر اعظم ہی کیوں نہ ہو مسلمانوں کو ناراض کر کے ہندوستان پر فرماں روائی نہ کر سکتا تھا۔ ہندوستان کے اندر مسلمانوں کے حکمران طبقے کافی طاقت ور تھے اور پھر بخارا اور سمرقند کے لوگ اس انتظار میں رہتے تھے کہ کوئی اشارہ ملے اور وہ ہندوستان پر بلہ بول دیں اور خاص طور پر اسلام کے نام سے کسی مہم کے لیے نکل کھڑا ہونا اس ملک میں اور اس عہد میں بڑا جاذب توجہ اور بے حد آسان تھا۔

اکبر کے برعکس عالمگیر نے اپنی سیاست کو اسلامی رنگ دیا اس نے ہندوؤں پر جزیہ لگایا۔ خلاف اسلام بدعنوانیوں کا سدباب کیا۔ اسلامی شعائر و مراسم کی پابندی پر زیادہ زور دیا۔ بادشاہ چونکہ خود بڑا متدین اور عالم تھا، چنانچہ اس کے زہد و اتقا کا شہرہ دور دور تک پہنچ گیا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ ہندوستان کے مسلمان حکمران طبقے تو خوش تھے ہی، بیرون ہند کے اسلامی ملکوں میں بھی اورنگ زیب عالمگیر کا نام ایک مسلمان بادشاہ کی حیثیت سے زبان زد عام ہو گیا اور خاص طور پر اس کے اس کارنامہ نے کہ خود اس نے اپنی نگرانی میں فتاویٰ عالمگیری ایسی مہتمم بالشان کتاب مرتب کرائی، تمام دنیائے اسلام میں اس کی دھاک بٹھادی۔

اکبر کی سلطنت ہندوستانی اسلامی سلطنت تھی اورنگ زیب چاہتا تھا کہ وہ اس ہندوستانی اسلامی سلطنت کے دائرہ اثر کو اتنی وسعت دے کہ اس کے اندر خیبر پار کے ملک بھی آجائیں اور حجاز پر بھی اس کا اثر ہو اور یہ اس وقت تک ممکن نہ تھا جب تک وہ اپنی حکومت کو اسلامی رنگ نہ دیتا اور اکبری سیاست کے بارے میں اسلامی دنیا میں جو غلط فہمیاں پیدا ہو گئی تھیں ان کو رفع نہ کرتا۔ اکبر کا سیاسی مسلک راجپوتوں کو ہموار کرنے کے لیے تھا۔ اورنگ زیب کے پیش نظر ہندوستان کے علاوہ اسلامی دنیا کی قیادت تھی اس لیے ایک کو ہندوستانی پر زیادہ زور دینا پڑا اور دوسرے نے اسلامیت کو مقدم جانا۔

یہ اسباب تھے جن کی بنا پر اورنگ زیب کو اکبری نظام کے خلاف جانا پڑا۔ اکبر کی سیاسی و مذہبی وسیع المشرقی ابن عربی کے عقیدہ وحدت الوجود سے متاثر تھی اورنگ زیب کا سیاسی فکر امام ربانی کی

تعلیمات کا پر تو تھا۔ اکبر مختلف مذاہب اور مختلف قوموں کو ہم آہنگ بنانے کا داعی تھا۔ اورنگ زیب مسلمانوں کی تنظیم کرنا چاہتا تھا اور انہیں ذہنی انتشار جماعتی پراگندگی اور اخلاقی بے راہ روی سے نکال کر اس قابل بنانے میں کوشاں تھا کہ وہ نہ صرف ہندوستان کی حکومت کو سنبھال سکیں، بلکہ بیرون ہند کے اسلامی ملکوں کو بھی اپنے اثر میں لائیں۔ اس راہ میں امام ربانی کی دعوت اس کے لیے مشعل ہدایت بنی۔ امام ربانی کے طریقہ میں شیعیت سے قدرے بعد تھا اور اکبر کی ہندو نوازی بھی انہیں گوارا نہ تھی۔ ان کے نزدیک اسلامی جماعت کے استحکام اور اس کی تنظیم میں شیعوں کی بدعات اور ہندوؤں کے اثرات دونوں سدراہ تھے اس لیے وہ ان کو بیچ سے ہٹانا ضروری سمجھتے تھے۔ امام ربانی کے ان خیالات کا اثر لامحالہ عالمگیری سیاست پر بھی پڑا اور اسی کا نتیجہ تھا کہ شیعوں اور ہندوؤں کو عالمگیر سے وہ قرب نہ رہا جو اس سے پیشتر مغل بادشاہوں کے ساتھ ان کو تھا۔

لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اورنگ زیب کی فوج میں کئی شیعہ سردار تھے اور اس طرح اس نے بہت سی مہموں میں ہندو سپہ سالاروں کو بھی فوج کی کمان دی۔ اگر اورنگ زیب کی سیاسی حکمت عملی سے شیعوں اور ہندوؤں کو شکایات ہوتیں تو بادشاہ ان کو بڑے بڑے عہدوں پر کیسے رہنے دیتا۔ دراصل بات یہ ہے کہ ایک ہوتی ہے حکومت کی پالیسی اور ایک ہوتے ہیں حکومت کے اہلکار۔ اصل مسئلہ حکومت کی پالیسی کا ہوتا ہے۔ اہلکار تو مجبور ہوتے ہیں کہ حکومت کی طرف سے جو بھی احکام انہیں ملیں وہ ان پر عمل کریں خواہ وہ دل سے انہیں اچھا بھی نہ سمجھتے ہوں، چنانچہ جو لوگ حکومت کے ساتھ ہوں اور وہ اس کے نظام کے کل پرزے بن جائیں۔ عملاً ان کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ ممکن ہے وہ دلوں میں اپنے جذبات چھپائے رکھیں اور مناسب وقت پر ان کا اظہار بھی کر دیں لیکن جہاں تک حکومت کے کاموں کو چلانے کا تعلق ہوتا ہے وہ بغیر سوچ بچار کے سب کچھ کر گزرتے ہیں، جو ان سے کرنے کو کہا جاتا ہے۔ سرکاری طبقوں کے لیے منصب کی کشش اکثر دلی رجحانات پر غالب آجاتی ہے۔ اس کا مزید ثبوت آپ کو ہندوستان کی موجودہ سیاسی حالت سے مل جائے گا۔ اس وقت چرچل اور ایری اور لٹلٹھگو کے ساتھ بہت سے ایسے ہندوستانی بھی تعاون کر رہے ہیں جو دل سے ان کی سیاست کے سخت دشمن ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ تعاون محض ذاتی اغراض پر مبنی ہو، یا ممکن ہے وہ یہ سمجھتے ہوں کہ اس تعاون سے وہ اپنی قوم کے مفاد کی نگہداشت کر رہے ہیں اور آگے چل کر کسی وقت وہ قوم کے لیے مفید کام انجام دے سکیں گے۔

الغرض اب تک تو یہ ہوتا تھا کہ خیبر پار کے ملکوں کے مسلمان طبقے سیاسی تغلب کے لیے ہندوستان کا رخ کرتے۔ وہاں کے مذہبی نظریے یہاں فروغ پاتے ان کی لکھی ہوئی کتابیں ہمارے ہاں مدرسوں کا نصاب بنیں، فکران کا سیاسی نظام ان کا، مذہبی افکار ان کے ہندوستان کا علم محض ضمیمہ تھا،

باہر کے اسلامی ملکوں کے علم کا۔ اکبر، جہانگیر اور شاہجہان کی بدولت اس ملک کو سیاسی خود اعتمادی نصیب ہوئی تو یہاں بھی مستقل اسلامی فکر کی نیو پڑی۔ چنانچہ امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی ہندوستانی اسلام کے پہلے مفکر ہیں اور دوسری طرف وہ کل دنیائے اسلام کے لیے مجدد بھی تھے، جس طرح امام غزالی اور امام ابن تیمیہ خاص اپنی قوموں کے مفکر تھے اور کل دنیا کے مسلمان بھی ان کے افکار سے فیض یاب ہو سکتے ہیں۔

یہاں سے اسلامی ہند کی بین الاقوامی قیادت کی مہم شروع ہوتی ہے اور دہلی اب بخارا اور سمرقند و ایران اور حجاز کے علمی اور سیاسی مرکزوں کو اپنے زیر نگیں کرنے کے لیے حرکت میں آتا ہے۔ ایک دفعہ اشوک کے زمانے میں ہندوستان کا دینی فکر بیرون ہند پہنچا تھا اور بدھ مت کے ہندوستانی بھکشو اپنے مذہب کی تبلیغ کے لیے ایران، توران اور مشرق قریب تک گئے تھے۔ کم و بیش اسی طرح عالمگیر کے زمانے میں ہندوستانی مسلمان اپنے طریقہ کو وسط ایشیا اور حجاز تک لے جانا چاہتا تھا۔ اکبر کے عہد تک ہندوستان کی اسلامی سلطنت کل دنیائے اسلام کا ایک حصہ تھی، یہاں کے حکمران اپنے آپ کو بغداد یا قاہرہ کے خلفاء کا مطیع و فرمانبردار سمجھتے تھے۔ اکبر نے اسلامی ہند کو ایک مستقل حیثیت دی اور اسے ایران اور روم کی فرماں برداری سے آزاد کیا۔ جہانگیر اور شاہجہان کے زمانوں میں ہندوستان کی اس اسلامی سلطنت کی بنیادیں اور محکم ہوئیں اور اورنگ زیب کا عہد آیا تو ہندوستانی مسلمان اردگرد کے اسلامی ملکوں پر اپنا دینی اور سیاسی اقتدار قائم کرنے نکل کھڑا ہوا۔ دوسرے لفظوں میں اشوک سے ہزار ہا سال کے بعد ایک بار پھر ہندوستانی اس قابل ہوئے کہ وہ دوسروں کو سیاسی اور فکری ترکتازیوں کی آماج گاہ بننے کے بجائے اپنا پیغام باہر کی دنیا کو سنائے۔ گو اشوک کے زمانے میں یہ پیغام بدھ مت کا تھا اور عالمگیر کے عہد میں یہ امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی کا پیغام تجدید اسلام تھا۔

اسے بد قسمتی کہیے یا اتفاق کہ جب ہندوستان سیاسی اور ذہنی ارتقاء کی اہل منزل پر پہنچ گیا کہ وہ ایشیائی ممالک میں بین الاقوامی سیاست کا ایک اہم مرکز بنتا، تو اس کے اندر اور باہر نئے نئے فتنے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اندرون ملک میں مرہٹوں، سکھوں، جاٹوں اور روہیلوں نے آفت مچادی اور باہر سے نادر شاہ نے چڑھائی کر دی اور سات سمندر پار سے پرتگیزی، ولندیزی، فرانسیسی اور انگریز آگے اور آخر ہمارا ملک دوسروں کا غلام ہو گیا۔

شاہ ولی اللہ

ابن عربی کے عقیدہ وحدت الوجود کی اساس پر اکبر نے اپنی سلطنت کا دستور مرتب کرنے کی کوشش کی تھی، لیکن مسلمان حکمران طبقوں کو بادشاہ کی یہ روش ناگوار گزری، حسن اتفاق سے ان کو امام ربانی ایسے پیر و مرشد مل گئے جنہوں نے ابن عربی کے عقیدہ وحدت الوجود کے مقابلے میں اپنا وحدت الشہود کا فکر پیش کیا اور ایک روحانی پیشوا اور اسلام کے مجدد کی حیثیت سے مسلمانوں میں غیر معمولی جوش اور ولولہ پیدا کر دیا۔ ان کی کوششوں کے نتیجے میں جہانگیر اور شاہجہان کے زمانوں میں اکبری دستور میں بعض تبدیلیاں بھی کی گئیں، لیکن اکبر کا اساسی فکر بدستور موجود رہا۔ اورنگ زیب کی کامیابی بہت حد تک اس گروہ کی رہن منت تھی، جو اکبر کے سیاسی مسلک کا سخت مخالف تھا۔ چنانچہ اس کے بادشاہ بننے سے سلطنت میں اس گروہ کو اپنے حریف راجپوتوں اور شیعوں پر پورا غلبہ حاصل ہو گیا۔ خود عالمگیر بھی بہ نفس نفیس امام ربانی کے فرزند مولانا شاہ معصوم کا مرید تھا۔ موصوف کے مکاتیب سے معلوم ہوتا ہے کہ اورنگ زیب کی دنیاوی مہمات حتیٰ کہ جنگی اور سیاسی کارناموں میں آپ کے مشوروں کا بڑا دخل تھا۔ لازماً اس کا اثر کاروبار سلطنت پر بھی پڑا، چنانچہ ہندوؤں پر جزیہ لگایا گیا اور شیعوں کے زور کو توڑنے کی کوششیں کی گئی۔

عالمگیر کی اس سیاست سے ہندو بدک اٹھے اور شیعوں میں ناراضگی پھیل گئی۔ اکبر کے عہد سے راجپوت اور شیعہ مغلیہ سلطنت کی دو بڑی طاقتیں بن گئی تھیں۔ اول الذکر فوجوں میں بڑی کثرت سے تھے اور انتظامی شعبوں میں شیعوں کا کافی دخل تھا۔ اب جو حکومت کا طرز بدلا سلطنت سے ان طبقوں کی پہلی سی وفاداری نہ رہی اور ملک کے اندر تفرقہ اور انتشار کے جراثیم پیدا ہونے لگے۔ چنانچہ ایک طرف مرہٹوں نے سراٹھایا۔ دوسری طرف راجپوت اٹھ کھڑے ہوئے۔ ادھر بخارا کا مرکز کمزور ہو رہا تھا۔ ادھر افغانوں میں قومی جذبات بھڑک اٹھے تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جن طبقوں کے بل پر عالمگیری سیاست کا ڈول ڈالا گیا تھا۔ وہ طبقے اتنی بڑی سلطنت کا بار اٹھانے کے قابل نہ رہے اور اس طرح مخالفوں کو موقع مل گیا کہ وہ اورنگ زیب کی آنکھیں بند ہوتے ہی اپنے اپنے علاقوں میں خود مختار بننے کے لیے ہاتھ پاؤں ماریں۔

اورنگ زیب عالمگیر کی سلطنت جب اپنے پورے عروج پر تھی اور بظاہر معلوم ہوتا تھا کہ یہ سلطنت اسی شان و شوکت کے ساتھ ابدلاً بادتک قائم رہے گی۔ اس وقت بعض مسلمان جماعتیں ایسی بھی تھیں جو عالمگیری مسلک کے خلاف تھیں۔ یہ لوگ مذہباً بچے مسلمان تھے اور حکومت کا اسلامی اصولوں کے مطابق ہونا انہیں ناگوار خاطر نہ تھا لیکن وہ دیکھ رہے تھے کہ جن سیاسی عناصر کی ترکیب سے حکومت کا ڈھانچہ کھڑا کیا گیا ہے۔ وہ عناصر ایک ایک کر کے مرکزی قوت سے الگ ہوتے جا رہے ہیں۔ ہم ابھی ذکر کر آئے ہیں کہ عالمگیر امام ربانی کے صاحب زادہ کا مرید تھا، امام ربانی تصوف میں نقشبندی طریقہ رکھتے تھے۔ اس طریقہ میں شیعیت سے عام بیزاری پائی جاتی ہے۔ نیز نقشبندی سماع کو بھی اچھا نہیں سمجھتے، عالمگیر کے زمانہ کا واقعہ ہے کہ دہلی کے محتسب نے جو امام ربانی کے متبعین میں سے تھا، صوفیاء کے سماع پر پابندیاں عائد کر دیں۔ طبعاً اس سے چشتی طریقہ کے صوفیوں میں برہمی پیدا ہوئی، چنانچہ جس طرح اکبر کی انتہا پسندی کے خلاف رد عمل ہوا تھا، اسی طرح عالمگیر مسلک کی سخت گیری کے متعلق مسلمان اہل فکر کی ایک جماعت بے اطمینانی کا اظہار کرنے لگی۔

بے شک اس امر کا تو سب کو اعتراف تھا کہ بادشاہ خدا پرست اور انصاف پرور ہے، لیکن وہ دیکھتے تھے کہ اس کے باوجود اس کی سلطنت میں بعض خدا کے بندے محض اس بنا پر معتوب ہیں اور ان پر پورا اعتماد نہیں کیا جاتا کہ وہ ہندو اور شیعہ ہیں۔ دوسری طرف سنی مسلمانوں کے وہ گروہ جو نقشبندی طریقہ سے پوری طرح متفق نہیں ہیں، حکومت کے احتساب کا نشانہ بن رہے ہیں۔ ان حالات میں ہندوستان جیسے ملک میں جہاں بھانت بھانت کے مذاہب اور مختلف قومیں ہیں کسی مرکزی حکومت کا قائم رہنا جو سب کو اپنے قبضہ میں رکھ سکے کیسے ممکن تھا۔ اہل فکر کی یہ جماعت سلطنت کے ان روگوں سے واقف تھی۔ وہ اکبر کے سیاسی اعمال کے حامی نہ تھے لیکن جس نہج پر اکبر نے مختلف ملتوں کو ہم نوا کرنے کی کوشش کی تھی وہ اصولاً اس سے متفق تھے۔ اسی طرح وہ عالمگیری کی اسلام پرستی کے قائل تھے، لیکن اسلام پرستی نے امور سلطنت میں جو سخت گیری کی روش اختیار کی تھی، اس کے خلاف تھے۔ شاہ ولی اللہ کے والد شاہ عبدالرحیم صاحب اور ان کے چچا شاہ ابوالرضا صاحب اس خیال کے ترجمان اور ان کے ہونہار فرزند امام ولی اللہ ان کے افکار کے مرتب کرنے والے ہیں۔

شاہ عبدالرحیم اورنگ زیب کے ہم عصر تھے وہ درباری علماء میں سے نہ تھے۔ گو ایک دفعہ قادی عالمگیری کی ترتیب کے سلسلہ میں ان کو دربار شاہی سے تو سل حاصل ہو گیا تھا، لیکن ان کے مرشد کی دعا سے یہ رشتہ دیر پا ثابت نہ ہوا۔ شاہ ولی اللہ بھی درباری سیاست سے الگ رہے، جس سال عالمگیر کے تخت پر سلطان محمد شاہ متمکن ہوا، اسی سال شاہ ولی اللہ اپنے باپ کی مسند تدریس پر جلو افروز ہوئے،

یہ ۱۷۱۹ء کا واقعہ ہے۔ اس زمانے میں مسلمانوں کی مذہبی زبان عربی تھی اور عام پڑھے لکھوں کی زبان فارسی تھی۔ شاہ ولی اللہ کا مشن عام مسلمانوں کے لیے تھا۔ آپ نے قرآن مجید کا عام مسلمانوں کی زبان میں ترجمہ کرنا ضروری سمجھا۔ شاہ ولی اللہ کے جانشین ان کے بیٹے شاہ عبدالعزیز ہوئے جو ۱۷۲۳ء سے ۱۸۲۳ء تک دہلی میں درس دیتے رہے۔ ان کے زمانے میں فارسی کی جگہ اردو لے رہی تھی۔ شاہ عبدالعزیز کے بھائی شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین نے قرآن مجید کے ترجمے اردو میں کیے اور ان کے بھتیجے شاہ اسماعیل نے اردو میں دینی کتابیں لکھیں۔

ابن عربی اور امام ربانی کی طرح شاہ ولی اللہ بھی ایک نئے فلسفی فکر کے بانی ہیں۔ ابن عربی کے عقیدہ وحدت الوجود سے امام ربانی کو اختلاف تھا اور اکبر کی سیاسی حکمت عملی جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا ہے، ایک حد تک وحدت الوجود کے عقیدہ کا نتیجہ تھی۔ اس کے برخلاف امام ربانی نے اپنا نیا فکر پیش کیا۔ چنانچہ اس کی بنا پر اورنگ زیب کے عہد میں جو نظام سلطنت بنا، وہ اکبر کے سیاسی مسلک سے بالکل جدا تھا۔ شاہ صاحب ابن عربی کے عقیدہ وحدت الوجود کو صحیح مانتے ہیں، لیکن اس کے ساتھ ہی وہ امام ربانی کے فکر کو بھی ایک لحاظ سے ٹھیک سمجھتے ہیں، ان کا کہنا یہ ہے کہ دونوں بزرگوں میں اصولاً کوئی فرق نہیں۔ امام ربانی نے جس خیال کو وحدت الشہود سے تعبیر کیا ہے، وہ ابن عربی کے وحدت الوجود میں خود موجود ہے۔ امام ربانی اور ان سے پہلے امام ابن تیمیہ کو ابن عربی سے یہ شکایت تھی کہ لمن کے تصور تو حید سے اسلام کی حقانیت پر زد پڑتی ہے۔ شاہ صاحب نے ابن عربی کے وحدت الوجود کے تصور کی اس طرح تشریح کی کہ اس میں اور اسلام میں کوئی بنیادی تضاد نہ رہا۔

شاہ صاحب نے تفہیمات الہیہ جز اول (صفحہ ۱۲۲) میں اس موضوع پر بڑی تفصیل سے بحث کی ہے۔ فرماتے ہیں کہ ہر زمانے میں نیا ظہور ہوتا ہے اور ہر ظہور کے اپنے احکام ہوتے ہیں۔ چنانچہ جیسے جیسے زمانہ بدلتا ہے اس کے ساتھ ساتھ احکام بھی بدلتے ہیں اور نئے نئے ترجمان حق آتے ہیں۔ منشاء الہی کا پہلا ظہور معدنیات کی صورت میں ہوا۔ معدنیات کے بعد عالم نباتی قدرت حق کا محور بنی، نباتات سے حیوانات نے یہ منصب لیا اور پھر انسان کی شکل میں ارادہ حق کا ظہور ہوا۔ انسان اول یعنی حضرت آدم کو پیدا کر کے اس سے خدا نے یوں خطاب کیا ”تو دنیا کا ایک نمونہ ہے اور اس کی ایک اجمالی صورت ہے۔ تم عالم صغیر ہو جو عالم کبیر کی شبیہ ہے۔ آسمانوں، زمینوں اور پہاڑوں کو چھوڑ کر تمہیں امانت کا حامل بنایا گیا ہے۔ ساری دنیا تیرے لیے مسخر کی گئی ہے۔ بارش برستی ہے تو تیرے لیے، ہنرہ اگتا ہے تو تیری خاطر اور مال مویشی تیرے آرام کے لیے پیدا کیے گئے ہیں اور تمام مخلوقات میں صرف تم میرے محبوب ہو۔“ آدم سے حق کے ترجمانوں کا سلسلہ شروع ہوا تاکہ حضرت محمد رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ دور ختم ہوتا ہے۔ یہاں سے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے اس دور کی محبوب، کامل اور مقرب شخصیت حضرت علیؑ کی تھی، اس کے بعد حق کی نظر رحمت ابن عربی کی طرف متوجہ ہوئی، جنہوں نے علوم توحید سے پردہ اٹھایا اور وحدت الوجود کی حقیقت سے اہل ارشاد کو آگاہ کیا۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اس دور میں اللہ تعالیٰ نے اس رحمت کا مستحق مجھے بنایا ہے، میری زبان سے قومی، ملی اور انسانی حقائق کو واضح کاف کیا ہے، جب میں اپنی قوم کے افکار اور اشتغال پر گفتگو کرتا ہوں تو اس کا پورا حق ادا کرتا ہوں اور پھر جب موضوع بحث وہ معاملات ہوتے ہیں، جو میری قوم اور ان کے خالق سے متعلق ہیں تو ان کے بیان میں کوئی کمی نہیں رہتی۔ جب انسانیت کے اسرار اور اس کے عمومی امور پر گفتگو ہوتی ہے تو اس دریاے ناپیدا کنار کی شنواری میں میرا کوئی حریف نہیں ہوتا۔ جب شریعتوں اور نبوت کا معاملہ درپیش ہو تو اس مضمون میں میرا خاص درک ہے اور میں اس پر ہر لحاظ سے حاوی ہوں۔ اسی کتاب میں اپنے متعلق شاہ صاحب نے مزید صراحت فرمائی ہے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے، ”مجھے مجددیت، وصایت اور قطبیت ارشاد یہ کے انعامات سے سرفراز فرمایا گیا ہے، مجددیت کا حاصل یہ ہے کہ فقہ پر سنت کے اصولوں پر گفتگو ہو اور اس ضمن میں قیاس و تخمین کو بالکل الگ رکھا جائے۔ عقائد کی بحث ہو تو صرف صحابہ اور تابعین کے مسلک کو نقش راہ بنایا جائے۔ وصایت سے مراد یہ ہے کہ دین کے احکام جن باتوں کی مذہب نے ترغیب دی ہے یا جن سے منع کیا ہے انبیاء کے قصے اور انبیاء کرام کے دوسرے ارشادات کی حکمت بیان کی جائے اور قطبیت ارشاد یہ سے مطلب یہ ہے کہ اس زمانے میں خدا تعالیٰ کی مرضی جس شکل میں ظہور چاہتی ہے اس کو پیش کیا جائے۔ مجھے امید ہے کہ اگر خدا نے چاہا تو میری کوششوں سے نئی زندگی ظہور پذیر ہوگی۔“

خلاصہ کلام یہ ہے کہ شاہ صاحب کے نزدیک شیخ اکبر محی الدین ابن عربی اپنے دور کے خاتم اور فاتح ہیں اور انہوں نے وحدت الوجود کا جو تصور پیش کیا ہے وہ خدا تعالیٰ کی ذات اقدس اور اس کی کائنات کے سربستہ حقائق کو انسانی ذہن سے قریب تر لانے اور ان کے مفہوم کو واضح کرنے کی ایک کامیاب کوشش ہے۔ شاہ صاحب کے خیال میں عقیدہ وحدت الوجود کو اسلام کے منافی سمجھنا صحیح نہیں۔ اصل میں ابن عربی کے مخاطب تمام مذاہب کے لوگ تھے اور اس میں شک نہیں کہ دنیا کے سب اہل مذاہب کسی نہ کسی صورت میں خدا پر عقیدہ رکھتے ہیں۔ البتہ ہر مذہب کا تصور جدا جدا ہے۔ ابن عربی عقیدہ توحید کو اس انداز میں پیش کرتے ہیں کہ سامی ذہن بھی اس کو سمجھ لے اور آریائی دماغ کو بھی اس کے قبول کرنے میں طبعی بعد نہ ہو۔ اس لیے وہ اپنے فکر کی بنیاد اس وجدان اور علم پر رکھتے ہیں جو سب

انسانوں میں مشترک ہے۔ دوسرے لفظوں میں خدا کی ذات کو سمجھنے اور اس کی کائنات کی لم معلوم کرنے کا جو طریقہ ابن عربی نے اختیار کیا ہے۔ وہ کسی خاص مذہب اور ملت تک محدود نہیں وہ اتنا ہی عام ہے جتنی خود انسانیت ہے اس سے نعوذ باللہ اسلام کی مخالفت نہیں بلکہ تائید ہوتی ہے۔

ہر جماعت کی دو حیثیتیں ہوتی ہیں، ایک حیثیت اس کی داخلی ہے جماعت کے افراد کا آپس کا ربط و ضبط، ان کے طور طریقے اور ان کی انفرادی، مجلسی اور جماعتی زندگی کے قوانین، یہ جماعت کی داخلی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کی دوسری حیثیت خارجی ہوتی ہے۔ یعنی کل اقوام میں اس جماعت کی کیا اہمیت ہے۔ دوسروں سے تعلق کیسے رکھے، ان کو کیا سمجھے، ان کے مذاہب، اخلاق اور عادات کو کس نظر سے دیکھے۔ جماعت کے استحکام اور ترقی کے لیے اس کی داخلی اور خارجی دونوں حیثیتوں کا منظم اور متوازن ہونا ضروری ہے۔ دنیا میں اکثر قومی مصلحین کو یہ دشواری پیش آئی ہے کہ وہ اپنی قوم کی اندرونی تنظیم میں تو بڑے کامیاب رہے لیکن جب ان کا معاملہ دوسری قوموں سے پڑا تو ان کے آئین و ضوابط ناقص ثابت ہوئے اور ان کا سارا بنا بنایا کام بگڑ گیا۔ چنانچہ صحت مند قومی تنظیم کے لیے صالح بین الاقوامی تصور کا تعین بھی از حد ضروری ہے، لیکن اگر ایک اعلیٰ بین الاقوامی تصور موجود ہو لیکن قومی تنظیم سے اعراض برتا جائے تو اس کا نتیجہ بھی قوم کے حق میں اچھا نہیں نکلتا۔

وحدت الوجود کا تصور تمام مذاہب عالم کے متعلق چند امور کا تعین کرتا ہے، یہ امور اسلام کی اصل بنیاد ہیں اور دوسرے مذاہب بھی آغاز کار میں انہیں بنیادوں پر قائم تھے۔ یہ عالمگیر مذہب کا بین الاقوامی یا خالص انسانی تصور ہے، اکبر کے زمانے میں اسی تصور پر ایک عملی نظام بنانے کی کوشش کی گئی لیکن خرابی یہ ہوئی کہ ایک مذہب یا قوم کی جو جماعتی حیثیت ہوتی ہے، اکبر کے ارباب حل و عقد اس کی اہمیت کو نظر انداز کر گئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اکبر کے دین الہی سے نہ مسلمانوں کو فائدہ پہنچا اور نہ ہندو اس سے مطمئن ہوئے بلکہ الٹا اس سے ذہنی، اخلاقی اور جماعتی انتشار بڑھا۔ اس کے بعد امام ربانی کے فکر پر مسلمانوں کو منظم کرنے کی کوشش ہوئی اس میں شک نہیں کہ امام صاحب کی برکت سے مسلمانوں میں نئی زندگی پیدا ہوگئی، حکمران طبقوں کے اخلاق و اعمال میں جو بدعنوانیاں پیدا ہوگئی تھیں، ان کا سدباب ہو گیا اور ہندوستان کو عالمگیر ایسا نیک طبیعت درویش مزاج صالح اور مستعد بادشاہ ملا۔ لیکن اس گروہ کا دائرہ فکر صرف مسلمانوں تک محدود تھا اور مسلمانوں میں بھی صرف سنیوں تک، چنانچہ ہوا یہ کہ نہ یہ ہندو راجپوتوں کو ساتھ رکھ سکے اور نہ شیعہ مسلمانوں کو اپنا رفیق بنا سکے۔

اس کے برعکس شاہ ولی اللہ صاحب ایک طرف ابن عربی کے عقیدہ وحدت الوجود کو صحیح مانتے

ہیں اور دوسری طرف امام ربانی کی کوششوں کو سراہتے ہیں۔ عملاً اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ ان دونوں کے افکار میں توافق پیدا کر کے اکبر کے مسلک اور اورنگ زیب کے طریقہ کار کو ہم آہنگ بنانے کے خواہاں تھے اور ان دونوں میں جو تضاد پیدا ہو گیا تھا، اس کو رفع کرنے کے حق میں تھے۔ ان کے نزدیک اکبر کا کام سب مذاہب اور ساری قوموں کو باہمی منافرت اور عداوت کے بجائے دوستی اور آشتی کے رشتہ میں پرونا تھا، چنانچہ اس کا یہ اقدام عین صواب تھا۔ کیونکہ مختلف مذاہب اور دوسری ملتوں کے متعلق اس قسم کا جامع انسانیت تصور رکھے بغیر کوئی بین الاقوامی اور وسعت پذیر نظام وجود میں نہیں آسکتا۔ اور اکبر کو اس میں ابن عربی کے وحدت الوجود کے فکر سے مدد ملی۔ چنانچہ یہ تصور انسانیت کی بقاء اور اس کی ترقی کے لیے بے حد مفید ہے اورنگ زیب کے پیش نظر یہ تھا کہ وہ مسلمانوں کو بحیثیت ایک جماعت کے منظم کرے اور اکبر کے بین المللی یا انسانی تصور حیات سے جماعتی زندگی میں غلطی سے جو بدعنوانیاں پیدا ہو گئی تھی ان سے قومی زندگی کو پاک کرے۔ اس کام میں امام ربانی کے فیوض نے اس کی رہنمائی کی۔ اب جہاں تک زندگی کی اصل ضرورتوں کا تعلق ہے، قومی اور بین الاقوامی مصلحتوں میں کوئی تعارض نہیں ہونا چاہئے۔ الغرض وحدت الوجود کا تصور کل انسانیت کو ایک فکری وحدت میں جمع کرتا ہے اور امام ربانی نے جن امور پر زور ڈالا تھا ان سے ملی زندگی کو استحکام ملتا ہے۔ چنانچہ ہمیں ایسے نظام کی ضرورت ہے جو فکری اعتبار سے اتنا وسیع اور ہمہ گیر ہو کہ ساری انسانیت کو اپنے اندر لے لے لیکن عملاً اس سے ملت کے نظام اور ڈسپلن میں بھی فرق نہ آئے۔

شاہ ولی اللہ صاحب نے اپنی تصانیف میں زندگی کی ان دو گانہ حیثیتوں کو بڑی وضاحت سے پیش فرمایا ہے۔ کل نوع انسانی کے کیا خواص ہیں انسانیت کے بحیثیت مجموعی کیا تقاضے ہیں۔ انسان اپنی زندگی کو کس طرح منظم کرتے ہیں، ان کے ایک دوسرے کے ساتھ کس طرح تعلقات پیدا ہوتے ہیں اور حالات کے ساتھ ساتھ ان میں کیا تبدیلیاں ہوتی ہے۔ مختصر الفاظ میں انسانیت کیا ہے اس کے جسم کے مطالبے کیا ہیں، اس کا دماغ کیا سوچتا ہے، اس کی روح کیا چاہتی ہے، کائنات سے اسے کیا نسبت ہے اور اس کائنات کے خالق اور اس کے درمیان کیا علاقہ ہے۔ البدور البازغہ، الخیر الکثیر، الطاف القدس، السطعات اور تفہیمات میں ان مباحث پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ کتابیں شاہ صاحب کی حکمت کی اساس ہیں۔ شاہ صاحب کی یہ حکمت عمومی چیز ہے۔ یہ کسی خاص شریعت اور ملت کی حدود میں مقید نہیں، ایک ہندو بھی اس سے استفادہ کر سکتا ہے اور ایک مسلمان بھی اس کو شرح ہدایت بنا سکتا ہے اور تو اور وہ شخص جو کسی مذہب کا پیرو نہ ہو، اس کے لیے بھی یہ حکمت جاذب توجہ ہو سکتی ہے، یہ حکمت خالص انسانی ہے اور انسانیت عمومی کے سوا کسی اور قید کو قبول نہیں کرتی۔

اپنی سب سے مشہور اور معرکہ الآرا تصنیف حجۃ اللہ البالغہ میں شاہ صاحب نے اسلامی شریعت کو اس نسانی حکمت کے اصولوں کے ساتھ مطابقت دینے کی کوشش کی ہے۔ اس سے ان کا مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ انسانیت کے عمومی تصور اور اس کی اس عملی شکل یعنی شریعت اسلامی میں کوئی تضاد نہیں، ایک تصور ہے اور ایک اس کا عملی نمونہ۔ مولانا عبید اللہ سندھی کے الفاظ میں انسانیت کے اوصاف کیا ہیں؟ اس کا جواب ایک ماہر حکمت کے نزدیک یہ ہوگا کہ تمام اقوام اور اصناف میں استقرار تام کے بعد جس قدر اوصاف مشترک پائے جاتے ہیں، وہ انسانیت کا مصداق ہیں۔ شاہ ولی اللہ صاحب کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ پڑھ کر دیکھیے وہ ہر بات میں کسی عمل، کسی خلق، کسی عقیدہ کی خوبی فقط اس طریقہ سے ثابت کریں گے کہ وہ انسانیت کے عام افراد یعنی مشرق و مغرب میں اور عرب و عجم میں پایا جاتا ہے۔ یہ ایسا نفس جو ہر حکمت ہے جس سے عام مصنفین کی کتب خالی ہیں، اسی طرح قرآن کو سمجھانے کے لیے شاہ صاحب نے فارسی میں اس کا ترجمہ کیا۔ فوز الکبیر کے ذریعہ تفسیری مباحث کی وضاحت کی۔ ازالۃ الخفاء میں اسلام کے دور اول کی تاریخ کا فلسفہ اور اصول سیاست مدون کیے۔ یہ کائنات ذات اقدس کی تجلیات سے کس طرح مستتیر ہوتی ہے۔ السطعات میں اس کا بیان ہے، انسان کے ادراک اور احساس کے ذرائع کو الطاف القدس میں پیش کیا گیا ہے اور اس کے بعد مسلمانوں نے ان معاملات میں کیا مسلک اختیار کیا۔ ہمععات، انتباہ فی سلاسل اولیا اللہ اور قول جمیل وغیرہ میں ان امور پر بحث کی گئی ہے۔ قصہ کوتاہ اس طرح انسانی زندگی کے عمومی پہلو اور اسلام کی علمی اور عملی تعبیروں کو ہم آہنگ اور موافق ثابت کیا گیا ہے۔ حکمت اور شریعت کی یہ تفریق اور پھر ان میں اس طرح مطابقت کرنا شاہ صاحب کے فکر کا اصل اصول ہے۔ انہوں نے جیسا کہ ہم پہلے کہیں لکھ آئے ہیں، سب سے پہلے مسلمانوں کے مختلف فرقوں اور متعارض افکار میں توافق پیدا کیا۔ اور سب کو کتاب و سنت کے اصل مرکز کے نیچے جمع کر دیا۔ پھر اسلام، عیسائیت اور یہودیت کو حقیقت کی فروع بتایا۔ اور ایک جامع انسانیت تصور کے ماتحت علمی اور غیر علمی، یعنی صابئی دینوں کو یک جا کیا، چنانچہ اس طرح آپ نے کل انسانوں اور ان کے تمام مذاہب اور افکار کو ایک اصل سے نکلنے دیکھا اور اپنی حکیمانہ تصانیف کے ذریعے اہل وطن کو اس حقیقت سے آگاہ بھی کیا۔ مولانا کے ارشاد کے مطابق شاہ صاحب کی اس حکمت کو پڑھ لینے کے بعد ہمارا اطمینان ہوا، ہم انسانی زندگی کو وحدت غیر منقسمہ مانتے ہیں (نیز) دنیاوی زندگی اور اخروی زندگی دو متباہن چیزیں نہیں ہیں، بلکہ ایک ہی سیر (راہ) کے مختلف منازل ہیں۔

اگر حالات سازگار ہوتے اور اورنگ زیب کے بعد ہندوستان کی اسلامی سلطنت کا شیرازہ آنا اس طرح نہ بکھرتا تو جس طرح شیخ اکبر ابن عربی کے فکر نے اکبر جیسا شہنشاہ پیدا کیا اور امام ربانی

کی دعوت عالمگیری نظام کو برسر کار لائی۔ اسی طرح ولی الہی فکر اکبر اور اورنگ زیب کے ہندوستان کو اور آگے لے جاتا۔ صدیوں کے بعد اس بد نصیب ملک کو جو سیاسی وحدت نصیب ہوئی وہ یوں پارہ پارہ نہ ہوتی اور ایشیا کے ملکوں میں ہندوستان کو جو سیاسی اہمیت حاصل ہو گئی تھی وہ اس طرح رائیگاں نہ جاتی، بے شک ولی الہی فکر میں اتنی جان تھی کہ وہ اس ملک کے قومی گروہوں کو جو ملک کے ہر حصہ میں خود مختاری کے لیے جدوجہد کر رہے تھے۔ ایک متحدہ اور آزاد ہندوستان کی مرکزیت سے ٹوٹنے نہ دیتا۔ لیکن مغلیہ سلطنت بالکل زوال کے کنارے پہنچ چکی تھی۔ اور اس میں اتنا دم نہ تھا کہ وہ مرہٹوں، جاٹوں، سکھوں، نوابین اودھ اور روہیلوں کو قابو میں رکھ سکتی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہماری تاریخ کا قدم ترقی کی طرح اٹھنے کے بجائے تنزل کی طرف بڑھا۔ مسلمان بادشاہوں کی چھ سو سال کی تمام جدوجہد کا حاصل جو کل ہندوستان کو ایک سیاسی وحدت بنانے کی شکل میں ظاہر ہوا تھا اس افراتفری کی نذر ہو گیا اور ملک میں طوائف الملوکی پھیل گئی۔ ولی الہی فکر دراصل ہندوستانی مسلمانوں کی اس کوشش کا ترجمان تھا کہ ہندوستان کی مرکزیت جس طرح بھی ہو سکے قائم رہے اور اکبر اور اورنگ زیب کے نظام کار سے کوئی بہتر نظام وجود میں آجائے۔

ولی الہی فکر کے صالح اور مفید ہونے میں کوئی کلام نہیں، لیکن کسی فکر کی کامیابی اور ناکامی کا انحصار ماحول اور اس فکر کے بروئے کار لانے والوں پر ہوتا ہے۔ بد قسمتی سے اس فکر کے ظہور کے وقت ایک طرف تو مسلمانوں کے حکمران طبقے اتنے گر چکے تھے اور اندرون ملک میں اس زور کی شورشیں برپا تھیں، دوسری طرف سات سمندر پار سے ایک نئی طاقت نے نئے آلات و افکار کے ساتھ ہندوستان پر پورش کر دی جس کے سامنے کسی ملکی تحریک کو پھلنے پھولنے کا موقع نہ مل سکا اور ہندوستان اپنے پاؤں پر چلنے کے بجائے انگریزوں کے پیچھے چلنے پر مجبور ہو گیا۔

اس سے کہیں یہ غلط فہمی نہ ہو کہ شاہ صاحب اکبر اعظم کے سامراج کو دوبارہ زندہ کرنے کی فکر میں تھے، اس سامراج کو تو انہوں نے اپنی آنکھوں سے دم توڑتے دیکھا تھا۔ سادات بارہ کا تسلط، فرخ سیر کا ان کے ہاتھوں بصد بیکسی قید میں مرنا، پھر توراتی امراء کے ہاتھوں سادات بارہ کا زوال، مرہٹوں کی بغاوت اور ان کا عروج نادر شاہ کی یلغار اور دہلی میں قتل عام، احمد شاہ ابدالی اور معرکہ پانی پت، سیاست ہند میں روہیلوں کا غلبہ، سکھوں کا زور، ایرانی اور توراتی امراء کی رقیبانہ چپقلش، ہندوستان پر یورپین اقوام کی لچائی ہوئی نگاہیں، پھر انگریزوں کا بنگال و بہار میں عمل دخل، یہ سب لرزہ خیز واقعات شاہ صاحب کے سامنے گزرے۔ شاہ صاحب نے خوب سمجھ لیا تھا کہ شہنشاہیت کا دور ختم ہو چکا ہے۔ اب اگر کوئی حکومت بنے گی تو اس کی اساس کوئی اور ہوگی۔

شاہ ولی اللہ صاحب خود فرماتے ہیں کہ سلطنت کا شیرازہ بکھر چکا ہے قیصر و کسریٰ کی سی خرابیاں مغلوں کی سلطنت میں پیدا ہو گئی ہیں۔ اس لیے مصلحت خداوندی یہ ہے کہ اس نظام کو سرے سے توڑ دیا جائے۔ چنانچہ شاہ صاحب کے پیش نظر مغلوں کی گرتی ہوئی شاہی عمارت کو تھامنا نہ تھا۔ وہ عمارت تو اب گرنے کے قریب آچلی تھی۔ وہ بادشاہی نظام کو فرسودہ اور بیکار ہوتے دیکھ چکے تھے، وہ محسوس کر رہے تھے کہ سلطنت تو اب ہاتھ سے جا رہی ہے اور اس کے ساتھ بادشاہ، امیر اور وزیر بھی جائیں گے، اب اگر عوام مسلمانوں کو ہندوستان میں رہنا ہے اور جن اعلیٰ افکار اور بلند مقاصد کو اچھے مسلمان فرماں روا اور خدا پرست صوفی ہندوستان میں قائم رکھے ہوئے تھے، انہیں اگر برابر جاری رکھنا ہے تو اس کے لیے کسی اور اساس کی ضرورت ہے، جس پر ہندوستان کی نئی سوسائٹی کی بنیاد رکھی جائے۔

واقعہ یہ ہے کہ اس دور میں ہندوستان میں اسلامی اجتماع بہت حد تک بخارا کی سوسائٹی کے افکار کا پرتو تھا، بخاری فقہ، بخاری علم کلام اور بخاری علماء کے علوم ہمارے حکمرانوں کی ذہنیت میں رہے ہوئے تھے، یہاں کی سیاسی روایات بھی اس دیار کی یاد کو تازہ کرتی تھیں۔ شاہ صاحب نے بخارا کی اس فکری زندگی کا تتبع نہیں کیا، بلکہ وہ خلافت راشدہ کے دور کو اپنے لیے نمونہ بناتے ہیں۔ وہ بادشاہوں کے اسلام کو زندہ کرنے میں کوشاں نظر نہیں آتے، بلکہ وہ اس اسلام کا تعارف کراتے ہیں، جو تاریخ میں ایک انقلابی حیثیت رکھتا ہے، جس نے عہد اول میں مکہ کے زرائع و زوں اور جاہ پرست سرداروں کا زور توڑا۔ مذہب کے توہمات کے بتوں کو پاش پاش کیا، غریبوں کو اٹھا کر امیروں اور زبردستوں سے لڑایا، مذہب کی اجارہ داری کو ختم کیا۔ قیصر اور کسریٰ کے نظام کو جس کے تلے انسانیت دبی جا رہی تھی فنا کر دیا۔ اور تاریخ میں ایک ایسے دور کی بنا ڈالی، جس میں جسم و دماغ کی آزادی، اخوت اور معاشی مساوات بنیادی اصول تھے۔ چنانچہ شاہ صاحب جہاں ایک طرف مسلمانوں کو اسلام کے ان اصولوں پر اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو منظم کرنے کی دعوت دیتے ہیں تو دوسری طرف عام انسانیت کے متعلق بھی ایسے قواعد متعین فرماتے ہیں جن کی وسعت اور افادیت ہر قوم کے لیے شمع ہدایت بن سکتی ہے۔

ارشاد کا یہ سلسلہ تقریباً ۶۱ برس تک جاری رہا۔ اس طویل مدت میں خاص دہلی میں ہزار ہا اشخاص ان سے فیض یاب ہوئے۔ نیز ان کے تربیت یافتہ افراد ہندوستان کے طول و عرض میں پھیل گئے۔ شاہ عبدالعزیز نے اپنی جماعت کی باقاعدہ تنظیم بھی کی۔ چنانچہ آپ نے اپنے خاص تربیت یافتوں کی ایک جمعیت مرکزی بنائی۔ حسن اتفاق سے اس جمعیت کو سید احمد شہید جیسی صاحب عزم اور بااثر شخصیت مل گئی۔ شاہ عبدالعزیز نے سید صاحب کی ذہنی روحانی اور جنگی تربیت کی طرف خاص توجہ فرمائی۔

شاہ ولی اللہ کو اپنے عہد میں مرہٹوں سے عہدہ برآ ہونا پڑا تھا۔ اور اس میں کابل کی طاقت نے بڑا کام دیا تھا۔ شاہ عبدالعزیز کے زمانے میں سکھ پنجاب پر غالب ہو چکے تھے اور اس طرح انہوں نے دہلی اور کابل کا راستہ مسدود کر دیا تھا۔ چنانچہ اب اس کا کوئی امکان نہ رہا کہ دہلی کی اسلامی طاقت کو درہ خیبر کی راہ سے کوئی مدد مل سکتی۔ عام طور پر اس وقت تک یہ ہوتا چلا آیا تھا کہ جب کبھی ہندوستان کی اسلامی طاقت کو زوال آتا، شمال سے مسلمانوں کی تازہ دم جماعتیں ان کی مدد لانا پہنچتیں۔ اور ان کی وجہ سے اسلامی طاقت کو سنبھالا جاتا۔ شاہ عبدالعزیز نے اپنی زندگی میں سید احمد شہید کی قیادت میں ایک ایسی جماعت بنائی۔ جو وقت آنے پر مسلمانوں کی جنگی سرگرمیوں کو چلا سکے۔ اس جماعت کے امیر سید احمد شہید تھے اور مولانا عبدالحی (شاہ عبدالعزیز کے داماد) اور شاہ اسماعیل شہید (شاہ عبدالعزیز کے برادر زادہ) اس کے مشیر کار خصوصی تھے۔ شاہ عبدالعزیز نے اس جماعت کو پہلی دفعہ ۱۲۳۱ھ میں بیعت طریقت اور دوسری دفعہ ۱۲۳۶ھ میں بیعت جہاد لینے کے لیے دورہ پر بھیجا۔ اس کے بعد سارے قافلہ کو حج پر جانے کا حکم دیا۔

جب یہ قافلہ حج سے واپس آیا تو شاہ عبدالعزیز فوت ہو چکے تھے۔ اور مولانا محمد اسحاق ان کی جگہ ان کے جانشین مقرر ہو گئے تھے۔ اس کے چند سال بعد سید احمد شہید، مولانا عبدالحی اور شاہ اسماعیل اپنی جماعت سمیت سرحد پہنچ گئے اور افغانی قبائل کی مدد سے انہوں نے سکھوں سے لڑائیاں شروع کر دیں۔ دہلی کے مرکز میں شاہ اسحاق رہے۔ ان کے ذریعہ مجاہدین کو روپیہ اور لشکر پہنچتا تھا۔ بد قسمتی سے جہاد کی یہ تحریک ناکام رہی۔ مولانا عبدالحی پہلے ہی انتقال فرما چکے تھے۔ سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل بالاکوٹ کے مقام پر سکھوں سے لڑتے ہوئے ۱۸۳۱ء میں شہید ہوئے۔

اس میں شک نہیں کہ اس حادثہ فاجعہ سے ولی اللہ تحریک کو بڑا صدمہ پہنچا۔ سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل کی شہادت اور مجاہدین کی ناکامی کا واقعہ کچھ کم المناک نہ تھا لیکن اس سلسلہ میں سب سے بڑی مصیبت یہ آپڑی کہ سرحد اور ہندوستان کے عوام مسلمانوں کو اس تحریک سے بدظن کرنے کی بڑے زور سے کوششیں شروع ہو گئیں۔ انہیں وہابی مشہور کیا گیا اور وہابیت ہزار گمراہیوں اور برائیوں کا مرتع

ولی اللہی سیاسی تحریک

اللہ بھڑت شاہ ولی اللہ ایک زبردست حکیم اور مفکر تھے۔ گو بظاہر ان کی دعوت اپنی قوم کے لیے تھی۔ لیکن حقیقت میں وہ تمام انسانیت کو اپنا مخاطب بناتے ہیں۔ ان کی کتابیں اگر زیادہ غور سے پڑھی جائیں تو یہ محسوس ہوگا کہ وہ اپنی قوم کے ہر فرد کو انسانیت عامہ کی تعلیم دے رہے ہیں۔ جس زمانے میں وہ دہلی میں پیدا ہوئے اس وقت دہلی ایک بین الاقوامی سیاسی اور علمی مرکز کی حیثیت رکھتی تھی۔ اسی کا اثر ہے کہ شاہ صاحب کے افکار اور ان کی تعلیمات میں اتنی ہمہ گیریت اور وسعت ہے اور ان کا روئے سخن ایک مخصوص گروہ یا جماعت تک محدود نہیں بلکہ وہ کل بنی نوع انسان کو اپنے دائرہ فکر میں سمیٹ لیتے ہیں۔ دہلی کے اس بین الاقوامی سیاسی اور علمی مرکز کی قیادت اس وقت مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی۔ اس لیے عملاً وہی شاہ صاحب کے پیغام کے حامل ہو سکتے تھے لیکن شاہ صاحب کی تعلیمات کے اصول عام انسانیت کے اصول تھے۔ ان کا زور مذہب کی ظاہری رسوم پر نہیں۔ بلکہ مذہب کی حقیقی روح پر تھا۔ قانون کی ظاہری شکل پر نہیں بلکہ قانون کی جان یعنی عدل و انصاف پر تھا۔ ممکن ہے مرہٹوں، جاٹوں، سکھوں اور اس عہد کی دوسری چھوٹی چھوٹی تحریکیں اپنے اپنے محدود دائرہ میں ٹھیک ہوں۔ لیکن ان میں سے کسی تحریک میں بھی اتنی وسعت اور ہمہ گیری نہ تھی۔ اور ان میں سے کوئی بھی تحریک انسانیت عامہ کی اتنی ترجمان نہ تھی جتنی کہ شاہ ولی اللہ کی یہ تحریک ہے۔

ولی اللہی فکر اس وقت صرف اسلامی سماج ہی میں بار آور ہو سکتا تھا۔ لیکن وقت یہ تھی کہ اس زمانے میں مرہٹے اسلامی سماج کو ختم کرنے کے درپے تھے۔ چنانچہ ضرورت تھی کہ مرہٹوں کے زور کو توڑا جائے، شاہ صاحب کی برکت اور اشتراک سے پانی پت میں احمد شاہ ابدالی نے مرہٹوں کو زک دی۔ اور شمالی ہند کی فضا مسلمانوں کے لیے قدرے صاف ہو گئی۔

شاہ صاحب نے ۱۷۶۳ء میں انتقال فرمایا۔ ان کے بعد ان کے صاحبزادہ شاہ عبدالعزیز جانشین ہوئے۔ آپ نے اپنے والد کی تعلیمات کے بلند افکار کو مروجہ علوم کے ضمن میں خاص و عام میں نشر فرمایا۔ اس طرح ولی اللہی فکر سے قوم کے متوسط طبقے بھی آشنا ہو گئے۔ شاہ عبدالعزیز کا معمول یہ تھا کہ درس کے مخصوص حلقہ کے علاوہ عام مسلمانوں کے لیے ہفتہ میں دو دن وعظ کرتے۔ ان کی تعلیم و

قراردی گئی۔ دراصل اس سے مخالفوں کا مقصد یہ تھا کہ ولی اللہی تحریک کو جو عوام مسلمانوں کی تحریک تھی۔ اور شاہ عبدالعزیز کی علمی کوششوں اور سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل کے دوروں کی وجہ سے جو انہوں نے اطراف ملک میں کیے تھے ہر دیار کے مسلمانوں کو اس تحریک سے ہمدردی پیدا ہو گئی تھی۔ اور کچھ بعید نہ تھا کہ ولی اللہی تحریک عوام مسلمانوں میں نئی زندگی پیدا کرنے کا باعث بن جاتی۔ عوام مسلمانوں میں بدنام کر دیا جائے اور عجیب بات یہ ہے کہ بداندیشوں کی یہ کوششیں بہت حد تک کامیاب ہو گئیں۔

مولانا عبید اللہ سندھی نے اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے ایک دفعہ فرمایا کہ شاہ ولی اللہ صاحب ایک حکیم و فلسفی تھے۔ عارف و صوفی تھے۔ محدث تھے، مجتہد تھے۔ ایک سیاسی مفکر تھے۔ ان کے حدیث کے کمال کو بعض شاگردوں نے اپنے لیے خاص کر لیا۔ لیکن یہ لوگ فقہ حنفی کے خلاف نہ تھے۔ اتفاق سے جب مجاہدین کی جماعت سرحد پہنچی تو ان کے ساتھ بعض ایسے افراد شریک ہو گئے جو فقہ حنفی کے قائل نہ تھے۔ ان کی وجہ سے مجاہدین کی جماعت میں حنفی فقہ سے بعد کا رُحمان پیدا ہو گیا۔ اس طرح سے مخالفوں کو موقع ہاتھ آ گیا کہ وہ مجاہدین کے خلاف عوام مسلمانوں کو ابھار سکیں۔ آخر کار یہ ہوا کہ ولی اللہی تحریک جو خالص ہندوستانی مسلمانوں کی تحریک تھی۔ اور اسی مناسبت سے اس کے اصولوں میں بنیادی طور پر حنفی فقہ کی پابندی لازمی تھی، کیونکہ صد ہا سال سے ہندوستان کے مسلمانوں میں حنفی فقہ کا رواج تھا۔ اور یہی مسلک اُن کے مزاج میں راسخ ہو چکا تھا۔ نجد اور یمن کی ”وہابی“ تحریک کے اثر میں آ گئی۔ آگے چل کر یہ تحریک اہل حدیث کے نام سے ہندوستان میں روشناس ہوئی۔ اور یہ طبعی بات تھی کہ عوام مسلمانوں کو اس تحریک سے پہلے کی سی ہمدردی نہ ہوتی۔

مجاہدین کی ناکامی کے بعد ولی اللہی جماعت میں عام مایوسی کی سی حالت پیدا ہو گئی تھی۔ ایک گروہ نے جو سید احمد شہید کے متعلق یہ عقیدہ رکھتا تھا کہ وہ امام اور مہدی ہیں۔ اور ان کے ہاتھوں لابدی طور پر غلبہ اسلام ہو کر رہے گا۔ یہ باور کر لیا کہ وہ بالاکوٹ کے معرکہ میں شہید نہیں ہوئے بلکہ وہ بدستور زندہ ہیں۔ چنانچہ اس طرح یہ لوگ ایک موہوم امید پر اپنے دل کو ڈھارس دینے میں وقتی طور پر کامیاب ہو گئے۔ دوسرے گروہ نے جو ولی اللہی تحریک کے دہلوی مرکز سے وابستہ تھا اور مولانا محمد اسحاق کی قیادت کو مانتا تھا۔ اپنے لیے ایک نئی شاہراہ عمل سوچی۔ اس کو سمجھنے کے لیے اُس وقت کے اسلامی ہند کی حالت کو مد نظر رکھنا ضروری ہے۔ اس وقت ہندوستان کا اسلامی مرکز بالکل کمزور ہو چکا تھا۔ افغانی قبائل کی مدد سے ہندوستانی مسلمانوں کے مصائب کو دور کرنے کی جو کوشش کی گئی تھی اس کے انجام کا پہلے ذکر کر دیا گیا ہے۔ بنگال اور میسور کی اسلامی حکومتیں کبھی کی مٹ چکی تھیں۔ روہیلے اپنا زور دکھا چکے تھے۔ اودھ کی نوابی بھی ناپید ہو چکی تھی۔ لے دے کر ایک حیدرآباد تھا اور وہ بالکل بے

دست و پا تھا۔ دہلی میں مغل سلطان شہنشاہ ہند کے نام سے یاد کیا جاتا تھا لیکن اس کی حکومت دہلی کے لال قلعہ کی چار دیواری تک محدود تھی۔ اور اس گھریلو حکومت کو چلانے کے لیے بھی اسے انگریز کے وظیفہ کی طرف دیکھنا پڑتا تھا۔ کابل سے بھی کسی امداد کی توقع نہ رہی تھی۔ پٹھان آپس میں لڑ لڑ کر اتنے بے بس ہو چکے تھے کہ ان کے لیے سکھوں کو دریائے سندھ سے ادھر روکنا مشکل ہو گیا تھا۔ اور سید احمد شہید کے باقی ماندہ مجاہدین ایسی بحثوں میں الجھ گئے تھے جن سے ملت کا انتشار اور بڑھ رہا تھا۔ الغرض ہندوستانی مسلمانوں کے لیے امید کے سب دروازے بند ہو چکے تھے۔ باہر سے کسی امداد کا امکان نہ تھا۔ اور خود اپنے بل بوتے پر جو کچھ ہو سکتا تھا وہ انہوں نے کر کے دیکھ لیا تھا ہاں ایک کونہ اور تھا جس سے شاہ محمد اسحاق کو امید کی شعاع نکلتی نظر آئی۔ اور آخر کار وہ اس روشنی کی طرف چل دیئے۔

واقعہ بالاکوٹ کے بعد گیارہ سال تک شاہ محمد اسحاق دہلی میں مقیم رہے۔ ۱۸۴۱ء میں آپ نے اپنے بھائی محمد یعقوب اور دوسرے متبعین اور متوسلین سمیت ہندوستان سے ہجرت فرمائی اور حرم محترم میں آباد ہو گئے۔ یہاں انہوں نے ترکی سلطنت سے اتصال پیدا کیا۔ ترکی سلطنت سے ہندوستانی اسلامی تحریک کا یہ تعلق بالکل نئی بات تھی۔ گو اس سے پہلے صدیوں سے جاز کے ساتھ مسلمانان ہند کے تعلقات قائم تھے۔ لیکن یہ تعلقات محض حج کے مراسم تک محدود تھے۔ شاہ اسحاق نے دہلی کے مرکز کو غیر مامون پا کر اور دوسرے تمام گوشوں سے ناامید ہو کر مکہ معظمہ میں ولی اللہی تحریک کے لیے پناہ کی جگہ ڈھونڈی۔ کیونکہ اول تو یہاں کسی غیر مسلم حکومت کا اثر نہیں تھا۔ دوم ہندوستانی مسلمان آسانی سے یہاں آ جاسکتے تھے۔ پھر مکہ معظمہ میں رہتے ہوئے ترکی سلطنت سے ربط ضبط قائم کیا جاسکتا تھا اور اس کی وجہ سے ولی اللہی تحریک پر وہابیت اور حنفی مذہب کے خلاف ہونے کے جو الزامات لگائے جاتے تھے وہ ناکام رہیں گے کیونکہ خود ترکی سلطنت کا مذہب حنفی تھا۔

یہ ابتدا ہے اسلامی ہند کی ولی اللہی تحریک اور دولت عثمانیہ کے تعلقات کی۔ شاہ محمد اسحاق اپنے بعد شاہ عبدالغنی اور شاہ احمد سعید کو دہلی میں اپنا نمائندہ مقرر کر گئے تھے۔ ۱۸۵۷ء میں غدر کا حادثہ ہوا تو ان دونوں نے اس میں شرکت کی اور شکست کے بعد یہ بھی مدینہ منورہ چلے گئے۔ حاجی امداد اللہ مولانا محمد قاسم، مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا محمد یعقوب، یہ سب بزرگ بھی اس ہنگامہ میں شریک ہوئے۔ حاجی صاحب تو نقل وطن کر کے حجاز چلے گئے اور مستقل طور پر انہوں نے مکہ معظمہ میں سکونت اختیار کر لی۔

ہنگامہ غدر کے فرو ہونے کے بعد ولی اللہی تحریک کے ارباب حل و عقد حجاز میں جمع ہوئے اور یہ تجویز کی گئی کہ ہندوستان میں از سر نو شاہ عبدالعزیز کے نمونے کا کوئی مدرسہ قائم کیا جائے۔ جو ولی

اللہی تحریک کا مرکز بن سکے۔ چنانچہ سقوطِ دہلی کے نو برس بعد ۱۸۶۶ء میں دہلی کے قرب میں دیوبند کے مقام پر مدرسہ کی بنا رکھی گئی۔ اس مدرسہ کا بنیادی خیال حاجی امداد اللہ نے مکہ معظمہ میں سوچا تھا۔ اور مولانا محمد قاسم سات سال مسلسل اس کوشش میں رہے کہ اپنے استاد اور مرشد کے خیال کو عمل میں لائیں۔ مدرسہ دیوبند کا نصاب تعلیم نظام عمل اور اساسی قواعد مولانا محمد قاسم نے مرتب کیے اور اس طرح انہوں نے شاہ عبدالعزیز کے مدرسہ اور ولی اللہی تحریک کے مقاصد کو دیوبندی نظام میں محفوظ کر دیا۔

”دیوبندی نظام“ کی تشریح کرتے ہوئے مولانا عبید اللہ لکھتے ہیں۔ جس دیوبندی جماعت کا تعارف ہم کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اس دہلوی جماعت کا دوسرا نام ہے۔ جو مولانا محمد اسحاق کی ہجرت کے بعد ان کے تبعین نے ان کی مالی اعانت اور ان کے افکار کی اشاعت کے لیے بنائی تھی۔ اس جماعت کی صدارت سب سے پہلے استاذِ اساتذہ الہند مولانا مملوک علی صدر مدرس دہلی کالج کے لیے مخصوص رہی۔ ان کے بعد مولانا محمد اسحاق نے مولانا امداد اللہ کو اس کام کے لیے مقرر کیا۔ اس جماعت کی مرکزی قوت (غدر کے بعد) دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ اور دہلی کے عوض دیوبند اور علی گڑھ دو مرکز بن گئے۔ مولانا محمد قاسم دہلی کالج کے عربی حصہ کو دیوبند لے گئے اور سر سید احمد خاں نے دہلی کالج کے انگریزی حصہ کو علی گڑھ پہنچا دیا۔ (سر سید اور مولانا محمد قاسم دونوں مولانا مملوک علی کے شاگرد تھے) کالج پارٹی انگریزی حکومت کے ساتھ پورے اشتراک کے بغیر اپنا کام شروع ہی نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے اس نے برٹش گورنمنٹ کی وفاداری کو اپنی سیاسی مصلحت کا جزو بنا لیا۔ مگر دیوبندی جماعت نے جو مولانا اسحاق کے زمانہ سے دولتِ عثمانیہ کو اپنا سیاسی رہنما مان چکی تھی، اضطراری حالت کے سوا حکومت سے کامل غیر جانبداری کو اپنا مسلک بنایا۔ لیکن یہ غیر جانبداری بھی اس وقت قطعاً ختم سمجھی جائے گی جب دولتِ عثمانیہ اور دولتِ برطانیہ میں لڑائی ٹھن جائے۔“

حسن اتفاق سے دیوبندی نظام کو بڑا فروغ نصیب ہوا اور ہزاروں کی تعداد میں مدرسہ دیوبند کے فارغ التحصیل علماء اطرافِ ہند میں پھیل گئے۔ اس کے علاوہ افغانستان، ترکستان اور حجاز و قازان تک دیوبندی سلسلہ کا فیض جا پہنچا۔ مدرسہ دیوبند کی تاریخ کا پہلا دور جو مولانا رشید احمد گنگوہی کی وفات مطابق ۱۹۰۵ء پر ختم ہوتا ہے صرف علمی تحریک کی توسیع اور مرکزی فکر کی حفاظت کے لیے مخصوص رہا۔ ان کے بعد مولانا شیخ الہند محمود حسن نے دیوبندی علماء کو ایک اجتماعی طاقت کی حیثیت سے منظم کرنا شروع کیا۔ اور اس ضمن میں آپ نے کالج پارٹی کے انقلابی عنصر کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔ مولانا شیخ الہند نے ایک طرف عربی پڑھے ہوئے دیوبندی علماء کو ایک نظام میں جمع کیا۔ تو دوسری طرف مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، ڈاکٹر انصاری اور انگریزی کالجوں کے فارغ التحصیل نوجوانوں سے

تصویرت پیدا کیے۔ اور ان کو زور دیا کہ وہ ہر اور پارٹی پر اور ہر اور افراد پر امام کی کراہت کریں۔ برسوں سے اسلامی ہمسوی میں علماء اور انگریزی ایلیٹ ہائوں میں دو افرقہ پیدا آنا تھا، مگر ہو جائے اور ملتِ اسلامیہ منظم ہو کر ایک قیادت کے ماتحت آزادی اسلام اور آزادی وطن کی طرف قدم بڑھائے۔

مولانا شیخ الہند کی یہ کوششیں جاری تھیں کہ ۱۹۱۳ء کی جنگِ عظیم شروع ہو گئی۔ اور انگریزوں کی طرف سے دولتِ عثمانیہ کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا گیا۔ طبعاً شیخ الہند کی جماعت نے انگریزوں کے خلاف ترکوں کی مدد کی۔ اس سلسلے میں ان کو اور ان کی جماعت کو سخت مصائب کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ اور دولتِ عثمانیہ کی شکست کے بعد ولی اللہی تحریک کا یہ رجحان کہ عالمِ اسلامی کی مدد کر کے یا ان سے مدد لے کر ہندوستان میں مسلمانوں کے قومی وجود کو تقویت دی جائے، ناقابل عمل ہو گیا۔ چنانچہ اس جماعت کو مجبوراً اپنا مسلک بدلنا پڑا۔ اور اس کو اسی میں مصلحت نظر آئی کہ اب جبکہ کوئی بین الاقوامی اسلامی مرکز نہیں رہا۔ اس لیے ہندوستان کی آزادی خواہ غیر مسلم جماعتوں کے ساتھ سیاسی تعاون کیا جائے۔ اور ان کے ساتھ مل کر ملک کو آزاد کرانے کی جدوجہد ہو۔ اس خیال کے تحت مولانا محمود حسن نے اپنی جماعت کو کانگریس میں شرکت کی اجازت دی۔ یہ ۱۹۲۰ء کا واقعہ ہے۔ اور یہاں سے اسلامی ہند کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔

ولی اللہی تحریک، آغاز کار سے اب تک جن ادوار سے گزر چکی ہے بے محل نہ ہوگا۔ اگر مولانا عبید اللہ کے الفاظ میں ان کو یہاں دہرایا جائے۔

حکیم الہند امام ولی اللہ نے ۵ مئی ۱۷۳۱ء کو ایک مستقل انقلابی تحریک شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ حکیم الہند نے اپنا نصب العین متعین کیا۔ اپنے پروگرام کی تدوین کی۔ جمعیت مرکزیہ بنائی اور اس کی شاخیں ملک میں قائم کی گئیں۔

یہ تحریک ولی اللہی کا پہلا دور ہے۔ اس میں تین امام ظاہر ہوئے۔ اور ایک حکومت موقتہ (PROVISIONAL GOVERNMENT) قائم ہوئی۔ جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔ امام ولی اللہ ۱۷۳۱ء تا ۱۷۶۳ء

۲۔ امام عبدالعزیز ۱۷۶۳ء تا ۱۸۲۳ء

۳۔ امام محمد اسحاق ۱۸۲۳ء تا ۱۸۶۶ء

موقتہ حکومت کے امیر شہید سید احمد ۱۸۲۳ء تا ۱۸۳۱ء

اس تحریک کا دوسرا دور امام محمد اسحاق نے ۱۸۳۱ء سے شروع کیا۔ آپ ۱۸۳۱ء تک دہلی میں

رہے اور ۱۸۳۶ء تک مکہ معظمہ میں۔ دہلی میں ان کے نائب مولانا مملوک علی تھے۔ ان کے بعد الامیر امداد اللہ نائب بنے۔ وہ بارہ برس یعنی ۱۸۵۷ء تک دہلی میں رہے۔ اس کے بعد مکہ معظمہ چلے گئے۔ ان کے پہلے نائب مولانا محمد قاسم ۱۸۷۹ء تک۔ پھر مولانا رشید احمد ۱۹۰۵ء تک اور شیخ الہند مولانا محمود حسن ۱۹۲۰ء تک۔

اس سال تحریک مذکور کا دوسرا دور ختم ہوا۔

تیسرے دور کو مولانا شیخ الہند نے ۱۹۲۰ء سے تھوڑا عرصہ پہلے شروع کیا تھا۔

انڈین نیشنل کانگریس

مولانا عبید اللہ سندھی نے آج سے تقریباً چالیس سال قبل تحریک اتحاد اسلام کے ایک سرگرم رکن کی حیثیت سے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز کیا تھا اور اس سلسلے میں آپ کو بڑی جان جوکھوں کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ آپ گھر سے بے گھر ہوئے۔ عزیز واقارب کو چھوڑا۔ پچیس برس تک جلا وطنی کی مصیبتیں برداشت کیں۔ ملکوں ملکوں میں مارے پھرے۔ حد درجہ کی ذہنی کوفتیں اور معاشی پریشانیاں اٹھانی پڑیں۔ دل توڑنے والی ناکامیاں دیکھیں۔ الغرض اس طویل مدت میں مولانا کو زندگی کے بڑے بڑے نشیب و فراز سے گزرنا پڑا۔ آپ نے اپنی آنکھوں کے سامنے عظیم الشان سلطنتوں کو مٹتے دیکھا۔ اور ان کی جگہ نئی نئی سیاسی تحریکوں کو برسر اقتدار ہوتے پایا۔ اس دوران میں مولانا نے اسلامی ممالک کی سیاسیات پر بھی پورا عبور حاصل کیا۔ اور ان ملکوں میں رہ کر وہاں کی بسنے والی مسلمان قوموں کے مزاج اور رجحانات کو خوب سمجھا۔ حسن اتفاق سے مولانا کو اس ضمن میں ایسے افراد اور ایسی جماعتوں سے ملنے اور ان کے ساتھ کام کرنے کا بھی موقع ملا جو بین الاقوامی سیاست کو خوب سمجھتی تھیں۔ اور ان معاملات میں دنیائے سیاست میں بڑی ممتاز حیثیت رکھتی تھیں۔ خود مولانا کے اپنے الفاظ میں ”میں ایسے زمانہ میں ہندوستان سے باہر رہا ہوں جسے دور انقلاب کہنا چاہیے۔ بڑی بڑی سلطنتیں فنا کے گھاٹ اتاری جا رہی تھیں اور ان کی جگہ قوم کے بہادروں کا جو دستہ عمر بھر مصیبتوں میں مبتلا رہا، اب پارٹی پالیسی کے اصول پر اپنی مختصر جماعت کے زور پر نئی حکومتیں بنا رہا تھا۔ ایسے زمانہ میں نئے اور پرانے چوٹی کے سیاستمداروں سے ملنے کا موقع ملتا رہا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم عالمگیر انقلاب کی حقیقت اور اس کے سالہا سال کی ذہنی تربیت اور پھر خود مولانا کی اپنی طبعی ذہانت اور ان کا غیر معمولی فکر و تدبیر۔ یہ پس منظر ہے مولانا کے سیاسی عقائد اور مقاصد کا جو اس وقت وہ اپنی قوم کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔

اپنے سیاسی میلان کے ارتقاء کے متعلق مولانا لکھتے ہیں: ”اسلام لانے کے بعد دوران مطالعہ میں مولانا اسماعیل شہید کی سوانح عمری دیکھی۔ اسلامی مطالعہ کی ابتدا سے میرا قلبی تعلق شاہ صاحب ۳ جون ۱۹۳۹ء کو علماء صوبہ بنگال کے اجتماع منعقدہ کلکتہ میں مولانا کا خطبہ صدارت۔ یہ مولانا کا پہلا خطبہ

ہے۔ جو موصوف نے وطن میں واپس آنے کے بعد ایک اجتماع عام میں پڑھا۔

www.KitaboSunnat.com

سے پیدا ہو چکا تھا۔ دیوبند کی طالب علمی نے بہت سے واقعات اور حکایات سے آشنا کر دیا تھا۔ مولانا عبدالکریم دیوبندی نے سقوطِ دہلی کی تاریخ خود اپنی آنکھوں دیکھی بتائی تھی۔ میرا دماغ بچپن سے خاندانی عورتوں کی صحبت میں انقلابِ پنجاب کے تکلیف دہ حالات سے بھرا ہوا تھا۔ اس میں ایک قسم کا انقلاب آیا پہلے جو کچھ لاہور کے لیے سوچتا تھا اب دہلی کے لیے سوچنے لگا۔ شاہ اسماعیل کے مکتوبات میں سے ایک مضمون لے کر میں نے اپنا سیاسی پروگرام بنالیا۔ وہ اسلامی بھی تھا اور انقلابی بھی۔ مگر ہندوستان سے باہر کے مسلمانوں کی تحریک سے اسے کوئی تعلق نہ تھا۔ میں نے حجۃ اللہ البالغہ پڑھنے والی جماعت کو اس میں شامل کر لیا۔ اس طرح اپنے خیالات کے موافق آہستہ آہستہ کام شروع کر دیا۔“

انہی دنوں مولانا اپنے استاد شیخ الہند مولانا محمود حسن کی زیارت کے لیے سندھ سے دیوبند (۱۳۱۵ھ) تشریف لے گئے۔ مولانا لکھتے ہیں کہ میں ”دور سارے لکھ کر ساتھ لے گیا۔ ایک علم الحدیث اور دوسرا فقہ حنفی پر۔ حضرت مولانا نے دونوں رسالے پسند فرمائے۔ بعض مسائل جہاد کے ضمن میں ہماری جماعت کا ذکر آ گیا۔ حضرت مولانا نے اسے بہت پسند فرمایا۔ اور چند اصلاحات کا مشورہ دے کر اس کو اتحاد اسلام کی ایک کڑی بنا دیا۔ آپ نے اس کام کے جاری رکھنے کی وصیت کی۔ اس کے بعد میرے تعلیمی اور سیاسی تمام مشاغل حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہ سے وابستہ ہو گئے۔“

جس زمانے کی یہ بات ہے۔ اُس زمانے میں دیوبندی جماعت تو حضرت شاہ محمد اسحاق کے تتبع میں دولت عثمانیہ کو اپنا سیاسی رہنما مانتی ہی تھی۔ ان کے علاوہ عوام مسلمانوں کی بھی نظریں قسطنطنیہ کے اسلامی مرکز کی طرف لگی رہتی ہیں۔ سرسید نے علی گڑھ کالج بنایا۔ تو طلبہ کے لیے ترکوں کا لباس اختیار کیا گیا۔ اس کے بعد مولانا شبلی دولت عثمانیہ کے ”دار الخلافت“ استنبول میں تشریف لے گئے۔ اور واپسی پر انہوں نے جو سفر نامہ لکھا، اس کا ملک میں خوب چرچا ہوا۔ اس وقت دنیائے اسلام بڑے نازک دور میں سے گزر رہی تھی۔ مصر پر برطانیہ قابض ہو چکا تھا۔ اور وہ فلسطین عراق اور جزیرہ عرب کو اپنے اثر میں لانے کے لیے کوشاں تھا۔ فرانس شمالی افریقہ کے ساحلی ملکوں پر چھا رہا تھا۔ روس خاص قسطنطنیہ کو ہتھیانا چاہتا تھا۔ چنانچہ وہ آئے دن کسی نہ کسی بہانے سے ترکوں سے لڑائی چھیڑ دیتا۔ ہندوستان کے مسلمانوں میں مسیحی دنیا کی ان یلغاروں کے خلاف بڑی برہمی پھیل رہی تھی۔ اور یہ خیال عام ہو چکا تھا کہ یورپ کے مقابلے کے لیے ساری دنیا کے مسلمانوں کو ایک ہونا چاہیے۔ اتفاق سے اس وقت سلطان عبدالحمید برسر اقتدار تھے۔ ان کے سیاسی تدبیر نے ترکی سلطنت کو بچانے کی صرف یہی صورت دیکھی کہ اتحاد اسلام کی تحریک کو مضبوط کیا جائے تاکہ برطانیہ اور روس باقی ماندہ اسلامی ملکوں کی آزادی کو سلب کرنے سے رک جائیں۔ اور مسیحیت کے خلاف تمام عالم اسلام کا متحدہ محاذ بن جائے۔

اسلامی ہند کا یہ بڑا ہنگامہ خیز دور تھا۔ ایک طرف مسلمانوں کا انگریزی پڑھا ہوا نوجوان طبقہ برطانوی اقتدار کے سحر سے نکل رہا تھا۔ علی گڑھ جو ایک زمانے میں برطانیہ پرستی کا مرکز تھا اب وہاں برطانیہ سے بغاوت کے جراثیم پیدا ہو چکے تھے۔ نیز کانگریس تحریک آہستہ آہستہ زور پکڑ رہی تھی اور تقسیم بنگال کے معاملے میں ہندوؤں نے حکومت کا جس عزم و جرأت سے مقابلہ کیا تھا اس کی دیکھا دیکھی مسلمان نوجوانوں میں بھی بغاوت کے جذبات بھڑک اٹھے تھے۔ دوسری طرف عالم اسلام پر جو مصائب ٹوٹ پڑے تھے ان کی وجہ سے ہندوستانی مسلمانوں میں بڑی بے چینی پھیل رہی تھی۔ مولانا شبلی اور ڈاکٹر اقبال کی بعض مشہور نظمیں اس عہد کی یادگار ہیں اور ان میں ہندوستانی مسلمانوں کے اس وقت کے غم و غصہ، سوز و گداز اور حسرت و مایوسی کی پوری ترجمانی کی گئی ہے۔

اسی زمانہ میں اٹلی نے طرابلس پر دھاوا بول دیا۔ اس کے کچھ عرصے بعد بلقان کی عیسائی ریاستوں نے ترکوں کو یورپ سے نکالنے کی مہم شروع کر دی۔ ہندوستانی مسلمانوں کے جوش و خروش کا اس وقت عجیب عالم تھا۔ ترکوں کی امداد کے سلسلے میں چندے جمع ہوئے۔ ترکی کو طبی و فنڈ بھیجے گئے۔ اخبارات کے صفحات، مقررہ کی تقریریں، واعظوں کے وعظ اور شاعروں کی نظمیں ترکوں کے لیے وقف ہو گئیں۔ اور اسلامی ہند کی فضا طرابلس اور بلقان کے ہنگاموں سے گونج اٹھی اور یہاں کے مسلمانوں کو ترکوں سے اتنی ہمدردی ہو گئی کہ نواب وقار الملک مرحوم ایسے سنجیدہ اور متین بزرگ بھی جو سرسید کے دور سے تعلق رکھتے تھے اور ان کے ساتھیوں میں موصوف کی ممتاز حیثیت تھی اس پر آمادہ ہو گئے کہ علی گڑھ یونیورسٹی کے لیے جو روپیہ جمع کیا گیا ہے، اگر انگریزی حکومت یونیورسٹی کے قیام میں مانع ہو تو یہ رقم ترکوں کو بھیج دی جائے۔

ہندوستانی مسلمانوں کی اس ترک دوستی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس وقت ان کے خیال میں اگر ترکی کی سلطنت بچ گئی تو اسلامی ہند کو تقویت اور استحکام میں اس سے بڑی مدد ملی۔ اس عہد کی اسلامی قیادت ہندوستان کے قومی معاملات سے بالکل بے نیاز نہ تھی لیکن وہ سمجھتے تھے کہ اسلام کی بین الاقوامی طاقت کی موجودگی میں ان کو اپنے ملک میں آزادی اور عزت حاصل کرنے میں بڑی آسانی ہوگی۔ ہندوستانی مسلمانوں کی اس سیاسی بیداری میں اب تک دو الگ الگ جماعتیں کام کر رہی تھیں۔ ایک جماعت کی قیادت مولانا محمد علی، مولانا ابوالکلام، حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری وغیرہ فرما رہے تھے۔ اور دوسری جماعت علماء دیوبند کی تھی۔

مولانا محمود حسن ۱۹۰۵ء میں مدرسہ دیوبند کے سرپرست بنے۔ آپ نے تقریباً چار سال بعد مولانا عبید اللہ کو دیوبند طلب فرمایا اور مفصل حالات سن کر دیوبند میں رہ کر کام کرنے کا حکم دیا۔ اس سال

جمعیت الانصار کا قیام عمل میں آیا۔ اور مولانا عبید اللہ اس کے ناظم اعلیٰ مقرر کیے گئے۔ اس جمعیت کے اور مقاصد کے علاوہ ایک مقصد یہ بھی تھا کہ علی گڑھ کالج کے طلبہ دارالعلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کرنا چاہیں تو ان کے لیے آسانیاں بہم کی جائیں اور دیوبند کے فارغ التحصیل طلبہ انگریزی پڑھنا چاہیں تو علی گڑھ میں ان کے لیے انتظام ہو۔ دراصل یہ تمہیدی علی گڑھ اور دیوبندی تحریکوں کی آپس کی منافرت دور کرنے کی۔ جمعیت الانصار کا حلقہ اثر بہت کافی وسیع ہو گیا۔ چنانچہ اس کے ایک جلسہ میں مدرسہ دیوبند کے فارغ التحصیل طلبہ کی دستار بندی بھی ہوئی تھی، ہندوستان کے ہر گوشہ سے تقریباً تیس ہزار علماء شریک ہوئے۔

طرابلس اور بلقان کے خونیں حوادث کا جو اثر مسلمانوں کے انگریزی پڑھے ہوئے طباقوں پر ہوا اس کا ذکر ابھی ہو چکا ہے۔ دیوبندی جماعت نے بھی ترکوں کی اس مصیبت میں بڑی مدد کی۔ حضرت شیخ الہند نے ترکوں کی امداد کے لیے فتوے چھپوائے۔ مدرسے کو بند کر دیا۔ طلبہ کے وفود اطراف ملک میں بھیجے۔ خود بھی ایک وفد کے ساتھ نکلے۔ چندے کیے۔ اور ایک اچھی خاصی رقم اعانت کے طور پر ترکی بھجوائی۔

اسلامی ہند کی سیاست پر حضرت شیخ الہند کی ذات گرامی کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ ان کی مساعی سے علی گڑھ اور دیوبند والے ایک سیاسی پلیٹ فارم پر جمع ہوئے۔ اور دونوں مرکزوں کے حریت خواہ افراد نے مل کر اسلامی ہند کی متحدہ قیادت کی بنا ڈالی۔ ۱۹۱۳ء کی جنگ عظیم سے کچھ عرصے پہلے ہی یہ دونوں جماعتیں مل کر کام کرنے لگی تھیں۔ جنگ شروع ہوئی تو اس قیادت نے عثمانی خلافت کو مدد دینے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ اس تجویز کے مطابق مولانا عبید اللہ کا بل پہنچے۔ اس پر حضرت شیخ الہند کو حجاز میں گرفتار کر کے مالٹا بھیج دیا گیا۔ مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی اور مولانا ابوالکلام آزاد ہندوستان میں نظر بند کر دیئے گئے۔ ان کے علاوہ بعض دوسرے زعماء بھی مصائب کا شکار ہوئے۔

۱۹۱۸ء میں جنگ ختم ہوئی تو اس کے ساتھ اسلام کی بین الاقوامی طاقت یعنی ترکی خلافت بھی تقریباً ناپید ہو گئی۔ اب اسلامی ہند کی قیادت مجبور تھی کہ اپنے لیے کوئی نیا سیاسی پروگرام وضع کرے۔ اس سے پہلے یہ لوگ ترکی خلافت کو مضبوط کر کے اپنے لیے اس ملک میں قومی عزت اور آزادی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اب حالات بدل گئے تھے۔ قسطنطنیہ پر اتحادیوں کا قبضہ تھا۔ خلیفہ دوسرے کے ہاتھوں میں اسیر تھا۔ اس وقت ہمارے زعماء کو خود اپنے آپ کی اور ترکوں کی مدد کرنے کی صرف ایک ہی سبیل نظر آئی۔ اور وہ یہ تھی کہ ہم خود اپنے ملک کے اندر اس طاقت کو زک دیں جس طاقت نے ترکوں کو پامال کیا ہے اور اس کے لیے لابدی تھا کہ ملک کی دوسری سیاسی جماعتوں سے تعاون کیا جاتا۔ چنانچہ

مولانا محمود حسن، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی، ڈاکٹر انصاری اور حکیم اجمل خاں اور ان کی جماعت نے کانگریس میں شرکت فرمائی۔ اور اسلامی ہند کا یہ نصب العین بنا کہ ہندو اور مسلمان مل کر اس ملک کو آزاد کرائیں اور اگر یہ ملک آزاد ہو گیا یا ہندو مسلمانوں کی مشترکہ جدوجہد سے حکمران طاقت کو نقصان پہنچا تو لامحالہ اس کا اثر عراق، فلسطین، حجاز، شام، مصر، ایران اور ترکی پر پڑے گا۔ اور لازمی طور پر ان اسلامی ملکوں سے برطانوی سامراج کا جنگل کچھ نہ کچھ ضرور ڈھیلا ہوگا اور اس طرح ہم ایک طرف تو خود اپنی اپنی قوم کی اور اپنے ملک کی خدمت کریں گے۔ اور دوسری طرف ہماری اس جدوجہد سے اسلامی دنیا کو فائدہ پہنچے گا۔ یہ نظریہ تھا جس کے ماتحت ہمارے ان جلیل القدر رہنماؤں نے کانگریس میں شرکت کی اور یہ اپنی قوم کو کانگریس میں لے گئے۔ مختصر الفاظ میں ۱۹۲۰ء سے پہلے اسلامی ہند کی قیادت کے پیش نظر یہ تھا کہ اسلام کے بین الاقوامی مرکز کو مستحکم کر کے ہندوستان کے مسلمانوں کے قومی وجود کو سر بلندی دی جائے۔ اب جب کہ کوئی بین الاقوامی اسلامی مرکز نہ رہا تھا تو طے یہ پایا کہ ہندوستان کو آزاد کر کے اسلامی ملکوں سے سامراج کی گرفت کو ڈھیلا کیا جائے۔ اس لیے ضروری تھا کہ ہندوؤں سے سیاسی تعاون ہوتا اور دونوں قومیں مل کر برطانیہ سے ٹکر لیتیں۔

مولانا عبید اللہ سندھی دیوبندی اس سیاسی تحریک اور اس کے ذہنی مرکز کے ترجمان ہیں۔ وہ شروع ہی سے اس خیال کے حامی رہے ہیں کہ دیوبندیوں کو کانگریس پارٹی یعنی انگریزی پڑھے ہوئے مسلمانوں کے ساتھ مل کر کام کرنا چاہیے۔ موصوف دیوبند اور علی گڑھ کی متحدہ قیادت کے قائل ہیں اور چاہتے ہیں کہ جس سیاسی فکر کی طرح ۱۹۰۹ء۔ ۱۹۱۰ء میں شیخ الہند اور مولانا محمد علی نے ڈالی تھی۔ ہندوستانی مسلمان اسی کو اپنے لیے شمع راہ بنا لیں۔ اور دیوبند اور کانگریس پارٹی کے حریت خواہ طبقے مل کر اسلامی ہندوستان کی رہنمائی کریں۔

ایک طرف ہندوستانی مسلمانوں کے یہ دو گروہ سیاسی جدوجہد میں ایک دوسرے کے ساتھ شریک ہوں اور دوسری طرف اسلامی ہند کی یہ متحدہ طاقت ہندوؤں کی سیاسی جماعت سے تعاون کرے۔ مولانا کے نزدیک یہ پیغام تھا۔ حضرت شیخ الہند مرحوم کا۔ ان کے خیال میں اس میں ہندوستان کے مسلمانوں کا بھی بھلا ہے۔ اور دنیائے اسلام کو بھی ہمارے اس سیاسی مسلک سے بڑے فوائد پہنچیں گے۔ دیوبندی سیاسی تحریک کیا ہے؟ اور حضرت شیخ الہند نے اپنی زندگی کے آخری لمحات میں اس تحریک کو کیا شکل دی۔ اس کی ایک جھلک خود مولانا کے اپنے الفاظ میں ملاحظہ کیجئے۔

”دہلی کے مسلمان لیڈر ۱۸۵۷ء کے بعد دوسری سیاسی جماعتوں میں تقسیم ہو گئے۔

کوآپریٹو اور نان کوآپریٹو۔ پہلی جماعت کے لیڈر سر سید احمد خاں ہیں۔ علی گڑھ

اجمل خاں کے ساتھ مٹی ہوئی دہلی کا ایک نشان تھے۔

یوں بھی ۱۹۲۰ء سے بہت پہلے ہندوستان کے اندرونی حالات کچھ اس طرح بدل رہے تھے کہ ہندو اور مسلمانوں کی ترقی پسند جماعتیں ایک دوسرے کے قریب آنے لگی تھیں۔ ۱۹۱۵ء سے تو مسلم لیگ اور کانگریس کے اجلاس بھی ساتھ ساتھ ہونے لگے۔ اور ایک زمانہ ایسا آیا کہ مسلم لیگ کانگریس کی حامی اور کسی قدر اس کے آگے ہی آگے رہنے لگی۔ تا آنکہ ۱۹۲۰ء کا ہنگامہ پروردور آیا۔ اور مولانا محمد علی کے الفاظ میں ”اس وقت ہم نے مسلمانوں کو کانگریس کی شرکت کے لیے آمادہ کیا۔ ہندو اکثریت کے ساتھ مسلمان اقلیت کا اتحاد کرایا اور انہیں اس پر راضی کیا کہ ۱۸۸۷ء میں جو سیاسی پالیسی مسلمانوں کی اقلیت کے حقوق کے تحفظ کے لیے سرسید احمد خاں رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ہندو اکثریت کی ذہنیت سے مجبور ہو کر اختیار کی تھی۔ اس کو بدل دیا جائے اور ہندو اور مسلمان اکثریت اور اقلیت دونوں مل کر انگریزی اقلیت کے استبداد کا خاتمہ کرے۔“..... مسلمانوں کے اس فیصلہ میں جیسا کہ ہم ابھی بیان کر آئے ہیں، مولانا محمد علی کی جماعت کے ساتھ ساتھ حضرت شیخ الہند اور ان کے متبعین بھی شریک تھے۔

اس کے علاوہ ہندوستان سے باہر جو اسلامی ممالک تھے۔ نیز جنگ عظیم کے بعد بین الاقوامی سیاست نے جس طرح پلٹا کھایا تھا۔ یہ سب باتیں اس امر کی تائید میں تھیں کہ ہندوستان کے مسلمان ہندوؤں کے ساتھ مل کر اپنے ملک میں برطانوی اقتدار کو نابود یا کم سے کم اسے کمزور کرنے میں جدوجہد کریں۔ افغانستان، ایران، ممالک عربیہ، مصر، ترکی اور بالشویک روس کا اس وقت مفاد یہ تھا کہ برطانیہ کے سامراج کو جس طرح بھی ہو اور جہاں بھی ہو، ہڈی پھینچے۔ تاکہ ان ملکوں کی طرف سے اس کی توجہ کچھ ہٹ سکے۔ اسی سلسلے میں مولانا فرماتے ہیں کہ ”۱۹۱۵ء میں ہندوستان سے ہجرت کر کے کابل پہنچا۔ اور سات سال تک حکومت کابل کی شرکت میں اپنا ہندوستانی کام کرتا رہا۔ ۱۹۱۶ء میں امیر حبیب اللہ خاں فرماں روئے افغانستان نے ہندوؤں سے مل کر کام کرنے کا حکم دیا۔ اس کی تعمیل میرے لیے فقط ایک ہی صورت میں ممکن تھی کہ میں انڈیشن نیشنل کانگریس میں شامل ہو جاؤں۔ اس وقت سے میں کانگریس کا ایک داعی بن گیا۔“

مولانا لکھتے ہیں کہ ”یہ بات عجیب معلوم ہوگی کہ امیر صاحب مرحوم اتحاد اسلام کے کام سے ہندوستانی کام کو زیادہ پسند کرتے تھے۔ ۱۹۲۲ء میں امیر امان اللہ کے دور میں میں نے کانگریس کمیٹی کابل بنائی۔ جس کا الحاق ڈاکٹر انصاری کی کوششوں سے کانگریس کے گیسٹیشن میں منظور کر لیا گیا۔ برٹش ایمپائر سے باہر یہ پہلی کانگریس کمیٹی ہے اور میں اس پر فخر محسوس کرتا ہوں کہ میں اس کا پہلا پریزیڈنٹ ہوں۔“

یونیورسٹی ان کی مرکزی تعلیم گاہ ہے۔ دوسری جماعت کے پیشوا مولانا محمد قاسم دیوبندی ہیں۔ دارالعلوم دیوبند ان کا علمی اور سیاسی مرکز رہا۔ دیوبندی اسکول ہند کو کیا سمجھتا ہے۔ اس کے لیے بختہ المرجان نام کی عربی تاریخ ہند پڑھیے۔ قدیم مذاہب ہند کے متعلق ان کے نظریات مرزا مظہر جان جاناں اور امام عبدالعزیز دہلوی کے مکتوبات میں ملیں گے۔“

”میں ان کی ترجمانی مختصر الفاظ میں یہاں کرتا ہوں۔ ہمارا ہندوستان دنیا کی تاریخ میں عظیم الشان رفعت کا مالک ہے۔ پہلے دور میں اس نے سنسکرت ایسی زبان پیدا کی۔ کلیلہ و منہ جیسی حکمت کی کتاب لکھی۔ فوجی ترین کا کھیل شطرنج ایجاد کیا۔ ریاضی میں یونان کا ہمسر بنا۔ الہیات میں ویدانت فلاسفی سکھانے میں ”جگت گرد“ بنا۔ اس سے ویدک دھرم اور بدھ دھرم دنیا میں پھیلے۔ اس نے مہاراجہ اشوک جیسے حکمران پیدا کیے۔ دوسرے دور میں قدیم انسانیت کی علمبردار سوسائٹی کو اسلام جیسی انٹرنیشنل پروگرام سے آشنا کرنے والا جلال الدین اکبر پیدا کیا۔ مشرقی ایشیا کی زبانوں کو ملا کر اردو جیسی انٹرنیشنل زبان پیدا کی۔ محی الدین عالمگیر جیسا سلطان پیدا کیا جو تمام ممالک ہند کو ایک قانون کا پابند بنا سکا کیا۔ امام ولی اللہ جیسا فلاسفر پیدا کیا۔“

”تاریخ کے دونوں زمانوں میں ہمارے ملک کی اس طرح ہتک نہیں ہو سکی کہ کوئی قوم باہر بیٹھ کر ہم پر حکومت کرے۔ لیکن جب دہلی پر برطانوی قبضہ ہوا۔ ہمارے ملک کے نورانی چہرہ پر غلامی کا سیاہ داغ لگ گیا۔ دیوبندی اسکول کا نصب العین یہ ہے کہ اس دھبہ کو دور کرنے کی جدوجہد کی جائے۔ یہ اسکول اب تک تین دفعہ اپنے پروگرام میں مناسب وقت تبدیل کر چکا ہے۔ یورپ کی آج کل کی سائنٹیفک اصطلاح میں اس سیاسی گروپ کو ایک سیاسی پارٹی نہ کہا جائے تو ہم اسے تسلیم کرتے ہیں۔ مگر ملک میں اس کی قوت اور طاقت کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اور خلافت تحریک میں اس کا مظاہرہ ہو چکا ہے۔“

دیوبندی اور کالج پارٹی کے اتحاد کے ذکر میں مولانا فرماتے ہیں۔ ”لوگوں کو شاید یہ معلوم نہ ہو کہ حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری بھی میرے استاد کی جماعت سے تعلق رکھتے تھے۔ مولانا محمد علی کو ڈاکٹر انصاری نے شیخ الہند سے ملایا۔ اس کے بعد شیخ الہند نے اپنی جماعت کو مولانا محمد علی کے تابع کر دیا۔ اس دن سے مولانا محمد علی مسلمانان ہند کے واحد لیڈر بنے اور دہلی کے دونوں اسکول مل کر ایک ہو گئے۔ اس متحدہ طاقت نے کانگریس کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ اس کے اندر مرکزی فکر اسی نان کو اپریٹر دیوبندی اسکول کا غالب رہا۔ اس مجمع میں مولانا ابوالکلام کی شخصیت مستقل حیثیت رکھتی تھی۔ جو حکیم

کابل سے مولانا سندھی روس گئے۔ وہاں کانگریس کے ایک رکن کی حیثیت سے آپ کا تعارف ہوا۔ اس بنا پر سوویت روس نے آپ کو معزز مہمان بنایا اور مطالعہ کے لیے ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائیں۔ روس سے آپ ترکی تشریف لے گئے۔ اس وقت ترکی میں اور اسلامی ممالک کی طرح اتحاد اسلام والا گروہ مقہور ہو چکا تھا۔ اور اس گروہ کے افراد کو شک و شبہ کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ مولانا اب ہندوستان کی آزادی چاہنے والی قومی جماعت سے متعلق تھے۔ اور یہی وجہ تھی کہ آپ کو ترکی میں پناہ مل گئی۔ ترکی سے آپ حجاز گئے تو وہاں کی حکومت سے بھی اپنا تعارف ایک کانگریسی کی حیثیت سے کرایا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ حجاز کی سعودی حکومت کے بارے میں اس وقت ہندوستانی مسلمانوں میں جو ناخوش گوار بحثیں چھڑ رہی تھیں۔ مولانا ان میں غیر جانب دار تسلیم کر لیے گئے اور آپ کو دیار مقدس میں قیام کی اجازت مل گئی۔

الغرض اس زمانے میں ہندوستان کی داخلی ضروریات اسلامی ممالک کے مجموعی مفاد اور بین الاقوامی سیاسیات سب اس امر کی متقاضی تھیں کہ ہندو اور مسلمان مل کر برطانیہ کے خلاف ملکی آزادی کے لیے جدوجہد کریں۔ اور اس میں شک نہیں کہ مسلمان اس معاملے میں کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ مولانا محمد علی اس ضمن میں لکھتے ہیں کہ ”حکام پرست مسلمان بے شک ہمارے ساتھ نہ تھے۔ لیکن حکام پرست ہندو بھی گاندھی جی کے ساتھ نہ تھے۔ مسلمانوں نے اپنی سیاسی اہلیت اور استعداد سے ثابت کر دیا کہ ہندوستان کی قومی سیاست میں ان کا حصہ ان کی آبادی کے تناسب سے کہیں زیادہ رہے گا۔ اور ان کی قربانیوں نے بھی ثابت کر دیا کہ قوم پروری میں وہ ہندوؤں سے کم نہیں کچھ زیادہ ہی ہیں۔“

اس سب بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ ۱۹۲۰ء میں مسلمانوں کا کانگریس میں شریک ہونا کسی غلط بینی یا جلد بازی کا نتیجہ نہ تھا۔ اسلامی ہند کے سیاسی ارتقاء کی یہ ایک مستقل منزل تھی۔ اب اس منزل سے پیچھے ہٹنا یا اس کے متعلق تذبذب کی پالیسی اختیار کرنا مولانا کے خیال میں سیاسی تدبیر کی دلیل نہیں بلکہ اس کا سبب ہماری خام کاری ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ ان کے اور دیوبندی جماعت کے مرشد و سرپرست حضرت شیخ الہند مرحوم تین چیزیں بتا گئے تھے۔ ایک یہ کہ دیوبندی اور علی گڑھ پارٹی مل کر کام کرے۔ دوسرے یہ کہ انڈین نیشنل کانگریس میں شرکت کی جائے اور بیرونی ممالک اسلامیہ کی سیاست سے علیحدگی اختیار کی جائے اور تیسری چیز جو سب سے اہم تھی۔ وہ یہ ہے کہ دیوبندی جماعت شاہ ولی اللہ کے فلسفہ اور مولانا محمد قاسم کی حکمت کو علمی زندگی کا اساس بنائے۔

یہ حالات اور اسباب ہیں جن کی بنا پر مولانا ہر مجلس میں پوری جرأت اور یقین کے ساتھ فرماتے رہتے ہیں ”مجھے نیشنل کانگریس سے محبت ہے۔ چونکہ دنیا کی نظر میں وہ ہمارے ملک کی معزز

سیاسی مجلس ہے۔ میں سولہ سترہ برس کانگریس میں کام کرتا رہا ہوں۔“ تین جون ۱۹۳۹ء کو کلکتہ میں علماء کو مخاطب کرتے ہوئے آپ نے فرمایا ”اس مقصد کی تکمیل میرے خیال میں اس صورت کے سوا ہو ہی نہیں سکتی کہ انڈین نیشنل کانگریس کو تمام سیاسیات ہند کا مرکز بنا دیا جائے۔ اس کے علاوہ ہر خطبہ میں ہر مجلس میں اور ہر بیان میں مولانا بار بار اسی حقیقت کو دہراتے ہیں کہ مسلمانوں کا اور ہندوستان کا فائدہ اسی میں ہے کہ ہندو اور مسلمان مل کر سیاسی جدوجہد کریں۔ اور کانگریس تمام اہل ہند کی صحیح نمائندہ بن جائے۔“

لیکن تعجب یہ ہے کہ اصولاً کانگریس کے اس قدر زبردست حامی ہونے کے باوجود مولانا اب تک کانگریس کے باقاعدہ رکن نہیں ہیں۔ آپ کا کہنا یہ ہے کہ ”میں کانگریسی ہوں۔ نیشنل کانگریس میری ہے۔ لیکن اس کے باوجود میں اب تک کانگریس کا پرائمری ممبر بھی نہیں بنا۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنے مشورے لوگوں کو آزادی سے سنا سکوں۔ کسی اصطلاحی قانون کی پابندی نہ کرنے سے میں کانگریس سے علیحدہ نہیں ہو سکتا۔“

دراصل بات یہ ہے کہ مولانا اس سیاسی مسلک کے تو حامی ہیں کہ ہندوستان کی صرف ایک ہی سیاسی جماعت ہو سکتی ہے۔ ان کے خیال میں یہ جماعت بلا تیز مذہب و ملت سب کی سیاسی نمائندگی کرے۔ ہندوؤں کی بھی، مسلمانوں کی بھی۔ اور دوسری جماعتوں کی بھی۔ اس جماعت کا کام ہندوستان کو غیروں کے قبضہ سے آزاد کرانا ہو۔ اتنے بڑے براعظم کی آبادی کے مختلف حصوں میں صلح و آشتی قائم کرنا ہو۔ یہ جماعت کل ہندوستان کی سیاست اور معیشت کے متعلق جملہ معاملات کو جو اندرون ملک سے وابستہ ہوں، ایک اسلوب فکر پر منظم کرے تاکہ یہ نہ ہو کہ ایک حصہ ملک میں تو ایک سیاسی اور معاشی نظام پر عمل ہو رہا ہو اور ساتھ کے علاقہ میں کوئی دوسرا نظام برسر اقتدار ہو۔ لازمی طور پر اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک حصہ ملک کی دوسرے حصہ سے برابر چپقلش رہے گی۔ اور اس کی وجہ سے اندرون ملک میں یک جہتی اور امن قائم نہ ہو سکے گا۔ لیکن ان سب باتوں سے بھی اہم تو یہ امر ہے کہ بیرونی دنیا میں ہندوستان کی صرف ایک آواز ہو جو صحیح معنوں میں تمام اہل ملک کی ترجمانی کا حق رکھتی ہو نیز بین الاقوامی معاملات طے کرنے کے لیے جہاں کہیں دنیا کی سلطنتیں جمع ہوں وہاں ایک ایسی جماعت ہونی چاہیے جو کل ہندوستان کی نمائندہ ہو، خدا نخواستہ اگر ہندوستان کے ہر سیاسی گروہ نے یہ کوشش کی کہ اقوام عالم کی بڑی برادری میں اس کو بھی مستقل جگہ دے جائے تو اس سے ہندوستانیوں کو سوائے ذلت و منافرت اور آخر کار کسی دوسری قوم کی غلامی کے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ یہ وجوہ ہیں جو ہم اہل ہند کو مجبور کرتے ہیں کہ ہماری سیاسیات کا ایک اور صرف ایک مرکز ہو۔ اور ظاہر ہے یہ مرکز صرف

کانگریس ہی ہو سکتا ہے۔ مولانا اس بنا پر کانگریسی ہیں اور اپنے متعلق ہمیشہ ہمیشہ کانگریس میں رہنے کا فیصلہ فرما چکے ہیں۔

لیکن کانگریس کے اس سیاسی تصور سے پوری طرح متفق ہونے کے باوجود مولانا سندھی جیسا کہ ابھی بیان ہو چکا ہے۔ کانگریس کے موجودہ نظام میں منسلک نہیں ہیں اور جب تک کانگریسی قیادت اپنی موجودہ روش پر قائم ہے وہ اس میں شامل ہونے کا ارادہ بھی نہیں رکھتے۔ مولانا کو کانگریس کی قیادت سے کیا شکایت ہے اور ان کے خیال میں موجودہ قیادت سے مسلمانوں کو کیا نقصان پہنچا اور آئندہ چل کر کیا نقصانات پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ ان کی تفصیلات وہ بڑی شرح و بسط سے ہر مجلس میں بیان فرماتے ہیں۔ مولانا کے نزدیک اگر کانگریس نے اپنے آپ کو نہ بدلا۔ اور اپنی سیاسی روش اور ذہنی رجحانات میں مناسب تبدیلیاں نہ کیں تو کانگریس کا مستقبل زیادہ امید افزا نظر نہیں آتا۔ اور آئندہ وہ کسی صورت بھی کل ہندوستان کی نمائندہ جماعت نہیں بنے گی۔ نیز اہل ملک کی بعض مقتدر جماعتیں آج کی طرح ہمیشہ اس کی مخالفت کرتی رہیں گی۔

مولانا سندھی اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ مسلمان بالعموم کانگریس سے آج کل سخت بیزار ہیں اور ان کی یہ بیزاری اتنی بڑھ چکی ہے کہ مولانا ابوالکلام، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا کفایت اللہ اور ان جیسے اور بزرگ جن کی زندگیاں اسلام اور مسلمانوں کی خدمت اور ان کے لیے ہر طرح کی قربانیوں سے بھرپور ہیں، عوام کی بدگمانیوں اور مخالفتوں کا نشانہ بن رہے ہیں۔ مولانا مسلمان عوام کی اس بیزاری کو بہت حد تک حق بجانب سمجھتے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ جب مولانا محمد علی جیسے حق پرست اور محبت وطن رہنما کانگریسی لیڈروں سے تنگ آ کر گزشتہ سالوں میں کانگریس سے بددل ہو گئے۔ تو مسلمان عوام کا کانگریس کو مسلمان قوم کا دشمن سمجھنا کچھ بعید نہ تھا۔ مولانا فرماتے ہیں کہ کانگریس کی موجودہ قیادت نے مسلمانوں کو سمجھنے میں ذرا بھی تدبیر کا ثبوت نہیں دیا۔ چنانچہ اسی کا خمیازہ آج ان کو بھگتنا پڑ رہا ہے۔ ہندوستانی مسلمان ۱۹۲۰ء میں بحیثیت مجموعی کانگریس میں شریک ہوئے۔ اور پھر آہستہ آہستہ ان کے دل کانگریس سے دور ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ ایک زمانہ ایسا آیا کہ کسی مسلمان کا کانگریسی ہونا عام مسلمانوں کی نظروں میں کھلنے لگا۔ اور ”کانگریسی مسلمان“ کا لفظ ایک گالی سمجھا جانے لگا۔ یہ کیوں ہوا؟ اور کیسے ہوا؟ اس کی تفصیل مولانا یوں بیان فرماتے ہیں:

کانگریس آغاز کار میں اعتدال پسند سیاست دانوں کی تحریک تھی۔ لیکن بتدریج اس میں ہندوستان کے انقلابی عناصر شامل ہوتے چلے گئے۔ تقسیم بنگال کے موقع پر پہلی بار انقلاب پسند گروہ کانگریس پر چھا گیا۔ اس میں بیشتر بنگالی نوجوان تھے اور ان کا مقصد بنگال کی تقسیم کو منسوخ کرانا تھا۔

چنانچہ اپنی جدوجہد میں وہ بہت حد تک کامیاب رہے۔ ۱۹۲۰ء میں دوبارہ کانگریس کی باگ ڈور انقلابی گروہ کے ہاتھ میں آئی۔ لیکن ہندو اور مسلمان دونوں کے دونوں اس میں برابر کے شریک تھے۔ دونوں نے مل کر تکلفیں اٹھائیں۔ سختیاں جھیلیں اور قربانیاں دیں۔ لیکن دقت یہ آپڑی کہ مسلمان ایک لحاظ سے اس ضمن میں دوسرے ملک یعنی دولت عثمانیہ کے لیے بھی کام کر رہے تھے۔ ترکی میں انقلاب آیا۔ پرانا ترک شکست کھا گیا۔ نئے ترک نے نئی زندگی کے ساتھ خلافت کا بار سنبھالنا قبول نہ کیا۔ اس نے خلافت کو منسوخ کر دیا اور یورپی طرز پر خالص قومی اصولوں کے مطابق اپنی حکومت بنائی۔ قدرتی طور پر اس کا برا اثر ہندوستان کے مسلمانوں کی اس وقت کی سیاسی تنظیم پر بھی پڑا۔ اور ان میں آپس میں اختلافات پیدا ہو گئے۔ چنانچہ وہ مسلمان جماعتیں جو خلافت اور کانگریس کے اس اتحاد عمل سے خوش نہ تھیں، انہیں خدا نے بڑا اچھا موقع دیا اور انہوں نے جی بھر کر اس تحریک کے رہنماؤں کے خلاف عوام کو بھڑکایا۔ خلافت کی تحریک بدنام ہوئی اور اس کے ساتھ مسلمان عوام میں کانگریس کو بھی بہت برا بھلا کہا جانے لگا۔

بدقسمتی سے مسلمانوں میں آپس کی پھوٹ بڑھتی چلی گئی اور تحریک خلافت کے رہنما بھی غیر ہرگز ہوتے چلے گئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ کانگریس جو ۱۹۲۰ء میں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی مشترکہ سیاسی جماعت بن گئی تھی اور دونوں قومیں مساوی حیثیت سے اس کے طرز کار میں اثر انداز اور شریک تھیں۔ کچھ سالوں بعد صرف ہندوؤں کی قیادت سے مختص ہو گئی۔ اور گاندھی جی اس کے ڈکٹیٹر اور مختار بن گئے۔ وہ جو چاہتے کرتے۔ جس کو صدر بنانے کی سفارش ہوتی وہ کانگریس کا صدر بن جاتا۔ جو پالیسی گاندھی جی چلانا چاہتے۔ کانگریس اس کو اپنا مسلک اور اصول بنا لیتی۔ آخر کار ہوا یہ کہ کانگریس محض گاندھی جی کی شخصیت کا آئینہ دار بن کر رہ گئی۔

ہندوستان کی شومئی قسمت سے گاندھی جی محض ایک سیاسی لیڈر نہ رہے۔ وہ ایک مذہبی رہنما بھی بن گئے۔ ہندو مذہب کا احیاء بھی ان کا مقصد ٹھہرا۔ محض سیاسی مقاصد نہیں بلکہ مذہبی عقائد کے لیے بھی ان کی ذات مدار بن گئی۔ وہ مہاتما بنے اور ان کے بعض اہل مذہب نے ان کو اتار بھی بنا دیا۔ بننے کو تو وہ سب کچھ بن گئے اور سچ یہ ہے کہ اس معاملے میں کسی غیر ہندو کو ان سے شکایت نہیں ہونی چاہیے۔ لیکن زیادتی یہ ہوئی کہ ایک طرف تو ان کی قوم نے ان کو ہندو دھرم کا زندہ کرنے والا مہاتما اور اتار بنا دیا۔ اور دوسری طرف وہ ایک ایسی جماعت کے مختار مطلق اور کرتا دھرتا بنے رہے جو صرف ہندوؤں کی جماعت نہ تھی بلکہ اس میں ہندوستان کی غیر ہندو قومیں بھی شامل تھیں۔ اور ظاہر ہے کہ گاندھی جی کی مذہبی شخصیت اور ان کی گونا گوں نیم مذہبی اور نیم سیاسی سرگرمیاں ان غیر ہندو قوموں کے

اسی بنا پر ”گاندھی ازم“ کے خلاف مسلم لیگ یا خاکسار صرف آرا ہوں۔ تو مجھے ایک گونہ مسرت ہوتی ہے۔ اگرچہ میں اصولاً ان دونوں تحریکوں سے متفق نہیں ہوں۔

اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے ایک دفعہ مولانا نے فرمایا کہ میرے خیال میں اقبال مرحوم کو کانگریس کی موجودہ سیاسی سرگرمیوں سے اس زمانے میں جو بے اعتمادی سی تھی وہ ان کی صحیح فراست و تدبیر کا نتیجہ تھی جس نتیجے پر کانگریس چل رہی ہے۔ اور ”گاندھی ازم“ کے اثر میں اس وقت جو نام نہاد ہندوستانی قومی فکر پروان چڑھ رہا ہے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ہندوستانی مسلمان اپنے قومی وجود سے بیگانہ ہو کر رہ جائے گا۔ اور ظاہر ہے یہ ہندوستانی مسلمان کی موت کے مترادف ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ تعجب ہے مولانا حسین احمد مصطفیٰ کمال کی ترکی تحریک کے تو خلاف ہیں۔ لیکن حکومت برطانیہ کی عداوت میں اس پر کبھی غور نہیں کرتے کہ گاندھی جی جو ہندوستانی تحریک چلا رہے ہیں اس سے ہندوستان کے مسلمانوں کی قومی شخصیت کو کس قدر نقصان پہنچنے کا امکان ہے۔

کانگریس کا ”گاندھی ازم“ کے پرچار کے لیے آلہء کار بن جانا ایک سبب تو یہ ہے کہ جس کی وجہ سے مولانا سندھی کانگریس کی موجودہ قیادت سے متفق نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ عام مسلمانوں کو کانگریس سے جو بعد پیدا ہو گیا ہے اس کی تفصیل بھی مولانا کی زبان سے سنیے۔

۱۹۱۶ء میں لکھنؤ پیکٹ کے نام سے اسمبلیوں اور کونسلوں کی نشستوں کے متعلق ہندو مسلمانوں میں جو سمجھوتہ ہوا تھا۔ اس میں ایک بنیادی غلطی رہ گئی تھی۔ جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ ان میں سے کچھ حصہ لے کر مسلم اقلیت کے صوبوں کو عموماً اور یوپی کی مسلم اقلیت کو خصوصاً زیادہ نشستیں دی گئی تھیں۔ اس طرح مسلمانوں کو ہندوستان کے ہر حصہ میں اقلیت بنا دیا گیا۔

۱۹۲۰ء میں خلافت تحریک کے جوش و خروش کے زمانے میں تو مسلمانوں نے حقوق کی اس غلط تقسیم کی طرف توجہ نہ دی۔ لیکن جب تحریک خلافت سرد پڑ گئی تو مسلمانوں کی بعض سیاسی جماعتوں نے اس بے انصافی کے خلاف احتجاج کرنا شروع کیا۔ چنانچہ کونسلوں اور اسمبلیوں میں ہندو مسلمانوں کی یہ آئینی جنگ بڑے زور شور سے لڑی جانے لگی اور اس کی صدائے بازگشت سارے ملک میں گونج اٹھی۔ کانگریس خیال کے مسلمان کونسلوں اور اسمبلیوں میں جانے کے خلاف تھے اور ہندو مسلمانوں کی اس آئینی جنگ کے بارے میں ان کی حیثیت ایک ثالث اور صلح جو کی تھی۔ اس لیے عوام مسلمانوں نے انہیں اسلامی حقوق کا مخالف اور ہندو پرست کہنا شروع کر دیا۔ آخر یہ ہوا کہ ۱۹۲۰ء کی مسلم قیادت ملک میں بالکل غیر مقبول ہو گئی اور حریف سیاسی گروہ غالب آتے چلے گئے۔

کانگریس نے یہ نہ کیا کہ وہ از خود مسلمانوں کے جائز مطالبات کو مان لیتی تاکہ مسلمان عوام

لیے وجہ تسکین نہ ہو سکتی تھیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ادھر کانگریس گاندھی جی اور ان کے فلسفہ زندگی یعنی ”گاندھی ازم“ کا عملی پیکر بنتی چلی گئی اور ادھر غیر ہندو جماعتیں اور خصوصاً مسلمان کانگریس سے بدظن ہوتے گئے۔ ”گاندھی بھگتوں“ کی جرات کا کمال دیکھئے کہ ایک وقت میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے سیکرٹری نے برطانیہ اعلان کر دیا کہ کانگریس گاندھی ازم کا دوسرا نام ہے۔ اور ”گاندھی ازم“ محض ایک سیاسی مسلک نہیں بلکہ وہ ایک لائحہ زندگی ہے۔ ایک فلسفہ ہے جس کو کانگریس میں رہنا ہو وہ گاندھی ازم کے اصول کو مانے اور جو اس کے لیے تیار نہ ہو۔ اس کی جگہ کانگریس میں نہیں۔

گاندھی جی کی اس اجارہ داری نے کانگریس کو واقعی ان تمام الزامات کا مستحق بنا دیا جو آج کل مسلمان اسے دیتے ہیں۔ چنانچہ ۱۹۲۰ء کی کانگریس جو دونوں قوموں کے سیاسی اتحاد اور عملی تعاون کا نمونہ تھی۔ وہ گاندھی بھگتوں کا ادارہ بن گئی۔ اور مجبوراً مسلمان کانگریس سے بیزار ہو کر ہندوؤں سے کلی انقطاع کے منصوبے کرنے لگے۔

اس سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ مولانا گاندھی جی کی عظمت کے یکسر منکر ہیں۔ یا وہ مولانا ابوالکلام، مولانا حسین احمد اور مولانا کفایت اللہ کے علوم مرتبت کو نہیں مانتے۔ مولانا گاندھی جی کی بڑی عزت کرتے ہیں اور ان آخر الذکر بزرگوں کا تو جب کبھی ذکر آتا ہے۔ مولانا ان کی تعریف میں ایسے کلمات فرماتے ہیں کہ سننے والا ورطہء حیرت میں پڑ جاتا ہے۔ مولانا گاندھی جی کے متعلق لکھتے ہیں۔ ”میں نے اپنے پروگرام میں عدم تشدد کو ضروری قرار دیا ہے۔ میں اس میں مہاتما گاندھی کا ممنون ہوں۔ میں عدم تشدد کو اخلاقی اصول مانتا ہوں اور اس بنا پر پولیٹیکل پروگرام کی تشکیل اور اس کی اہمیت میں نے گاندھی جی سے سیکھی ہے۔ گاندھی جی نے مجھے حضرت مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تعلیم یاد دلا دی۔ میں جانتا ہوں کہ اسلام کے پہلے دور میں بھی اسی اصول سیاسی پر عمل ہوتا رہا۔“ مولانا نے اور موقعوں پر بھی گاندھی جی کو ”اپنے وطن کے بہت بڑے فلاسفر“ اور دوسرے باعزت القاب سے یاد فرمایا ہے۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود مولانا ”گاندھی ازم“ کے سخت مخالف ہیں اور اسے صرف مسلمانوں کے لیے نقصان رساں نہیں بلکہ ہندوستان کے حق میں بھی برا سمجھتے ہیں اور ان کی انتہائی کوشش یہ ہے کہ کانگریس ”گاندھی ازم“ کے بھنور سے جلد از جلد نکل کر صحیح معنوں میں سیاسی جماعت بن جائے۔

مولانا سندھی کے نزدیک ”گاندھی ازم“ ہندوستان کے لیے بہت بڑا خطرہ ہے۔ گاندھی جی نے ہندوستانیہ کو ہندو قوم، ہندو ذہنیت اور ہندی زبان میں محدود کر کے مسلمانوں کے لیے اس ملک میں اپنا قومی وجود قائم رکھنا مشکل کر دیا ہے۔ گاندھی جی کا یہ فکر ہندوستان کو کئی صدیاں پیچھے لے جانا چاہتا ہے۔ یہ دراصل ترقی پسند تحریک نہیں۔ بلکہ رجعت پسندانہ رجحان فکر ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ

ہندو مسلمانوں کو آپس میں لڑانے میں زیادہ قصور کس کا ہے؟ ہندوؤں کا یا مسلمانوں کا؟ یا یہ سب شرارت انگریزوں کی ہے؟ بہر حال زیادہ قصور وار کوئی بھی ہو لیکن یہ واقعہ ہے کہ ہندو مسلمانوں کی لڑائی نے ہندوستان کے معاملہ کو بالکل چوہا بن کر دیا ہے۔ ہندو بھی اس سے گھائے میں ہیں۔ مسلمانوں کو بھی کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ ہاں برطانیہ کی ضرورت بن آئی ہے۔ مولانا محمد علی آخوندی تک ہندو مسلم اتحاد کے لیے جدوجہد کرتے رہے۔ لیکن نہ ان کی قوم نے ان کی بات سنی اور نہ ہندوؤں کی تنگ دلی اور کم بینی نے معاملہ کی نزاکت کو جانا اور اس وقت جو کچھ محمد علی مرحوم مانگتے تھے آج وہ سب کچھ ہو چکنے کے بعد بھی مسلمان ہندوؤں سے بدظن ہیں اور ان کا ایک فریق اس پر تلا ہوا ہے کہ دنیا ادھر سے ادھر ہو جائے زمین بدل جائے۔ آسمان نیچے آ رہے۔ لیکن ہندوؤں سے برابر ٹھنی ہی رہے خواہ اس میں اپنا کتنا ہی نقصان کیوں نہ ہو۔

بے شک مولانا عبید اللہ سندھی کانگریس کی موجودہ قیادت سے خفا ہیں۔ لیکن وہ اصلاً کانگریس کے خلاف نہیں۔ انہیں ہندوؤں اور مسلمانوں کی یہ کھینچا تانی ایک لمحہ کے لیے بھی گوارا نہیں۔ ان کے خیال میں اس سے ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کا نقصان ہے۔ مولانا سندھی چاہتے ہیں کہ ہندو اور مسلمان دونوں مل کر کام کریں۔ اور ان کی صرف ایک سیاسی تنظیم ہو لیکن اس سیاسی تنظیم میں کسی مذہبی گروہ کا غلبہ نہ ہو۔ اس کے پیش نظر ایسے مقاصد اور نصب العین ہوں۔ جن میں سب قومیں برابر کی شریک ہو سکیں۔ اور سب ان کو اپنا بھی سکیں۔ ظاہر ہے۔ یہ اسی صورت ہی میں ممکن ہے جب کہ اس سیاسی تنظیم کے مقاصد اور نصب العین عمومی حیثیت رکھتے ہوں۔ اور ان سے ملک کے سارے باشندوں کو یکساں فائدہ پہنچتا ہو۔

مولانا ایک ہندوستان کے تو قائل ہیں لیکن وہ ایک ہندوستانی قوم کے قائل نہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ کانگریس نے پچھلے دنوں گاندھی جی کی قیادت میں ایک ملک، ایک قوم، ایک زبان، ایک کچر اور ایک فلسفہ زندگی کے جو نعرے لگائے تھے ان سے ان کا مقصد آریہ ورت ملک، ہندو قوم، ہندی زبان، ویدک کچر اور گاندھی فلسفہ تھا۔ گاندھی جی غلطی سے یہ سمجھ بیٹھے کہ وہ ہندوستان کو ہزار ہا سال پہلے کی جون میں بدلنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ انہوں نے اس کا مطلق خیال نہ کیا کہ ۸۰۰ برس سے ایک اور قوم، ایک اور زبان، ایک نیا تمدن اور ایک نیا فکر اس وطن کو اپنا گھر بنا چکا ہے۔ اور اس سرزمین پر اس کا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا کہ گاندھی جی کی قوم کا۔ ان کی زبان، ان کے کچر اور فلسفہ کا ہے اور پھر وہ یہ بھی فراموش کر گئے کہ انگریزوں کے آنے سے بھی ہندوستان کی بہت کچھ کاپیالٹ ہو چکی ہے۔ یورپ سے انگریزوں کے ذریعہ ہمیں زندگی کی جہاں اور بہت سی نئی قدریں ملیں۔ وہاں دو چیزیں خاص طور پر اہم

کے دلوں میں ہندو اکثریت سے جو نفرت پیدا ہو رہی تھی اسی وقت اس کا سدباب ہو جاتا۔ اگر کانگریسی قیادت کو اسی وقت یہ توفیق و دعت ہو جاتی تو نہ کانگریسی خیال کے مسلمان زعماء اپنی قوم میں یوں بے وقور ہوتے نہ ہندو مسلمان آپس میں اس طرح لڑتے اور نہ یہ تلخ اور الم ناک مناظر دیکھنے میں آتے۔ جنہوں نے آج کی ہندوستانی سیاست کو اپنوں اور غیروں کے لیے مضحکہ خیز بنا دیا ہے۔ کانگریس نے ان معاملات سے نہ صرف بے نیازی برتی۔ بلکہ اس نے الٹا مہاسبھائی عناصر کی دست گیری کی۔ اور مسلمانوں کی مخالفت کو کمزور کرنے کے لیے یہ چال چلی کہ انہیں آپس میں لڑا دیا۔ خود مولانا سندھی کے اپنے الفاظ میں ”خلافت تحریک یا مسلمانوں کی قومی خدمات کا اتنا اثر بھی نہ پڑا کہ ہندو مسلمانوں کو ہندوستانی وطن میں ان کی تعداد کے مطابق ہی حق دینے پر راضی ہو جاتے۔ جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت تھی کم سے کم وہاں اگر کانگریس ہندوؤں کی جارحانہ کارروائیوں کو روک دیتی تو صورت حال اتنی نہ بگڑتی۔ کانگریس کے تیز گام ۱ اور فلاسفر ۲ لیڈروں نے بیرون ہند میں کانگریس اور کانگریس کے ساتھ اپنے اور بے شک ایک حد تک ہندوستان کے نام مشہور کرنے پر تو اپنی توجہ مبذول کی۔ لیکن انہوں نے یہ محسوس نہ کیا کہ سب سے پہلے تو اس بات کی ضرورت ہے کہ کانگریس صحیح معنوں میں سب اہل ہند کی نمائندہ جماعت ہو۔ ورنہ اگر نو دس کروڑ مسلمان اس سے منحرف ہو گئے تو بیرون ہند کی یہ ساری نیک نامی اندرون ملک کی بے امنی اور پھوٹ کے مقابلے میں بے حقیقت ثابت ہوگی۔ الغرض کانگریس نے انٹرنیشنل ازم پر زور دیا۔ لیکن اپنے اہل وطن مسلمانوں سے تعافل برتا۔ ان کی اس روش سے ایک طرف تو ملک کے اندر ہندو اکثریت کی جارحانہ سرگرمیوں کے لیے راستہ صاف ہو گیا۔ اور دوسری طرف باہر کی دنیا یہ سمجھنے لگی کہ کانگریس ہی سارے ہندوستان کی ترجمان ہے۔ اور یہ کانگریس بس گاندھی جی اور ان کے چند ساتھیوں کا نام ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ کانگریس کے اس رویے نے معاملہ کو بد سے بدتر بنا دیا۔ یہاں تک کہ جمعیت العلماء اور احرار کے لیڈر عوام مسلمانوں کے سامنے کانگریس کا نام لینے کے قابل نہ رہے۔

۱۔ ۲۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنے انٹرنیشنل رجحانات اور گاندھی جی نے اپنے عدم تشدد کے فلسفہ کی وجہ سے جسے وہ ساری دنیا کے لوگوں کا علاج بتاتے ہیں۔ اور سب اقوام کو اس کا قائل کرنا اپنی زندگی کا مقصد سمجھتے ہیں باہر کے ملکوں میں بڑا نام پیدا کیا۔ اول الذکر اشتراکیت ایسی بین الاقوامی تحریک کے نقیب کی حیثیت سے ہر جگہ مشہور ہوئے اور گاندھی جی نئی انسانیت کے ”پیغمبر“ بنے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ ان دونوں بزرگوں نے اپنے وطن کی مسلمانوں جیسی کثیر آبادی کا اعتماد حاصل کرنا ضروری نہ سمجھا۔ اور اسی کا نتیجہ ہے کہ کانگریس کی ۱۹۳۲ء کی تحریک تقریباً نام کام رہی جس کا خود کانگریس کے بڑے بڑے زعماء اعتراف کرتے ہیں۔

تھیں۔ جن کو نئے ہندوستان میں جگہ دینا بے حد ضروری تھا۔ ان میں سے ایک تو جمہوریت یعنی خود اپنی مرضی اور اپنی رائے سے اپنے اوپر حکومت کرنے کا حق ہے اور دوسری چیز صنعتی انقلاب ہے۔ مولانا کے الفاظ میں ”جیسے برطانیہ نے لبرل ازم سکھایا۔ اسی طرح ہمارے ملک کو مشین سے بھی آشنا کر دیا ہے۔ مشین کا خاصا ہے کہ وہ کاریگروں کو منظم کر دیتی ہے۔ چنانچہ اس طرح ہمارے ملک میں مشین کے ساتھ کام کرنے والی جماعتیں پیدا ہو گئیں۔“

گاندھی جی کی قیادت کی سب سے بڑی بھول یہ تھی کہ ایک تو انہوں نے اپنے ہندوستان میں ویدک تہذیب کے علاوہ کسی اور تہذیب کی مستقل حیثیت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ مانا کہ ان کے دل میں مسلمانوں سے کوئی بیز نہیں۔ وہ قرآن مجید کی بھی خلوص دل سے عزت کرتے ہیں اور رسول اللہ ﷺ کو بھی سچا نبی سمجھتے ہیں۔ لیکن وہ مسلمانوں کے قومی وجود قرآن مجید کی اساسی تعلیم اور رسول اللہ صلعم کے بتائے ہوئے اسلوب حیات کو ہندوستان میں عامل اور نافذ ماننے کو تیار نہیں۔ ان کے نزدیک نئے ہندوستان کا بنیادی اصول تو وہ فلسفہ ہے جس کی ترویج ان کے نام سے کی جا رہی ہے۔ بے شک دوسری چیزیں ہندوستان میں رہ سکتی ہیں۔ لیکن اس فلسفہ کے تابع بن کر۔ اس کے رنگ میں رنگ کر۔ یعنی دوسرے لفظوں میں اپنی عملی اور ترجیحی حیثیت کھو کر۔ ظاہر ہے۔ یہ ایک زندہ تہذیب اور فعال فکر کی موت نہیں تو اور کیا ہے۔ دوسری غلطی انہوں نے یہ کی کہ خاص ہندوستان میں اور ہندوستان کے باہر دنیا کے دوسرے ملکوں میں ادھر ایک سو سال سے جو صنعتی انقلاب برپا ہے اس سے پیدا ہونے والے حالات و نتائج کو سامنے نہ رکھا۔ اس زمانے میں مشین نے دنیا کی ہر چیز کو بدل دیا ہے۔ زمین پر اس کا سکہ رواں ہے۔ ہوا اس کے قبضہ میں ہے۔ پانی کے اوپر اور پانی کے اندر اس کا عمل دخل ہے۔ انسان کو اس نے کچھ سے کچھ بنا دیا۔ اس کے لباس کو بدلا۔ اس کے دماغ کو بدلا۔ اس کی زندگی کی قیمتیں بدل دیں۔ گاندھی جی اپنے من کی دنیا میں کچھ اس طرح الجھے رہے کہ انہوں نے مشین کے پیدا کیے ہوئے انقلاب کو اپنے تصور حیات میں پوری اہمیت نہ دی۔ یہی وجہ ہے کہ گاندھی جی کی قیادت کے خلاف ایک طرف اگر مسلمانوں نے آواز اٹھائی۔ تو دوسری طرف مشین کی پیدا کی ہوئی ذہنیت والوں نے بھی اس قیادت کا دامن چاک چاک کر دیا۔ اور اس میں ذرہ برابر بھی کسی کو شک نہیں ہونا چاہیے کہ مسلمان اور اشتراکی جماعتیں نہ آج گاندھی جی کی قیادت کو مانتی ہیں اور نہ آئندہ اس کا امکان ہے وہ ان کی قیادت کو مانتیں۔ اس لیے اگر کانگریس آئندہ بھی بدستور گاندھی جی کی تحویل میں رہی تو لازمی طور پر مسلمان اس سے الگ رہیں گے اور اشتراکیت پسند گروہ بھی جن کی روز افزوں ترقی کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا خلاف قیاس نہیں کہ مستقبل میں ان کے اثر و رسوخ کا دائرہ یقیناً کافی وسیع ہو کر رہے

گا۔ ”گاندھی ازم“ کے ساتھ سمجھوتہ کرنے پر کبھی راضی نہ ہوگا۔ اب خود ہی انصاف فرمائیے کہ جس کانگریسی نظام سے مسلمان اور اشتراکی دونوں بے تعلق رہے۔ اس کا کل ہندوستان کی نمائندگی کرنا کیسے ممکن اور حق بجانب ہو سکتا ہے۔ لیکن ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ مولانا کے نزدیک اہل ہند کی مصلحت اور ان کے مجموعی مفاد کا تقاضا یہ ہے کہ ایک سیاسی جماعت ایسی ہو جو ہندوستان کے سارے باشندوں کی نمائندہ ہو۔ ساری ملتیں اسی کو اپنا سمجھیں۔ وہ اندرون ملک میں سب کو ایک نقطہ پر جمع کر سکے۔ بیرون ہند میں اس کی آواز سارے ملک کی آواز سمجھی جائے اور ظاہر ہے کہ یہ جماعت صرف کانگریس ہو سکتی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ کانگریس کا موجودہ روپ بدلا جائے اور اس کی مسخ شدہ ذہنیت کی اصلاح ہوتا کہ یہ جماعت اس قابل ہو سکے کہ ہندوؤں کے علاوہ ملک کی دوسری قومیں بھی اسے اپنا سکیں اور یہ صحیح معنوں میں ہندوستان کی ساری سیاسیات کا مرکز بن جائے یہ کیونکر ہو؟ مولانا سندھی اس بارے میں فرماتے ہیں:

”ہندوستان ان معنوں میں ایک ملک نہیں ہے۔ جن معنوں میں ہمارے ہندو مہاسھائی اور بعض کانگریسی دوست سمجھنے کے عادی ہیں۔ اگر ہندوستان کو ان لوگوں کی رائے کے مطابق ایک ملک بنانے پر زور دیا جاتا رہا۔ تو یہاں اکثریت اور اقلیتوں کے جھگڑے رہتی دنیا تک چلتے رہیں گے اور کبھی امن قائم نہیں ہو سکے گا۔ یوں بھی دیکھیے کہ اگر روس کو براعظم یورپ سے علیحدہ کر دیا جائے تو ہندوستان اپنے رقبے باشندوں کے تنوع اور زبانوں کے اختلافات کے معاملے میں اس یورپ سے مشابہ ہے۔ چنانچہ جس طرح یورپ میں انگریز فرانسیسی، جرمنی اور اطالوی قومیں مانی جاتی ہیں۔ وہی کیفیت ہندوستان میں موجود ہے۔ مولانا کے نزدیک قوم وہ انسانی اجتماع ہے جو ایک زبان بولتا ہو۔ ان کی معاشرت میں ایک حد تک یکسانی پائی جائے۔ چونکہ اس آبادی میں ایک فکر جلدی شائع ہو سکتا ہے۔ اور آپس کے میل جول میں بھی زیادہ دقت نہیں ہوتی۔ اس لیے اسے ایک قومی وحدت ماننا چاہیے۔“

مولانا فرماتے ہیں کہ اس لحاظ سے ہندوستان کے سب باشندے ایک قوم نہیں ہیں۔ دراصل یہ نیم براعظم سرزمین مشتمل ہے۔ سندھی کشمیری، پنجابی، بنگالی، مدراسی اور مرہٹی وغیرہ متعدد اور مستقل قوموں پر۔

لیکن ہندوستان کے اندران مستقل بالذات قوموں کے وجود کو تسلیم کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ یہ قومیں کبھی آپس میں ملیں ہی نہ۔ اور ہندوستان ریاست اہائے بلقان بن کر رہ جائے۔ ہندوستان الگ الگ ٹکڑوں میں تقسیم نہیں ہو سکتا۔ ہندوستانی اقوام مجبور ہیں کہ باہم مل جل کر رہنے کے لیے ایک بڑی سیاسی وحدت بنائیں۔ اس وحدت کے بغیر ہندوستان کے مسئلے کا کوئی اور حل ممکن نہیں۔

لیکن یہ بڑی وحدت چھوٹی چھوٹی وحدتوں کے مجموعہ سے بنے۔ ہر چھوٹی وحدت اپنی جگہ آزاد اور خود مختار ہو۔ اور بڑی وحدت ان آزاد اور خود مختار وحدتوں کو ایک رابطہ میں پرودے۔ یہ نہ ہو کہ چھوٹی وحدتوں کو منکر ایک بڑی وحدت معرض وجود میں آئے۔ ایسا نہ ممکن ہے اور نہ فائدہ بخش۔ استعارے کی زبان میں یوں کہہ لیجئے کہ ہندوستان ایک گلدستہ ہے۔ جس میں ہر رنگ اور ہر نوع کے پھول ہوں۔ گلدستہ کی خوبی اور حسن یہ ہے کہ ہر پھول الگ الگ اپنی بہار دکھائے۔ اور پھولوں کی خوش نمائی اور شان اس میں ہے کہ وہ ایک رشتہ میں منسلک ہو کہ گلدستہ بن جائیں۔

ہندوستان میں اس قسم کی ایک وحدت کا ہونا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے۔ خود مولانا کے الفاظ میں ”یہ ایک حقیقت ہے کہ مختلف زبانیں بولنے والی قومیں اگر سمندر پہاڑ جیسی قدرتی حدود انہیں جدا نہیں کرتیں۔ آپس میں کسی نہ کسی طرح اشتراک فکر پیدا کرنے کے لیے مجبور ہیں۔ یہ فلسفی فکر کبھی تو الہیات سے تعلق رکھتا ہے۔ کبھی اقتصادیات سے۔ جیسے کہ ہمارے زمانے میں اشتراکیت ہے اور کبھی ایک دینی تنظیم جو الہیات اور اقتصادیات دونوں پر حاوی ہوتی ہے وجہ اشتراک بن جاتی ہے۔ ہمارے خیال میں اس قسم کے فکری اتحاد سے جو وحدت پیدا ہو اسے قومی نہیں بلکہ بین الاقوامی کہنا چاہیے۔ مولانا چاہتے ہیں کہ کانگریس ہندوستانی اقوام کا اس طرح کا ایک بین الاقوامی ادارہ بنے اس ادارہ کو قومی کہنا غلط ہے۔ یہ ادارہ بین الاقوامی ہونا چاہیے۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ کونسا مشترک فکر اور ذہنی رشتہ ہے جو ان سب اقوام کو ایک بندھن میں جمع کر سکتا ہے۔ مولانا اس خیال کے حامی ہیں کہ ہندوستانی اقوام میں اس قسم کا اشتراک فکر موجود ہے اور اس کی اساس پر ایک بین الاقوامی ہندوستانی وحدت قائم کرنا ممکن ہے۔

مولانا فرماتے ہیں کہ ہمیں معلوم ہے کہ عہد گزشتہ میں بعض ترکی لیڈر تحریک اتحاد اسلام کو ایک قومی تحریک مانتے تھے اور انہوں نے اس کو اسلامی قومیت کا نام دیا تھا۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ ان کے تتبع میں آج بھی بعض ہندوستانی مسلمان اسلامی قومیت کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ ترک اتحاد اسلام کی تحریک کے مرکز پر قابض تھے۔ ان کے لیے اس میں فائدہ تھا کہ دوسری اسلامی قوموں کی قومیت کا اعتراف نہ کیا جائے۔ چنانچہ اتحاد اسلام سے عملاً ان کی قومی سیاست کو ہی تقویت پہنچتی تھی۔ ترکوں کے اس غلو کا یہ نتیجہ نکلا کہ عرب ترکی قوم کے جانی دشمن بن گئے۔ اور آخر کار اپنی قومی شخصیت کے بقا کے لیے غیروں سے مل کر ان کے خلاف لڑے۔ کم و بیش یہی کیفیت آج کے یورپ کے جنوب مشرق میں متعدد چھوٹی چھوٹی ریاستیں ہیں اور ان کی آپس میں برابر چھڑی رہتی ہے۔ چنانچہ بلقان کو عام طور پر یورپ کی میگزین کہا جاتا ہے۔

ہندوؤں کی ہے۔ ہندوستان کی موجودہ قومی تحریک کے وہی رُوح رواں ہیں۔ اس لیے ہندوستان میں بننے والی مختلف اقوام کو ایک قوم کہنے میں دراصل ان کی خاص اپنی قوم کا فائدہ ہے۔ اور کل ملک کو ایک لسانی تہذیبی وحدت بنانا ہندو تسلط کے ہم معنی ہیں۔ ۱۹۱۴ء سے پہلے ترکی لیڈروں نے دولت عثمانیہ کی مختلف قوموں کو اتحاد اسلام کے نام سے ایک سیاسی لسانی اور تہذیبی وحدت بنانے کی کوشش کی۔ اور اس کا جو حشر ہوا۔ تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے۔ اگر آج ہندوؤں کے غالب طبقہ نے بھی ہندوستانی قومیت کی آڑ لے کر ملک کی دوسری قوموں کے مستقل وجود کا انکار کیا۔ تو اس کا نتیجہ بھی کچھ کم المناک نہ ہوگا۔

قومی وطن کے متعلق بھی مولانا سندھی کا ایک خاص خیال ہے۔ ان کے نزدیک وطن نمونہ پذیر (DYNAMIC) وجود ہے۔ وہ جامد اور ساکن (STATIC) نہیں ہوتا۔ عہد قدیم میں آریاؤں نے ہندوستان کو عزت اور رفعت بخشی۔ قرون وسطیٰ میں مسلمانوں نے اس ملک کو کہیں سے کہیں پہنچایا۔ مولانا فرماتے ہیں کہ بے شک مسلمان اس وقت تک قابل نفرت ہو سکتے تھے۔ جب تک وہ ہندوستان کی دولت لوٹ کر باہر لے جاتے تھے۔ لیکن جب انہوں نے ہندوستان کو اپنا وطن بنا لیا تو ان کی تمام استعدادیں اس ملک کو سر بلند کرنے میں صرف ہونے لگیں۔ گو برطانوی قوم کا بھی ہندوستان کی موجودہ ترقی میں بہت کافی دخل ہے۔ لیکن چونکہ وہ اس ملک کو اپنا وطن نہیں سمجھتے اس لیے ان کے متعلق ہندوستانی ہونے نہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مولانا کا کہنا یہ ہے کہ ہندوستانی وہ ہے جس نے ہندوستان کو اپنا وطن بنا لیا۔ اس میں پرانے یا نئے کا کوئی امتیاز نہیں۔ جو نظام اور فکر وطن کی بہبودی اور ترقی کا باعث ہو اس نظام اور فکر کو ماننے اور چلانے والے اس وطن کے سب سے بڑے حق دار ہوتے ہیں۔ ورنہ اگر کسی کا محض پرانا ہونا ہی اسے صاحب وطن بنا سکتا ہے تو ہندوؤں سے کہیں زیادہ دراوڑ بھیل اس امتیاز کے اہل ہیں۔

خلاصہء کلام یہ ہے کہ ہندوستان میں ایک قوم نہیں بلکہ متعدد اقوام آباد ہیں۔ یہاں ایک زبان نہیں بلکہ کئی زبانیں رائج ہیں۔ ایک تہذیب نہیں بلکہ کئی تہذیبیں موجود ہیں۔ ان سب اقوام کو اگر مل کر رہنا ہے تو ضروری ہے کہ ہر قوم کا اپنا مستقل وجود قائم رہے۔ ہر زبان کے لیے ترقی کا امکان ہو۔ ہر تہذیب کو پھلنے پھولنے، متاثر کرنے اور متاثر ہونے کے مواقع ملیں۔ چنانچہ ان اقوام کا جو مشترک ادارہ بنے گا وہ قومی نہیں بلکہ بین الاقوامی ہوگا۔ یہ ادارہ ہر قوم کے مستقل وجود اس کی زبان اور اس کی تہذیب کو تسلیم کرے گا۔ تاکہ ہر قوم آزادی سے اس کے ماتحت رہ سکے۔ اور اپنے قومی اور مذہبی وجود کو ترقی دے سکے۔ مولانا سندھی کے نزدیک کانگریس ہی ایک ایسا ادارہ ہے جو ہندوستان کی ساری اقوام کا

اس طرح کا ایک نقطہء اتصال ہو سکتا ہے۔ البتہ ضرورت اس امر کی ہے کہ کانگریس میں چند بنیادی تبدیلیاں کی جائیں۔

پچھلے بیس سال سے گاندھی جی نے کانگریس کو مذہبی رنگ دے دیا ہے۔ لیکن یہ مذہبی رنگ خالص ہندووانہ رنگ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہندوستان کی تمام اقوام کی اکثریت کسی نہ کسی مذہب کو مانتی ہے۔ لیکن گاندھی جی نے مذہب کو جس رنگ میں پیش کیا ہے وہ مسلمانوں، عیسائیوں اور سکھوں کے لیے کبھی قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ اور نہ اشتراکی خیال والے اس کے روادار ہو سکتے ہیں۔ مولانا سندھی فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے ہمیں یہ کرنا چاہیے کہ کانگریس کو خالص ایک سیاسی جماعت قرار دیں اور اقتصادیات کو سیاسی زندگی کی بنیاد سمجھیں۔

جب اقتصادیات پر قومی اور سیاسی زندگی کو مرتکز کیا جائے گا۔ تو اس کا امکان ہے کہ ہمارے ہاں بھی لامذہبیت کا دور دورہ ہو۔ سائنس کی ترقی کے ساتھ مذہبی قوانین کا بے اثر ہونا تو ظاہر ہی ہے۔ لوگ تو سائنس کے اثر میں خدا کا ہی سرے سے انکار کر دیتے ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں کہ میں مذہبی آدمی ہوں۔ میرے نزدیک مذہب ایک ناقابل انکار حقیقت ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ خدا کا انکار زندگی کے کمال کی نہیں۔ بلکہ نقص کی دلیل ہے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی تسلیم کرتا ہوں کہ ہمارے لیے سائنس کا انکار بھی ممکن نہیں۔ اگر ہم نے مشینی دور کی مخالفت کی۔ صنعتی انقلاب کے دور رس نتائج کو اپنی قومی زندگی میں نہ سمویا تو ہم مادی ترقی سے بالکل محروم ہو جائیں گے۔ اور دنیا میں ہماری حیثیت اچھوتوں کی سی ہوگی۔ مولانا کے خیال میں مذہب کا انکار ممکن ہے اور نہ سائنس کے ٹھوس حقائق کو رد کیا جا سکتا ہے۔ اب اس کا حل کیا ہو؟ اس ضمن میں مولانا فرماتے ہیں ”گو یورپ نے مذہب کا استعمال سیاست میں چھوڑ دیا ہے لیکن وہ مجبور ہے کہ کسی نہ کسی فلسفہ کو اپنی اجتماعی زندگی کی اساس بنائے۔ میرا خیال ہے کہ ہمارے ملک کی ہندو مسلمان اور سکھ جماعتوں میں ایسے عالموں کی کمی نہیں کہ وہ اپنی مذہبی روایات کے ساتھ ساتھ یورپ کے اقتصادی نظریات کو تطبیق دے لیں۔ اس سے وہ اپنے عوام کو جلد بیدار کر سکیں گے۔ مگر مذہبی مراسم کو نیشنل تحریک کا جزو بنانا خواہ وہ کسی نیک نیتی کی بنا پر ہو۔ ملک کو تباہی سے نہیں بچا سکتا۔“

مولانا کا کہنا یہ ہے کہ کانگریس خالص سیاسیات اور اقتصادیات کے اصولوں پر اپنے مسلک اور حکمت عملی کی بنیاد رکھے اور کسی مذہبی گروہ کو یہ اجازت نہ دی جائے کہ وہ اپنے خاص مراسم مذہبی کو کانگریس کا جزو بنا سکے۔ لیکن انسانی زندگی مجبور ہے کہ اپنی سیاسی اور اقتصادی سرگرمیوں کے لیے کوئی نہ کوئی فلسفہ ڈھونڈھے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ یہ ضرورت وحدۃ الوجود کے تصور سے پوری ہو سکے گی۔

وحدة الوجود ایک طرف تو ہندو فلسفہ کا اصل اصول ہے۔ دوسری طرف ہندوستان کے سب سے بڑے مسلمان فلسفی اور عالم دین شاہ ولی اللہ بھی اس فلسفہ کو اساس حکمت مانتے ہیں اور ایک سائنس دان بھی اس کا آسانی سے انکار نہیں کر سکتا۔ درحقیقت وحدۃ الوجود کا تصور ہر مذہب کی روح ہے۔ مذاہب عالم کی بوقلمونی بھی اس کی مدد سے سمجھ میں آ جاتی ہے۔ اور پھر یہ فکر کسی ایک قوم کے لیے خاص نہیں۔ نیز وہ لوگ جو زندگی کے مادی تصورات کی بنا پر خدا کا انکار کرتے ہیں۔ اگر وہ وحدۃ الوجود کا سنجیدگی سے مطالعہ کریں تو انہیں بھی خدا کے انکار کی مطلق ضرورت نہ پڑے۔ مولانا عبید اللہ سندھی فرماتے ہیں کہ ہندوستان کو ایک نہ ایک دن سیاست اور معیشت کے متعلق یورپی نظریات کو قبول کرنا ہی ہوگا۔ یہ مشینی دور اب کسی کے روکے نہیں رکھ سکتا۔ روس میں مشین پر کام کرنے والے کاریگروں اور مزدوروں نے خود اپنی حکومت ہی بنالی ہے۔ یورپ کے دوسرے جمہوری ملکوں میں بھی جہاں کی پارلیمنٹوں میں اس وقت محافظین اور لبرل کی اکثریت ہے۔ ایک خطرناک انقلاب آیا چاہتا ہے۔ ان پارلیمنٹوں میں کاریگروں کا غلبہ ہو کر رہے گا۔ چونکہ یہ کاریگر اور مزدور ایک طویل رویے سے محافظین اور لبرلوں کے مظالم کا شکار ہو رہے ہیں۔ اس لیے ان سے انتقام کا جذبہ مزدوروں میں پیدا ہونا ضروری ہے۔

مولانا فرماتے ہیں کہ یہ بھی یاد رہے کہ جن ملکوں میں مشین پر کام کرنے والے مزدور اور کاریگر انقلاب پیدا کریں گے اس وقت اگر وہاں کے کاشت کار بھی منظم ہو چکے ہوں گے تو وہ بھی ان کے ساتھ شامل ہو جائیں گے۔ مولانا کا کہنا یہ ہے کہ مزدوروں اور کاشت کاروں کا یہ انقلاب ہمارے ہاں بھی آ کر رہے گا۔ ممکن ہے ہمارے ہاں ابھی یہ انقلاب اس قسم کی انتہائی شکل اختیار نہ کرے لیکن اس انقلاب کی پہلی اور دوسری منزل سے تو ہمیں بہت جلد گزرنا پڑے گا۔ مانا اس وقت ہمارا ملک انقلاب کی آخری منزل سے قدرے دور ہے۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ آج جو کچھ یورپ کی جمہوریت پسند قوموں کو پیش آ رہا ہے۔ کل پاپرسوں ہمیں بھی اس کا سامنا کرنا ہوگا۔ اس لیے دانشمندی اور تدبر کا تقاضا یہ ہے کہ ہم ابھی سے اس کے لیے تیار ہو جائیں۔

مولانا کے ان تمام ارشادات کا خلاصہ یہ ہے:

- ۱۔ ہندوستان میں ایک قوم نہیں بلکہ کئی اقوام آباد ہیں۔
- ۲۔ ہندوستانی قوم کا یہاں کہیں وجود نہیں۔ البتہ ہندوستانی اقوام یہاں موجود ہیں اور ہمیشہ رہیں گی۔
- ۳۔ ایک رقبہ زمین میں ایک مستقل زبان بولنے والی آبادی ایک قوم ہے۔ ایک سے طبعی ماحول

میں رہنے اور ایک زبان بولنے کی وجہ سے اس کے افراد میں یگانگت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور یہ اپنا ایک تمدن بنا لیتے ہیں۔

۴۔ ہندوستانی اقوام میں سے ہر قوم اپنے اپنے رقبے میں باختیار اور آزاد ہو۔ اس کو پورا حق ہو کہ وہ اپنی زبان اور اپنے تمدن اور اپنے قومی وجود کو استحکام اور ترقی دے سکے۔

۵۔ ہندوستان کی ان باختیار اور آزاد اقوام کی ایک وحدت ہو۔ اس وحدت کی حیثیت قومی نہیں بلکہ بین الاقوامی ہوگی۔

۶۔ ہندوستانی اقوام کی اس وحدت کے یہ بنیادی اصول ہوں۔

۱۔ سیاست: اپنی رائے سے اپنے اوپر حکومت کرنے کا حق جسے عرف عام میں جمہوریت کہتے ہیں۔ قوم کے ہر فرد کی خواہ وہ مرد ہو یا عورت، مساوی حیثیت۔ نسل، مذہب یا قدامت کی بنا پر کسی کو کوئی تفوق نہ ہو۔

۲۔ اقتصادیات: صنعتی انقلاب کا مکمل نفاذ۔ سب کے لیے ایک سی اقتصادی سہولتیں۔ محنت کش طبقوں کا معیار زندگی دوسروں سے کم نہ ہو۔ سیاسی آزادی، اقتصادی آزادی کے بغیر بے معنی ہے۔ اقتصادی آزادی ایک گروہ یا جماعت تک محدود نہ ہو بلکہ ملک کی عام آبادی بلا تمييز مذہب و ملت اس سے بہرہ اندوز ہو۔

۳۔ معاشرت: صنعتی انقلاب کو کامیاب بنانے کے لیے ضروری ہے کہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کے پرانے اوضاع و اطوار کو بدلا جائے۔ ہماری یہ چیزیں اس زمانے کی یادگار ہیں۔ جب زندگی دوسرے ڈھنگ پر تھی۔ اب چونکہ زندگی یک سر بدل گئی ہے۔ اس لیے یہ اوضاع و اطوار بھی فرسودہ ہو چکے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ یورپی معاشرت اختیار کی جائے۔

۴۔ مذہب: سب مذاہب کی بنیادی حقیقت ایک ہے اور ہندوستان کے سارے مذاہب اس بنیادی حقیقت کو تسلیم کرنے میں ایک حد تک آپس میں متفق بھی ہیں۔ یہی مذاہب کی اصل روح ہے اور یہ ہے فلسفہ وحدت الوجود جو مادی اور ماوراء مادی دونوں زندگیوں کی اس طرح تشریح کرتا ہے کہ جملہ اہل مذاہب بھی اس سے منطمن ہو سکتے ہیں۔ اور سائنس اور صنعتی انقلاب کی ذہنیت کو بھی مجال انکار نہیں ہو سکتا۔ ہندوستان جیسے براعظم کی مختلف قوموں، تمدنوں، نسلوں اور مذہبوں میں سیاسی اور معاشی یکسانیت کے ساتھ ساتھ فکری ہم آہنگی، ذہنی موانست اور ایک دوسرے کے ساتھ سچی رواداری پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ فلسفہ وحدت الوجود ہندوستانی اقوام کی اس مجوزہ وحدت کی عقلی اساس بنے۔

مولانا کا یہ پختہ عقیدہ ہے کہ ہندوستان کی سیاسی ابتری، معاشی بد حالی اور اس میں رہنے والوں کی آپس کی ناچاقیوں کا صرف یہی ایک حل ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اسلام اور ہندوستانی مسلمان کو اس سے گزند نہیں پہنچے گا جیسا کہ عام طور پر آج کل سمجھا جاتا ہے۔ اس ضمن میں مولانا کی کیا رائے ہے؟ اس کتاب کے اگلے اور آخری باب کا یہی موضوع ہے۔

جس طرح عرب ایک قوم بنے۔ اسی طرح ایرانی، ترک، افغان اور ہندوستانی مسلمان بھی اپنی اپنی جگہ مستقل قومیں ہیں۔ ہندوستان میں مسلمان آئے تو وہ اس ملک میں بس گئے۔ اور انہوں نے اس ملک کو اپنا وطن بنایا۔ ان کے علاوہ یہاں جو لوگ پہلے سے رہتے تھے۔ ان میں بھی بہت بڑی تعداد نے اسلام قبول کر لیا۔ ان ہندوستانی مسلمانوں نے ہندی اسلامی کلچر کی بنیاد رکھی۔ یہاں کے حالات کے مطابق اسلامی فقہ کی تدوین کی۔ ان کا اپنا خاص ادب معروض وجود میں آیا۔ عربی، فارسی اور ہندی زبانوں کے امتزاج سے ایک نئی زبان بنی۔ صوفیاء کے ہندوستانی طریقے قائم ہوئے۔ فن تعمیر میں ہندی اسلامی طرز کار و رواج ہوا اور اسی طرح اس ملک میں ایک ہندی اسلامی فکر کی بھی تشکیل ہوئی۔ بے شک یہ فکر اسلامی تھا لیکن یہ ہندوستانی بھی تھا۔ ایک عالمگیر تعلیم ایک خاص ماحول میں جو شکل اختیار کرتی ہے۔ اس کی مثال یہ ہندی اسلامی فکر اور ہندوستانی مسلمانوں کا قومی وجود ہے۔

انما المؤمنون اخوة یعنی ہر مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جس کا کوئی مسلمان انکار نہیں کر سکتا۔ اور یہی رشتہ ہے جو کل روئے زمین کے مسلمانوں کو ایک لڑی میں پرو دیتا ہے۔ یہ ہے ملت اسلامیہ کا رشتہ۔ مولانا فرماتے ہیں کہ ملت اسلامیہ عبارت ہے دنیا کی تمام مسلمان قوموں کے مجموعہ سے۔ یہ مسلمانوں کی ایک وسیع عالمگیر برادری ہے اور مختلف مسلمان قومیں اس کے اجزاء ہیں۔ ملت اسلامیہ کے اس بڑے وجود کا استحکام اور اس کا فروغ صرف اسی طرح ممکن ہے کہ جن اجزاء سے یہ ملت مرکب ہے وہ اجزاء ترقی کریں۔ ہاں یہ امر ضرور ملحوظ رہے کہ ان اجزاء کی روش ایک دوسرے کے ساتھ مخالفانہ نہ ہو۔ ورنہ ظاہر ہے ایک کی ترقی دوسرے کے لیے نقصان کا باعث ہوگی۔

ہر فرد کو قدرت کی طرف سے کچھ فطری صلاحیتیں ودیعت ہوتی ہیں۔ چنانچہ ایک فرد کی ترقی کے معنی یہ ہیں کہ اس کی صلاحیتوں کو مناسب نشوونما ملے۔ تاکہ جو کچھ بننے کی اس میں استعداد ہے وہ اس کے لیے اپنی صلاحیتوں سے پورا کام لے سکے اور اس طرح اس کی شخصیت اپنے کمال کو پہنچے۔ لیکن فرد کی صلاحیتوں کی مناسب نشوونما کا انحصار بہت حد تک اس کے ماحول پر ہوتا ہے۔ صلاحیتیں گویا بیج ہیں اور ماحول کو زمین سمجھیے۔ بیج اور زمین میں مناسبت ضروری ہوتی ہے۔ فرد کی طرح ایک جماعت بھی اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتی جب تک کہ وہ اپنے ماحول کے تقاضوں اور اپنی خاص فطری استعداد کی مطابقت کا خیال نہ رکھے۔ اس میں شک نہیں کہ ہر جماعت کو اپنے سامنے ایک عام انسانی نصب العین رکھنا چاہیے۔ کیونکہ وہ اس دنیا میں ایک منفرد بے تعلق وجود نہیں بلکہ اس میں بسنے والے انسانوں کی بڑی برادری کا ایک نکلڑا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اس جماعت کو ضرورت پڑتی ہے کہ وہ اپنے قومی مزاج، جماعتی رجحانات اور گرد و پیش کے مادی اور قدرتی حالات کی مناسبت سے اپنے لیے مخصوص نظام

ہندوستانی مسلمانوں کا مستقبل

مولانا سندھی کے نزدیک جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، اسلام ایک بین الاقوامی تحریک ہے۔ اس بین الاقوامی تحریک کا پہلا رنگ عربی تھا۔ موصوف کے خیال میں عربوں کے اموی اور عباسی دور میں لاکھ خرابیاں ہوں، لیکن ان کی سطوت اور قوت سے اسلام کو یہ فائدہ پہنچا کہ دنیا کی دوسری قومیں بھی اس سے متعارف ہو سکیں اور عربی فتوحات اسلام کی نشر و اشاعت کا ذریعہ بن گئیں۔ ایک زمانے کے بعد جب عربوں کو زوال آیا تو مسلمان ایرانیوں نے ان کی جگہ لی۔ اور انہیں کے فیض سے ادھر مشرق میں دہلی کی شمع روشن ہوئی۔ اور ادھر یورپ کی سرزمین میں عثمانی ترکوں نے اپنا چراغ جلایا۔ مولانا کی رائے میں جس طرح اسلام کے عربی دور کے دو مرکز دمشق اور بغداد تھے اسی طرح اس کے ایرانی دور کے دو مستقل مرکز قسطنطنیہ اور دہلی ہیں۔ بے شک اسلام کی بین الاقوامی تحریک کے اوّل ہراول اور سب سے پہلے نقیب عرب ہیں۔ اور اس لحاظ سے ان کی فضیلت اور اولیت مسلم ہے۔ لیکن اسلام کو اطراف عالم میں پھیلانے اور اس کو سر بلند کرنے میں غیر عرب مسلمانوں کا بھی کچھ کم حصہ نہیں ہے۔

مولانا سندھی فرماتے ہیں کہ اسلام ایک عالمگیر دین ہے۔ وہ سب کے لیے ہے۔ ساری انسانی ساری انسانیت اس کو اپنا سکتی ہے لیکن اسلام کے عالمگیر ہونے کے یہ معنی نہیں کہ مسلمانوں کا توئی وحدتوں میں تقسیم ہونا ناجائز سمجھا جائے۔ اسلام قومیتوں کو مٹاتا نہیں۔ قوم تو انسانوں کی ایک قدرتی تقسیم، انسانی زندگی کے طبعی رجحانات اور ایک ماحول میں رہنے کا لازمی نتیجہ ہے، ایک ملک اور ایک سے حالات میں رہنے والے انسانوں کی عادات و اطوار میں بہت حد تک مشابہت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ ایک زبان بولنے لگتے ہیں۔ اور ان کا ایک قومی مزاج بن جاتا ہے۔ اسلام انسانوں کی اس طبعی تقسیم کا انکار نہیں کرتا۔ البتہ اتنا وہ ضرور چاہتا ہے کہ انسانیت ان تقسیموں سے آپس میں بٹ نہ جائے اور ہر قوم کے ذہن میں یہ خیال رہے کہ وہ انسانوں کی بڑی برادری کا ایک حصہ ہے۔ مولانا کے نزدیک اسلام کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ ان قومیتوں کا اعتراف کیا جائے۔ اور اسلام کی سب سے بڑی خدمت ہے کہ ان قومیتوں کی زبانوں میں اس کی عالمگیر تعلیمات کو پھیلا یا جائے۔

کار تکمیل کرے۔ جو افراد کی فطری صلاحیتوں کو ابھارنے اور ان کی تکمیل میں خاص طور پر مدد و معاون ہو۔ اور قومی طبائع سے آسانی سے اپنے اندر سمو بھی سکیں۔ گو یہ نظام ایک حیثیت سے قومی اور محدود ہوگا لیکن اس کی یہ انفرادیت اور اختصاص عین منشائے فطرت ہے۔ کیونکہ خود فطرت بھی اپنی تمام ہم آہنگی اور جامعیت کے باوجود ایک سی نہیں۔ نہ اس کا ایک رنگ ہے۔ یوں بھی یک رنگی اور یکسانیت میں اتنا حسن نہیں ہوتا۔ جتنا گونا گوں نوع بنوع اور رنگ برنگ اشیاء کے جدا جدا ہوتے ہوئے ان کے ہم آہنگ ہونے میں ہے۔

الغرض ہندوستانی مسلمان کل ملت اسلامیہ کے ایک رکن کی حیثیت سے اپنا ایک مستقل قومی وجود رکھتے ہیں۔ مولانا کے نزدیک قومیت کا انکار انسانی فطرت کا انکار ہے۔ نیز اسلامی قومیتوں کی تقسیم کو ملت اسلامیہ کی وحدت کے منافی سمجھنا بھی ٹھیک نہیں۔ مولانا کے خیال میں ایک قوم کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ اپنے قومی ذہنی اور طبعی رجحانات کو عام انسانی اصولوں کے مطابق کرے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کی قومی شخصیت کو سرے سے ختم کر دیا جائے۔ قومیت اور بین الاقوامیت کا صحیح امتزاج اور ان دونوں میں توافق نہ صرف اس قوم کے لیے مفید ہے بلکہ اس سے کل نوع انسانی کو بھی نفع پہنچتا ہے۔ صحیح امتزاج کا طریقہ یہ ہے کہ انسانیت کے اجتماعی فکر یا ضمیر انسانی کو جو لازوال ہے اور زمانہ کے تمام تغیرات کے باوجود اس کا جوہر اصلی نہیں بدلتا اور جس کی ترجمانی انبیاء حکماء اور صالح افراد انسانی شروع سے کرتے آئے ہیں۔ اس ضمیر انسانی کے ابدی اور ازلی حقائق کو زمانے کی ضرورتوں اور قومی زندگی کے تقاضوں میں اس طرح سمو یا جائے کہ جزو کل سے پورا ہم آہنگ ہو۔ اور جزو کی ترقی اور تقدم کل کی ترقی اور تقدم کا باعث بنے۔ ہندی اسلامی فکر اور ہندوستانی مسلمانوں کا قومی وجود بھی اس طرح کی ایک مستقل وحدت ہے۔ یہ وحدت اپنی جگہ قائم بالذات ہے۔ اب ضرورت اس کی ہے کہ اس وحدت اور عام انسانیت اور دوسرے ملکوں کی مسلمان قوموں میں پوری ہم آہنگی و توافق ہو۔

مولانا فرماتے ہیں کہ بد قسمتی سے عہد گزشتہ میں ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنے قومی وجود کی تکمیل کا پورا موقع نہ ملا۔ شروع میں ایک عرصہ دراز تک وہ تسخیر و توسیع سلطنت میں لگے رہے۔ مغلوں کے دور میں جب حالات سازگار ہوئے اور عام اسلامی علوم و معارف کی بنیادوں پر ہندوستانی اسلامی فکر کی اپنی عمارت اٹھنی شروع ہوئی۔ اور ہندوستانی مسلمان ایک قوم کی حیثیت سے بیرونی دنیا میں روشناس ہونے لگے تو زوال کی گھٹائیں چڑھ آئیں۔ اور ترکیب و تشکیل اور ارتقاء و تقدم کا یہ عمل سچ ہی میں رہ گیا۔ ہندوستان باہر کی قوموں کا غلام ہو گیا اور اکبر کی سیاست، شاہجہان کی فنون پروری، عالمگیر کی تدبیر مملکت، امام ربانی کی دعوت تجدید اور شاہ ولی اللہ کی حکمت کے سلسلہ کو آگے بڑھانے والے نہ

رہے۔ یہاں کا نقشہ ہی بدل گیا۔ انگریزوں کے آنے سے زندگی کے ہر شعبے میں اس قدر خلفشار پیدا ہوا کہ ہماری قومی تاریخ کا تسلسل باقی نہ رہ سکا۔ ہماری ہمتوں میں پستی، ہمارے ذہنوں میں انتشار اور ارادوں میں ضعف پیدا ہو گیا۔ ہم اپنے قومی وجود اور اپنے فکری اور ذہنی سرمایہ سے بے خبر ہو گئے اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دوسروں کے پیچھے چلنا ہم نے اپنے لیے بہتر سمجھا۔

”اپنے آپ کو بھول جانا“ قوموں کی موت ہے۔ مولانا کے نزدیک غلامی کی سب سے بڑی لعنت یہ ہے کہ قوم اپنے آپ کو بھول جاتی ہے اور دوسروں کی نقالی کرنے لگتی ہے۔ نقالی سے کوئی قوم زندگی نہیں پاسکتی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد اپنی سیاسی زندگی میں ہم نے انگریزوں کا سہارا لیا۔ انگریز آہستہ آہستہ ہندوستان کی حکومت سے بے دخل ہونے لگے۔ تو ہمارا اوپر کا طبقہ جو ان سے لو لگائے ہوئے تھا کہیں کا نہ رہا۔ پھر ہم نے ہندوؤں پر ٹیک لگائی۔ یہ ہندو قیادت سرمایہ دارانہ ذہنیت کی تھی اور سرمایہ داروں کے بل پر اس کا سارا فروغ ہوا تھا۔ ان سے اختلاف ہونا ناگزیر تھا۔ چنانچہ ہم ادھر سے بھی گئے اور ادھر کے بھی نہ رہے اور اب مارے مارے پھر رہے ہیں۔ اسی طرح ہم نے اپنی فکری اور ذہنی زندگیوں میں بھی ٹھوکر کیں کھائیں۔ سرسید نے یورپ کے اس وقت کے فلسفہ اور عام فکر سے متاثر ہو کر قرآن کی تفسیر لکھی۔ علامہ مشرقی نے موجودہ یورپ یعنی خالص مادی یورپ پر قرآن کو تطبیق دینے کی کوشش کی۔ مولانا فرماتے ہیں کہ مجھے ان دونوں بزرگوں کی حسن نیت پر شبہ نہیں اور ظاہر ہے اس سے ان کا مقصد اپنی قوم کو اٹھانا اور ان میں زندگی پیدا کرنا تھا۔ لیکن یہ طرز فکر میرے نزدیک ٹھیک نہیں۔ کوئی قوم اپنے فکری تسلسل کو چھوڑ کر صحیح معنوں میں ابھر نہیں سکتی۔ قوم کی تاریخ ہی وہ سرچشمہ ہے جس سے افراد کی زندگی کے سوتوں کو پھونٹنا چاہیے۔ اگر افراد اور قومی تاریخ کا یہ سلسلہ کٹ جائے تو قوم کی شخصیت فنا ہو جاتی ہے۔ بے شک کوئی قوم اس دنیا میں کافی بالذات نہیں اور نہ وہ کبھی مستغنی عن الغیر ہو سکتی ہے۔ اسے دوسروں سے بہت کچھ اخذ کرنا پڑتا ہے۔ لیکن یہ اخذ و قبول کا عمل یوں ہونا چاہیے کہ قوم کا اپنا اسامی فکر فنا نہ ہو۔ وہ دوسروں کی اچھی باتوں کو اپنائے ضرور لیکن ان میں ضم ہو کر اپنے قومی وجود کو ختم نہ کر دے۔

ہم سے دوسری غلطی یہ ہوئی کہ غدر کے بعد سے لے کر اب تک ہمارے بڑے بڑے شعراء، مصنفین اور اہل علم نے ہندوستان کی اسلامی تاریخ اور اس کی ذہنی اور فکری روایات کو کبھی درخور اعتنا نہ سمجھا۔ انہوں نے ہمیشہ اپنی شاعری، انشا پر دازی، تحقیق و جستجو اور والہانہ عقیدت کے موضوع اسلامی ہندوستان کے بجائے بیشتر دور دراز اسلامی ملکوں میں ڈھونڈھے۔ مانا کہ اسلام کی تاریخ اور اس کی بڑی شخصیتیں سب مسلمانوں کے لیے مشترک ہیں لیکن عام طور پر انسان قریب کی چیزوں کو آسانی سے سمجھ

لیتا ہے۔ اور پھر ان کے ذریعہ سے وہ چیزیں جو زبان و مکان کے اعتبار سے اس سے دور ہوتی ہیں ان کو ذہن نشین کر سکتا ہے۔ یہ طریقہ صرف ذہن کے لیے سود مند نہیں بلکہ اس کی وجہ سے عمل میں بڑی مدد ملتی ہے۔ اور آدمی محض خیال کا ہو کر نہیں رہ جاتا۔ اس کے برعکس ہمارے اربابِ قلم نے اپنا سارا زور ایک ایسی دنیا کو پیش کرنے میں صرف کر دیا جس سے ہماری آنکھیں بالکل نا آشنا تھیں۔ اور ہمارے دماغ بھی اسے آسانی سے اپنا نہیں سکتے تھے۔ یہ محض ان کے تصورات کی دنیا تھی۔ جس پر ہندوستانی مسلمان جذبات کی وارفتگی کے عالم میں فدا تو ہو سکتے تھے لیکن اس دنیا کے یاں ہندوستان میں متشکل ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا نہ ہے اور نہ کبھی ہوگا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ نہ ہم ہندوستان کی اسلامی تاریخ سے ربط قائم رکھ سکے۔ اور نہ ہم نے باہر کی اسلامی دنیا کو اصل کے مطابق سمجھا، چنانچہ اس طرح ہم ہوا میں معلق ہو کر رہ گئے۔ ہم نے ہندوستانی مسلمانوں کی ایک فرضی شخصیت بنالی۔ جس کا عملی دنیا میں کہیں نام و نشان نہ تھا۔ ہم ایک ایسے اسلام کے راگ الاپنے میں لگے رہے جس کی کوئی عملی شکل ہمارے ذہنوں میں موجود نہ تھی۔ دوسرے اسلامی ملکوں میں جو قومی رہنما پیدا ہوئے اور انہوں نے اپنی قوموں کو نئی زندگی بخشی۔ ہم ان کی صلاحیتوں کا بھی صحیح اندازہ نہ لگا سکے اور ہم نے انہیں ہمیشہ ”گھٹیا قسم“ کے انسان سمجھا، کیونکہ ہم نے اپنے دماغوں میں جو معیار گھڑ لیے تھے وہ اتنے بلند اور ناقابل عمل تھے کہ بیسویں صدی میں کسی انسان کا ان پر پورا اترا محال تھا۔ آخر یہ ہوا کہ ہم اسلامی دنیا کی زندہ اور فعال تحریکوں سے بھی کٹ گئے اور خود اپنے ملک کے اندر ہمارا کوئی واضح اور متعین نصب العین بھی نہ بن سکا۔

مولانا کی رائے میں ہندوستانی مسلمانوں کے انتشار اور بے عملی کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ ان کا قومی وجود اپنے ماضی سے بالکل منقطع کر دیا گیا ہے۔ ہم خیالی باتوں کے پیچھے پڑ کر عملی دنیا اور اس کے لوازمات سے بے خبر ہو گئے ہیں۔ ضرورت اب اس امر کی ہے کہ ہماری قومی تاریخ کا جہاں سلسلہ ٹوٹا تھا اسے پھر از سر نو جوڑا جائے اور موجودہ زمانے کے تقاضوں کی مناسبت سے قومی فکر کی نئی تشکیل ہو۔

اس میں شک نہیں کہ اورنگ زیب کے بعد سے ہماری قومی تاریخ میں ایک بہت بڑا فصل پیدا ہو گیا۔ ہمارے سیاسی شیرازہ کے بکھرنے سے ہمارا تمدن، ہمارا فلسفہ اور ہمارا قانون بے کار ہو گئے ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں کہ ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہم شکست کھا گئے۔ اگر ہمارا تمدن، ہمارا فلسفہ اور ہمارا قانون ناقص نہ ہوتے تو ہمارا سیاسی وجود کیوں بگڑتا۔ ظاہر ہے اب تو زمانہ اور بھی بدل چکا ہے اس لیے ہمارا تمدن، ہمارا فلسفہ اور ہمارا قانون اب بچنے نہیں چل سکتے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ہمارا فکر بھی ناکارہ ہو گیا ہے۔ اس مسئلے کی وضاحت کرتے ہوئے ایک دفعہ مولانا نے فرمایا۔

”ہندوستان میں مسلمان آئے تو ہندو قوم کی حکومت تھی۔ ہندوؤں کا اپنا قانون تھا۔ اور ان کا اپنا ایک خاص فلسفہ تھا۔ ہندوؤں کی حکومت گئی۔ حکومت کے ساتھ ان کا قانون بھی رخصت ہوا لیکن فلسفہ باقی رہا۔ اس ہندو فلسفہ کا باہر کی انقلابی قوت سے تصادم ہوا۔ یہ انقلابی قوت اسی قسم کے ایک فلسفہ (تصوف) اور ایک بین الاقوامی تحریک (اسلام) کی حامل تھی۔ اس انقلابی قوت نے ہندوؤں کے فلسفہ کی تصحیح کی۔ اور اس میں ترقی پسند رجحان کا عنصر داخل کیا۔ اسی وجہ سے ہندوستان عزالت سے نکل کر پھر باہر کی دنیا میں بین الاقوامیت حاصل کر سکا۔“

”انگریز آئے تو مسلمانوں کی حکومت بھی پاش پاش ہو گئی۔ اس حکومت کا قانون زمانے کا ساتھ نہ دے سکتا تھا۔ وہ فنا ہوا البتہ ان کا فلسفہ باقی رہا۔ اس فلسفہ میں غلط کاروں کی غلط تعبیرات سے بہت کچھ فساد پیدا ہو چکا ہے لیکن اس کے باوجود اس کی روح اب تک اپنی اصلی حالت میں موجود ہے۔ یہ فلسفہ آج کی ترقی یافتہ طاقتوں سے کلی طور پر ہم نوا ہو سکتا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کی صحیح تعبیر ہو اور اس کی بنیادوں پر اسلامی ہندوستان کی نئی عمارت اٹھائی جائے۔“

مولانا فرماتے ہیں کہ اس کو تسلیم کرنے میں ہمیں باک نہیں ہونا چاہیے کہ ہماری سیاست ہمارا تمدن، ہمارا فلسفہ اور ہمارا قانون ایک زبردست قوت سے شکست کھا چکے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ عرصہ دراز تک ہماری قومی شخصیت نے اپنے آپ کو ان علمی اور عملی مظاہر میں جلوہ گر کیا ہے اور یہ چیزیں ہمارے قومی وجود کے لیے ایک حد تک لازمی ہو چکی ہیں۔ اس لیے ان کا کلی انکار کسی طرح ممکن ہی نہیں۔ یہ علمی و عملی آثار ہماری قومی تاریخ کا ایک حصہ بن چکے ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ ماضی کی اس وراثت کا پورا پورا جائزہ لیں۔ کھولنے کو الگ کر دیں۔ اور جو کھرا ہے اسے لے لیں۔ اور موجودہ زندگی کے تقاضوں کے ساتھ جن کا انکار کسی صورت ممکن نہیں۔ اور ان کا انکار کر کے ہم زندہ بھی نہیں رہ سکتے اس کھرے حصہ کو ہم آہنگ کریں۔

مولانا فرماتے ہیں کہ اس مسئلے میں ہمیں شاہ ولی اللہ صاحب سے بہتر کوئی مرشد اور امام نہیں مل سکتا۔ شاہ صاحب نے اسلام کی ایک ہزار برس کی تاریخ اور اس میں پیدا ہونے والی علمی مذہبی اور فکری تحریکوں کو اس خوبی سے حل کیا ہے کہ ماضی اسلام کی کل کائنات ہمارے سامنے واضح شکل میں آ جاتی ہے۔ اور ہمیں کھرے حصے کو کھولنے سے ابدی اور دائمی کو عارضی اور وقتی سے اور مفید اور کارآمد کو

بیکار اور فضول سے الگ کرنے میں دقت نہیں ہوتی۔ پھر شاہ صاحب نے اسلام کے اس دور کی تصویر خاص طور پر نہایت اہتمام اور تفصیل سے پیش کی ہے جو اسلام کا دور اول ہے اور اس کی حیثیت ہماری تاریخ میں ایک نمونے اور مثال کی ہے کہ سب اسی کو اپنی مشعل ہدایت بناتے چلے آئے ہیں۔ مولانا کے الفاظ میں ”آج ہم شکست کھا چکے ہیں۔ ہمارے تمام پروگرام ناکام ہو چکے ہیں۔ ہمیں اپنا مستقبل تاریک نظر آتا ہے۔ اور ہم میں سے کسی کے سامنے کوئی واضح راہ عمل نہیں۔ آج شاہ ولی اللہ کا فکر ہمارے لیے شمع ہدایت بن سکتا ہے۔“

مولانا چاہتے ہیں کہ ہندوستانی مسلمان ولی اللہی فکر کو اپنی قومی زندگی کا اساسی فکر بنائیں۔ اس سے ان کی زندگی میں ایک تو ہمیشہ کے لیے اسلام محفوظ ہو جائے گا۔ اور دوسرے ایک ہزار سال کے عرصہ میں مسلمانوں نے علم، حکمت، فلسفہ اور تصوف میں جو انٹل نغوش چھوڑے ہیں۔ وہ شاہ ولی اللہ کی حکمت کے ذریعہ ہمارے قومی ذہن کا اثاثہ بن جائیں گے۔ اور ماضی کی ”باقیات صالحات“ میں سے ایک شمع بھی ضائع کیے بغیر ہم آج کی دنیا میں دوسروں کے ساتھ چلنے کے قابل ہو جائیں گے۔ بلکہ اگر ہم ہمت کریں تو دوسروں سے ایک قدم آگے بھی جا سکیں گے۔

ولی اللہی فکر ہماری زندگی کی اساس بنے۔ یہ فکر اسلامی ہے۔ ہندوستانی ہے۔ ہماری قومی تاریخ کا ایک حصہ ہے۔ ہمارے مزاج کے لیے مناسب اور سازگار ہے۔ اس کی مدد سے ہماری جماعتی تنظیم ہو سکتی ہے۔ ہم اپنے اندر ضبط اور ڈسپلن پیدا کر سکتے ہیں۔ مستقبل کی طرف یہ ہے اسلامی ہند کا پہلا قدم۔ اتفاق سے اس ملک میں مسلمانوں کے علاوہ اور قومیں بھی آباد ہیں جو مسلمان نہیں۔ شاہ ولی اللہ کی حکمت اس معاملے میں بھی ہماری رہنمائی کرتی ہے۔ چنانچہ یہ حکمت ان اصول و قواعد کا تعین کرتی ہے جو مسلمانوں اور غیر مسلموں میں ایک دوسرے کا حق دباؤ بغیر صلح و آشتی کا سبب بن سکتے ہیں اور ان کی وجہ سے اس ملک کی ساری مخلوق باہم پیار و محبت سے رہ سکتی ہے۔ یہ ہماری قومی زندگی کا دوسرا قدم ہے۔ اس کے بعد ایک تیسری منزل ہے۔ یہاں ہمیں تمام انسانیت سے سابقہ پڑتا ہے۔ انسانیت کا ایک حصہ پیچھے رہ جانے والا ہوتا ہے۔ اس سے ہمیں اس وقت بحث نہیں۔ ہمارا مطلب یہاں صرف ترقی پسند انسانیت سے ہے۔ اس ترقی پسند انسانیت نے سیاست معیشت، اجتماع اور تمدن کے جو نظریے بنائے ہیں۔ اور وہ انہیں تجربہ کی کسوٹی پر پرکھ کر ان کی افادیت کو دیکھ چکی ہے۔ ولی اللہی فکر کی مدد سے ہم ان نظریات اور طریق ہائے کار کو بھی اپنے قومی وجود میں سمو سکتے ہیں۔ قصہ مختصر شاہ ولی اللہ کا فکر ہمیں ایک سچا مسلمان، ایک اچھا ہندوستانی اور آگے بڑھنے والا انسان بننے میں ہماری مدد کر سکتا ہے۔

مولانا فرماتے ہیں کہ ہم اس وقت جس مذہبیت کا شکار ہو رہے ہیں۔ یہ مذہبیت روکی ہوئی ہے۔ یہ سنی کو شیعہ سے لڑاتی ہے۔ اہل حدیث کا دل حنفی سے میلا کرتی ہے۔ اہل اہم اور غیر اہم مذہبیت کا نفرت ڈالتی ہے۔ اور ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کا جانی دشمن بناتی ہے۔ اس مذہبیت نے طفیل انسان انسان کے خون کا پیاسا ہو گیا ہے۔ میں اس روگی مذہبیت کو مٹانا چاہتا ہوں۔ یہ امتداد ہے کہ ہم شاہ ولی اللہ کے بتائے ہوئے اصولوں پر مسلمان بنیں۔ اس سے نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کو آپس کی فرقہ پرستی مٹ جائے گی بلکہ ایک مسلمان کے دل میں اتنی وسعت پیدا ہو سکے گی کہ ہندوؤں کے ساتھ سیاسی اور معاشی معاملات میں پورا تعاون کرے۔ ان دونوں میں وحدت الوجود مشترک دینی فکر اساس مولات بن سکے گا۔ پھر اس ہندوستانی مسلمان کو میں آج کی دنیا کے بیڑے الاقوامی ترقی پسند انسانی تصور کا حامل دیکھنا چاہتا ہوں۔ اسی لیے میں اسے یورپ کے علوم سائنس اور طریقہ ہائے تنظیم کو اپنانے کی دعوت دیتا ہوں۔ مولانا کا کہنا یہ ہے کہ ہمارے موجودہ مذہبی طبقے ناکام ہو چکے ہیں۔ وہ آسانی سے رجعت پسندی کے آلہ کار بن جاتے ہیں۔ نیز اب تک مذہب کے نام سے ہمارے یہاں جو تحریکیں چلیں ان سے خود مسلمانوں کے اندر افتراق اور جھگڑے پیدا ہو گئے۔ پھر بات بھی ہے کہ ہم چاہیں یا نہ چاہیں اس وقت ہمیں چاروں طرف سے زبردست سیاسی اور اقتصاد تحریکیں گھیرے ہوئے ہیں۔ ہماری زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جو ان کی زد سے بچ سکا ہو اور خود ہمارے اپنی ضرورتیں بھی اس امر کا تقاضا کرتی ہیں کہ ہم ان تحریکوں سے بے تعلق نہ رہیں۔ چنانچہ ہمیں ان تحریکوں کا خیر مقدم کرنا چاہیے۔ اور اس معاملہ میں اگر ہمارے نام نہاد مذہبی طبقے بھی آڑے آئیں ان کی پروا نہ کرنی چاہیے۔

مولانا کے نزدیک ان قومی اور بین الاقوامی سیاسی اور اقتصادی تحریکوں کو کسی نہ کسی حد تک اپنائے بغیر آج دنیا کا کوئی کام نہیں چل سکتا۔ لیکن وہ فرماتے ہیں کہ میں ان تحریکوں کی بنیاد ایک وسیع تر ولی اللہی تخیل پر رکھنا چاہتا ہوں۔ جو تمام مذاہب، اجناس، اقوام اور کل کی کل انسانیت کو اپنے دامن میں لے لے۔ اس سے فرق مراتب، فرق مذاہب اور فرق اقوام کا بے جا تعصب اور غلط کی ہٹ دھرمی جس نے کل انسانوں کو ایک دوسرے کا دشمن بنا دیا ہے، مٹ جائیں گے۔ اور انسانیت کا قافلہ ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکے گا۔ دراصل آیت ”لیظہرہ علی الدین کلہ“ یعنی ایک دین جو سب ادیان پر جامع ہو، کا یہی مطلب ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ اس حقیقت تک میں شاہ ولی اللہ کے واسطے سے پہنچا۔ اس لیے میں شاہ صاحب کو اپنا امام مانتا ہوں اور اپنی قوم کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ ولی اللہی حکمت کو اپنی اساس فکر بنائے۔ میرے نزدیک ہندوستانی مسلمان کی قومی شخصیت اس کے ذریعہ اپنے کمال کو پہنچ سکتی ہے۔

وہ رُوح جو کل کائنات میں جاری و ساری ہے۔ جو کچھ ہمیں نظر آتا ہے سب اسی رُوح کا جلوہ ہے۔ اور دنیا کی ابتدا سے لے کر اب تک ہر قوم کے بزرگ اسی رُوح کی ترجمانی کرتے آئے ہیں۔ مولانا چاہتے ہیں کہ ان کا ہندوستان اس فکر پر اپنی نئی تعمیر کرے۔ اس طرح اشوک، اکبر اور عالمگیر کے ناقص کاموں کا اتمام کرنے کی ہمت کرے اور ایک دفعہ ساری دنیا کو اس بلند ہمہ گیر انسانیت افروز فکر سے آشنا کر دے۔ یہ ہے مولانا کے نزدیک ہندوستان کے مستقبل کا تصور جس میں ہندوستانی مسلمان ایک اہم اور موثر خدمت سرانجام دے سکتا ہے۔

”جہان تازہ“ تو اس کا منتظر ہے کہ کوئی اسے پردہ تقدیر سے باہر نکالے لیکن ضرورت اس وقت ”افکار تازہ“ کی تھی۔ مولانا کی زندگی کا حاصل انہی ”افکار تازہ“ سے اپنی قوم کو آشنا کرتا ہے۔

پیشک مولانا کی یہ دعوت اس لحاظ سے صرف ہندوستانی مسلمانوں کے لیے ہے لیکن ولی اللہی حکمت کا ایک عمومی پہلو بھی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ امام ربانی اور عالمگیر ہندوستان کی اسلامی سلطنت کو ایک بین الاقوامی طاقت بنانا چاہتے تھے۔ جس طرح کسی زمانہ میں اشوک نے بدھ سلطنت کو بنایا تھا۔ وہ عہد بیت گیا۔ ظاہر ہے اب نہ اشوک کا دور لوٹ سکتا ہے۔ اور نہ عالمگیر کی اسلامی سلطنت واپس آ سکتی ہے۔ چنانچہ آئندہ جو بھی یہاں آزاد سلطنت بنے گی۔ وہ کل اقوام ہند پر مشتمل ہوگی۔ اور یہی سلطنت باہر کی بین الاقوامی دنیا میں اس ملک کی نمائندگی کرے گی۔ ادارے ہمیشہ کسی فکر کے مظہر ہوتے ہیں۔ اس ہندوستانی سلطنت کی اساس کوئی ایسی فکر ہونا چاہیے۔ جو یہاں کی سب قوموں میں مشترک ہو۔ اور اس کو بنانے سنوارنے اور پروان چڑھانے میں سب کا حصہ ہو۔ تاکہ ہر گروہ اسی کو اپنا سکے۔ مولانا کا ارشاد ہے کہ ولی اللہی حکمت اس میں ہندوستانی مشترک فکر کی بنیاد بن سکتی ہے۔ اس حکمت نے اپنے پہلے کے ہندو فکر کو کلیتہً رد نہیں کیا۔ بلکہ اس کے بنیادی اصولوں کی صداقت کو تسلیم کیا۔ اس کے صالح حصہ کو اپنایا۔ اور اسے ہندوستانی اسلامی فکر کا ایک قابل عزت جزو بنایا۔ اگر آج یہ فکر پورے یورپ کے اچھے اثرات کو اخذ کر کے نئے زمانہ کی ضرورتوں کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال سکے۔ لیکن اس طرح کہ اپنے وجود کو کالعدم نہ کر دے تو یہ فکر ویدک ہندو اسلامی ہند اور آج کے ہندوستان کا نقطہ کمال بن سکتا ہے۔ اس کی بنیادوں پر متحدہ ہندوستان کی سربفلک عمارت اٹھ سکتی ہے۔ اس کے ذریعہ یہاں کے مذاہب، اجناس، اقوام کی آپس کی پھوٹ ختم کی جاسکتی ہے۔ سب عقلاً فلاسفہ اوتاروں اور انبیاء کی تعلیمات کا اصلاً ایک ہونا اور ان سب کا ایک ہی حظیرۃ القدس سے فیض یاب ہونا ذہن نشین ہو سکتا ہے اور اس سے سچی رواداری اور انسان دوستی پیدا ہو سکتی ہے۔ یہ مجموعی فکر ہوگا جس کے ماتحت ہندو اپنے اصولوں پر زندگی بسر کر سکتے ہیں اور مسلمان اپنے اصولوں پر۔ مسلمان اسلام کے تفصیلی قوانین کو اپنی اجتماعی زندگی کا ضابطہ بنائیں۔ اور ہندو اپنے دھرم کے قواعد کو مانیں۔ لیکن یہ مجموعی فکر تمام مذاہب اور نظام ہائے اخلاق کی بنیادی اور ناقابل تغیر حقیقتوں پر مشتمل ہو۔ اور کوئی انسانی فکر اس کا انکار نہ کر سکے۔

مولانا فرماتے ہیں کہ اس طرح از اول تا آخر ہندوستان کی تاریخ کا ایک تسلسل قائم ہو سکتا ہے۔ آریاؤں سے لے کر اس وقت تک اس کے فکری ارتقاء کی سب کڑیاں آپس میں جڑ سکتی ہیں۔ ویدک، اسلامی اور موجودہ عہد اس کی شاہراہ زندگی کی درجہ وار منزلیں بن سکتی ہیں۔ مولانا کے نزدیک ہزار ہا سال کے اس سلسلہ دراز کی ہر کڑی ہندوستانی تاریخ کا ایک اٹوٹ حصہ ہے جس کے نہ ہونے سے ہمارا ملک وہ نہ بن سکتا جو اس وقت یہ ہے۔

ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”جب احمد حسن نے یا مرزا محمد علی اشتر کی جماعت میں شامل ہو گیا تو ہمارا معتد اس زمانے میں ظفر حسن رہا۔ افغانی انگریزی محاربہ (مئی ۱۹۱۹ء) میں ظفر حسن سردار سپہ سالار (جنرل محمد نادر خاں جو بعد میں افغانستان کے بادشاہ بنے) کے ساتھ ٹل کے محاذ پر تھا۔ وہاں اس کے کارنامے بہت زیادہ قابل تحسین سمجھے گئے اور سلطنت افغانیہ اسے برائے نام خدمت کرنے پر مقررہ تنخواہ دیتی رہی۔ جس سے ہمارے کئی ہندوستانی بھائی گزارہ کرتے رہے۔ ظفر حسن کے مددگار اللہ نواز خاں مقرر ہوئے جو گورنمنٹ کالج لاہور میں ظفر حسن کے ہم جماعت تھے۔“

ٹل کے محاذ پر سردار سپہ سالار محمد نادر خاں متعین تھے۔ ان کی جنگی فراست اور تدبیر و حوصلہ سے اس محاذ پر افغانی فوج کو فتح ہوئی۔ اس معرکے میں ظفر حسن صاحب کی ریاضی دانی بڑے کام آئی۔ وہ ہجرت کے وقت گورنمنٹ کالج لاہور میں ریاضی کے بی اے فائنل میں تھے اور امتحان میں صرف ایک ماہ باقی تھا۔ ان کی بتائی ہوئی پیمائش پر جب توپ سے گولہ پھینکا گیا تو وہ قلعہ کے گوداموں پر پھٹا جس سے وہاں آگ لگ گئی اور اس سے مجاہدین کے حوصلے بڑھ گئے۔ بعد میں نادر خاں نے اس کا کھلے دل سے اعتراف کیا اور انہیں دربار شاہی میں اعلیٰ حضرت امان اللہ خاں کے سامنے پیش کرتے ہوئے یہ کلمات کہے:

”اس نوجوان کی عمر کم ہے لیکن اس نے ایسی بہادری دکھائی ہے کہ فوج کے بڑے بڑے اور تجربہ کار افسروں کو مات کر دیا ہے۔“

ٹل شہر پر قبضہ ہو گیا تو ظفر حسن صاحب کو اس کا سول ایڈمنسٹریٹر بنا دیا گیا۔ ان کے الفاظ میں:

”اس طرح میں اس پہلے آزاد ہندوستانی شہر کا پہلا سول ایڈمنسٹریٹر بنا۔ (ٹل ضلع کوہاٹ میں ہے) میں نے شہر میں کریولنگا دیا۔ اس کی وجہ سے رات کو شہر میں کوئی واردات نہ ہوئی۔“

اول ۱۹۱۹ء میں ہندوستان میں ایک اضطراب برپا تھا۔ ملک بھر میں عوام رولٹ ایکٹ کے خلاف ایچی ٹیشن کر رہے تھے۔ اس میں پنجاب پیش پیش تھا۔ اپریل میں امرتسر میں جلیانوالہ کا خونیں واقع ہوا اور پنجاب کے اور شہروں میں بھی زبردست ہنگامے ہوئے جن کی وجہ سے انگریزی حکومت

۱۔ اصلی نام ڈاکٹر خوشی محمد تھا وہ افغانستان ہجرت کرنے سے پہلے میڈیکل کالج لاہور میں طالب علم تھے۔

ضمیمہ

مولانا عبید اللہ سندھی

کا

ایک تاریخی سیاسی منشور

شائع کردہ از استانبول (ترکی) ۱۹۲۲ء

ابھی حال ہی میں مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کے کابل، روس اور ترکی کے ایک ساتھی اور عقیدت مند ظفر حسن ایک صاحب کی آپ بیتی تین حصوں میں لاہور سے شائع ہوئی ہے۔ اس میں مولانا عبید اللہ سندھی کی کابل، روس اور ترکی کے دوران قیام کی سرگرمیوں کا مفصل تذکرہ ہے۔

پہلی جنگ عظیم کے دوران جب برطانیہ اور ترکوں کی عثمانی خلافت کے مابین جنگ ہو رہی تھی۔ ظفر حسن صاحب لاہور کے بعض دوسرے مسلمان طالب علموں کے ساتھ ترکوں کی حمایت میں برطانیہ کے خلاف لڑنے کے لیے وطن کو خیر باد کہہ کر افغانستان گئے۔ یہ ۱۹۱۵ء کا واقعہ ہے۔ کابل میں ان کی مولانا سندھی سے ملاقات ہوئی۔ جن سے نہ صرف انہوں نے دینی علوم پڑھے۔ بلکہ سیاسی تربیت بھی حاصل کی۔ وہ گیارہ سال تک مولانا کے معتمد ترین ساتھی رہے۔ ۱۹۲۶ء میں مولانا حجاز تشریف لے گئے۔ اور ظفر حسن صاحب ترکی ہی میں رہ پڑے اور ترکی کی انہوں نے شہریت اختیار کر لی۔ موصوف ترکی فوج میں داخل ہوئے اور اب کیپٹن آرٹلری کے عہدے سے ریٹائر ہو کر استانبول میں مقیم ہیں۔

ایک صاحب کی آپ بیتی ہماری قومی تاریخ کے اس اہم دور کی ایک مستند روئیداد ہے۔ موصوف نے اس کتاب میں اس زمانے کی بہت سی تاریخی دستاویزیں محفوظ کر دی ہیں۔ یہ سیاسی منشور جو ۱۹۲۲ء میں استنبول (ترکی) سے مولانا عبید اللہ سندھی اور خود مصنف کے دستخطوں سے شائع کیا گیا تھا، اسی کتاب کے حصہ دوم میں درج ہے۔

مولانا مرحوم نے مکہ معظمہ کے قیام کے دوران میں جب کہ انہیں واپس وطن آنے کی اجازت ملنے کی کوئی امید نہ تھی، کابل میں سات سال کے عنوان سے ایک مختصر سی تاریخی یادداشت مرتب کی تھی۔ اس میں وہ کابل کے زمانے کے اپنے نوجوان ساتھیوں کے ضمن میں ظفر حسن صاحب کا

نے مارشل لا لگا دیا۔ ظفر حسن صاحب نے ان واقعات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ افغانستان کو اپنی آزادی حاصل کرنے کے لیے اس سے بہتر اور کوئی موقع نہ مل سکتا تھا۔

چنانچہ امیر امان اللہ خان نے مئی ۱۹۱۹ء میں انگریزوں سے لڑائی چھیڑ دی۔ ظفر حسن صاحب لکھتے ہیں:

”قبلہ مولانا نے ایک رات کو مشین خانہ کابل کے چھاپے خانے میں جا کر ہندوستانیوں کے نام اردو اور انگریزی میں اعلان چھاپے جن میں انہیں انگریزوں کے خلاف ہتھیار اٹھانے کی دعوت دی۔ یہ اعلان ہندوستان پہنچوائے گئے اور مولانا کے بھتیجے اور مولانا احمد علی کے بھائی ان اعلانات کو حیدرآباد دکن تک پہنچا کر آئے۔“

اس وقت کا افغانستان جس کے پاس کوئی باقاعدہ فوج تک نہ تھی، برطانیہ جیسی عظیم سلطنت سے کیا لڑتا؟ بقول ظفر حسن صاحب..... اگر انگریزوں کو یہ ڈر نہ ہوتا کہ افغانستان سے جنگ نے طول پکڑا تو ہندوستان کے اندر بغاوت ہو جائے گی۔ اور یہ کہ افغانستان میں مقیم محبت الوطن ہندوستانی حکومت افغانستان کو ہر طرح کی کمک پہنچا رہے ہیں تو چند دن بعد ہی افغان فوج کی ہوا اکھڑ جاتی اور امیر امان اللہ خاں کو بہت جھک کر صلح کرنی پڑتی۔

بہر حال اس جنگ کے نتیجے میں افغانستان برطانیہ کی تولیت اور ماتحتی سے آزاد ہو گیا اور اسے دوسرے ملکوں سے براہ راست سفارتی تعلقات قائم کرنے کا حق ہو گیا۔

حکومت برطانیہ نے افغانستان کی خود مختاری تو تسلیم کر لی لیکن اب اس نے کابل میں مقیم محبت الوطن ہندوستانیوں کے خلاف سازشوں کا سلسلہ شروع کر دیا اور اس میں بد قسمتی سے انگریز پرست افغان طبقے اس کے آلہ کار بنے۔ آخر کار صورتحال یہ ہو گئی کہ مولانا عبید اللہ سندھی اور ان کے نوجوان ساتھیوں کے لیے کابل میں مزید قیام کرنا مشکل ہو گیا۔

ظفر حسن صاحب ان واقعات کا خلاصہ ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔

”ان تمام امور سے یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ حکومت افغانستان نے اب انگریزوں سے صلح کر کے ہندوستانی قوم پرستوں کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ قبلہ مولانا صاحب کے لیے صرف دو راستے رہ گئے تھے۔

۱۔ افغانستان میں بالکل خاموش بیٹھ جائیں اور باقی زندگی سیاست سے کنارہ کشی کر کے بالکل بے کار گزار دیں۔ یہ راستہ ان کی سیاسی موت کا تھا۔

۲۔ افغانستان چھوڑ کر کسی اور ملک میں رہیں اور وہاں سے انگریزوں کے برخلاف اپنا کام جاری رکھیں۔

آخری فیصلہ کرنے کے لیے قبلہ مولانا نے تقریباً ایک سال غور کیا اور آخر روس کے راستے ترکی پہنچنے کی تجویز طے ہوئی۔“

مولانا ۱۱۵ اکتوبر ۱۹۱۵ء کو کابل پہنچے تھے اور اس سے چند ماہ پہلے مارچ ۱۹۱۵ء میں ظفر حسن صاحب اور ان کے لاہور کے کالجوں کے طالب علم ساتھی افغانستان میں داخل ہوئے تھے۔ سات سال بعد ۱۱۳ اکتوبر ۱۹۲۲ء کو مولانا ظفر حسن صاحب اور بعض دوسرے ہندوستانی نوجوان روسی علاقے میں داخل ہوئے۔ سوویت یونین میں کوئی ایک سال گزارنے کے بعد مولانا ترکیہ چلے گئے اور بعد میں ظفر حسن صاحب بھی وہاں پہنچ گئے۔

”کابل سے ہجرت“ کر کے مولانا نے کیوں ماسکو جانا طے کیا اور اس کے بعد وہ تاریخی سیاسی منشور جو زیر بحث ہے، استنبول میں کیسے وجود میں آیا اور اس کی اشاعت کی کوشش کی گئی۔ اس کا ضروری مواد خود مولانا عبید اللہ سندھی کی تحریروں سے یہاں دیا جاتا ہے:

اپنی تاریخی یادداشت ”کابل میں سات سال“ میں جو ۲۵ جمادی الثانی ۱۳۵۲ھ کو مکہ معظمہ میں مولانا نے مرتب فرمائی وہ لکھتے ہیں:

”ہماری کابل کی زندگی کے آخری ایام میں مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی اور مولانا حسین احمد مدنی جیل میں تھے اور ہمارے رفیقوں کو ہم سے علیحدہ کرنے کی تجویزیں ہو رہی تھیں۔ ایسے حالات میں آرام سے بیٹھ کر شاہی مہمانی کا لطف اٹھانا ناممکن تھا۔ سوویت ریشا سے تعلقات کی ابتدا اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ خاں کی اجازت اور مصلحت سے بروئے کار آئی جس میں راجہ مہندر پرتاب نے کافی حصہ لیا۔ انہیں کی تجویز پر ہمارے نوجوان آتے جاتے رہے۔ جب ماسکو میں ہندوستانی اشتراکی جماعت قائم ہوئی اور اس کا مرکز تاشقند قرار دیا گیا تو اس کے لیڈر جو بندر ناتھ رائے (ایم۔ این۔ رائے) مقرر ہوئے جو اسے کئی سال تک چلاتے رہے اس لیے ہمارے دوست ہو گئے۔ اب ہم نومبر ۱۹۲۲ء میں دریائے جیحون عبور کر کے ترمذ میں سوویت کارسازوں کے مہمان

ہوئے۔ اور دنیا کی انٹرنیشنل سیاست کا نیا مشاہدہ شروع کر دیا۔“

کابل ہی کے زمانہ قیام میں مولانا کے بعض نوجوان ساتھی ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کے

باقاعدہ رکن بن گئے تھے اور انہی کے توسط سے کابل میں متعین سوویت سفارتی عہدیداروں سے مولانا کی ملاقاتیں بھی ہوتی رہتی تھیں۔ یہ اعلیٰ حضرت امان اللہ خاں کے برسر اقتدار آنے کے بعد کے واقعات ہیں۔

جیسا کہ کتاب میں بارہا ذکر ہو چکا ہے مولانا سندھی کی سیاسی جدوجہد کا آغاز ”تحریک اتحاد اسلام“ کے ایک سرگرم حامی کی حیثیت سے ہوا تھا۔ جب وہ کابل پہنچے تو امیر امان اللہ خاں کے والد امیر حبیب اللہ خاں نے انہیں ہندوؤں کے ساتھ مل کر ہندوستانی کام کرنے کا حکم دیا۔ امیر امان اللہ کے عہد میں ۱۹۲۲ء میں مولانا نے کابل میں کانگریس کمیٹی بنائی جس کا الحاق آل انڈیا کانگریس نے اپنے گیسٹیشن میں کر لیا تھا۔

کابل سے جب وہ عازم ماسکو ہوئے تو ان کی سیاسی زندگی کا تیسرا دور شروع ہوتا ہے۔ ۱۹۳۸ء کے شروع میں جب مولانا کو واپس ہندوستان آنے کی اجازت ملی تو مکہ معظمہ ہی سے انہوں نے ہندوستان کے بعض اخبارات کو ایک بیان بھیجا تھا جس میں لاہور کے اخبارات میں ان کے بارے میں جو غلط باتیں چھپی تھیں ان کی تصحیح کی گئی تھی۔

اپنے اسی اخباری بیان میں وہ ”سیاحت روس“ کے زیر عنوان لکھتے ہیں:

”۱۹۲۳ء میں ترکی جانا ہوا۔ سات مہینے ماسکو میں رہا۔ سوشلزم کا مطالعہ اپنے نوجوان رفیقوں کی مدد سے کرتا رہا۔ چونکہ نیشنل کانگریس سے تعلق سرکاری طور پر ثابت ہو چکا تھا اس لیے سوویت روس نے اپنا معزز مہمان بنایا اور مطالعہ کے لیے ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائیں۔ میرے اسی مطالعہ کا نتیجہ ہے کہ میں اپنی مذہبی تحریک کو جو امام ولی اللہ کے فلسفہ کی ایک شاخ ہے اس زمانے کے لادینی حملے سے محفوظ کرنے کی تدابیر سوچنے میں کامیاب ہوا۔“

مولانا کی ان تدابیر کی ایک جھلک آپ کو اس تاریخی سیاسی منشور میں ملے گی جس کا خلاصہ ظفر حسن صاحب کی آپ بیتی ہی سے ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔

محمد سرور

مئی ۱۹۷۶ء

قبلہ مولانا صاحب نے بحث و مباحثہ کے بعد ترمیم کر کے ہندوستان کی آزادی اور آزاد ہندوستان کی حکومت کے لیے جو پروگرام مرتب کیا تھا اس کے اہم مواد کا خلاصہ ذیل میں درج کرتا

ہوں۔

یہ پروگرام ذیل کے مقاصد حاصل کرنے کے لیے تیار کیا گیا تھا:

۱۔ ہندوستان کے لیے کامل آزادی حاصل کرنا اور آزاد ہندوستان میں ایک وفاقی (Federal System) نظام حکومت قائم کرنا۔

۲۔ ہندوستان میں مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں اور اسلام کو محفوظ کرنا۔

۳۔ ہندوستان میں محنت کش طبقہ کی یعنی کسان، مزدور اور دماغی کام کرنے والوں کی اکثریت رکھنے والی حکومت قائم کرنا۔ زمینداری اور سرمایہ داری کو ملک سے ختم کر دینا۔ تاکہ عوام کیونزوم کے سبز باغ دیکھ کر دھوکا نہ کھائیں۔

۴۔ امپریالزم کا توڑ کرنے کے لیے ایشیاٹک فیڈریشن (Asiatic Federation) بنانا۔

سروراجیہ پارٹی

ان مقاصد کو ہاتھ میں لانے کی کوشش کرنے والی پارٹی کا نام قبلہ مولانا صاحب نے سروراجیہ پارٹی رکھا تھا۔ ”سرو“ کے معنی ہندی میں ”سب“ کے ہیں اس لیے اس پارٹی کے نام کے معنی (سب کا راج) قائم کرنے والی پارٹی ہے۔ جو سب لوگوں کی رنگ مذہب مال و دولت فرق کے بغیر حکومت قائم کرے گی۔

اس سے کمیونسٹوں کے پروگرام کی شروع ہی تے توڑ ہو جاتی ہے۔ کیونکہ کمیونسٹ صرف (Proletariates) مزدوروں کی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں جس میں زمینداروں، سوداگروں اور کارخانہ داروں کی نمائندگی کا حق نہیں ہوتا۔

سروراجیہ پارٹی کے ممبروں کے لیے قبلہ مولانا صاحب نے یہ شرط لگائی تھی کہ وہ اپنے طرز زندگی کو ملک کے کسانوں کے درجہ زندگی سے بلند نہ کریں گے۔ یعنی اتنی ہی آمدنی پر گزارہ کریں گے جتنی کہ اوسط درجے کے کسان کی ہوتی ہے اور اس سے زیادہ جو ان کی آمدنی یا جائیداد ہوگی اس کو پارٹی کو دے دیں گے۔

نظام توافق

پارٹی ہندوستان کو ایک ملک فرض نہ کرے گی اور نہ ہندوستان میں واحد قومیت کو پیدا کرنے کی کوشش کو اساس آزادی مانے گی۔ بلکہ ملک میں نظام توافق (فیڈرل سسٹم) پر حکومت قائم کرے گی جس کے لیے مندرجہ ذیل طریقہ اختیار کیا جائے گا۔

جغرافیائی حیثیت سے ہندوستان شمال مغربی، مشرقی اور جنوبی تین قدرتی حصوں سے متشکل ہونے کی وجہ سے ان حصوں کو ایسے صوبوں میں تقسیم کیا جائے گا جہاں ایک ہی زبان بولی جاتی ہو۔ اور جہاں ایک ہی قسم کے رسم و رواج اور ایک ہی تمدن رکھنے والے لوگ آباد ہوں۔ ان صوبوں کو بعد میں ایک (جمہوری ملک) قرار دیا جائے گا۔ جس کی جمہوری حکومت کو معاملات خارجہ معاملات جنگ اور خارجی تجارت کے سوا اپنے تمام امور پر اختیار حاصل ہوگا۔ (مثلاً اس طرح شمال مغربی ہندوستان (مشرقی پنجاب، مغربی پنجاب، صوبہ سرحد، کشمیر، سندھ، بلوچستان اور گجرات) جیسے جمہوری ملکوں میں تقسیم ہو جائے گا۔ مشرقی اور جنوبی ہندوستان کو بھی اسی طرح کے جمہوری ملکوں میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ یہ جمہوری ملک مرکزی وفاقی (فیڈرل) حکومت ہند میں شامل ہونے سے پہلے اگر چاہیں تو اپنے تمدن اور رسم و رواج کی وحدت کی بنا پر باہم مل کر خود ایک وفاقی نظام میں منسلک ہو سکتے ہیں۔ مثلاً مغربی پنجاب، صوبہ سرحد، کشمیر، سندھ، بلوچستان آپس میں مل کر اور ایک وفاقی نظام بنا کر مرکزی حکومت ہند میں شامل ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح مشرقی اور جنوبی ہند کی جمہوری حکومتیں اگر چاہیں تو باہم مل کر مرکزی حکومت میں داخل ہو سکتی ہیں۔

ان جمہوریتوں میں ہر عاقل، بالغ، مرد اور عورت کو حق انتخاب دیا جائے گا لیکن ہر اجتماعی طبقہ Social class یعنی کسان، مزدور، دماغی کام کرنے والے لوگ، تاجر اور کارخانہ دار، مجلس قانون سازی میں اپنی آبادی کے تناسب سے اور اپنے ہی طبقے سے نمائندے چنے گا۔ اس طرح ان جمہوریتوں کی پارلیمنٹ میں کسان، مزدور اور دماغی کام کرنے والے لوگوں کی اکثریت ہوگی اور یہ مجلس محنت کشوں کے مفاد کی حفاظت کر سکے گی۔

اقتصادی اور سماجی بنیادی اصول

فوائد عامہ کے تمام ذرائع قومی ملکیت میں دے دیئے جائیں گے۔
انفرادی اور ذاتی ملکیت (منقولہ اور غیر منقولہ) محدود کر دی جائے گی۔ یعنی معین حد سے زیادہ جائیداد اور مال قومی ملکیت ہوگا۔

مال داروں پر مستزائد ٹیکس لگایا جائے گا جس کی آخری حد پچاس فیصدی ہوگی۔ ملک کی زمینیں قومی ملکیت قرار دی جائیں گی۔ اور نظام زمینداری منسوخ کر دیا جائے گا۔ ان جمہوریتوں میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہوگی پارٹی فاروق اعظم کے فیصلے کے مطابق زمینداروں کو زمین کی ملکیت چھوڑنے پر اور امام ابوحنیفہ کے فیصلے کے مطابق مزارعت چھوڑنے پر مجبور کرے گی۔

ہر کاشت کار خاندان کو اس قدر زمین ضروری جائے گی جس قدر کہ وہ خود کاشت کر سکے۔

سودی لین دین بالکل ختم کر دیا جائے گا۔ اور محنت کش طبقہ کے پرانے قرضے بے باق کر دیئے جائیں گے۔

قومی ملکیت میں دیئے ہوئے کارخانوں کو مزدوروں کی انجمنوں کے ذریعہ چلایا جائے گا اور مزدوروں کو نفع میں سے حصہ دیا جائے گا۔

محنت کش طبقہ کو مفت طبی امداد دی جائے گی۔ اور اس کے لیے سترے گھر مہیا کیے جائیں گے۔

ابتدائی اور مڈل سکولوں کی تعلیم مجبوری (یعنی جبری) اور مفت ہوگی۔

داخلی تجارت کو آپریٹو (CO-OPERATIVE) سوسائٹیوں کے ہاتھ میں ہوگی۔ لیکن سوداگران کو آپریٹو سوسائٹیوں میں داخل ہو کر ان کے ممبر بن سکیں گے۔

خارجی تجارت مرکزی حکومت کے ہاتھ میں ہوگی۔ ہر ایک جمہوریت اپنی اکثریت کے مذہب کو اپنا سٹیٹ مذہب قرار دے سکتی ہے۔ بشرطیکہ وہ مذہب پارٹی کے مندرجہ بالا اقتصادی اور اجتماعی اصولوں کا مخالف نہ ہو۔

مرکزی حکومت وفاقی جمہوریت

مرکزی حکومت ہند کا مذہب سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔ اور نہ اس کو ان مذاہب میں دخل دینے کا حق ہوگا۔ جو پارٹی کے مندرجہ بالا اقتصادی اور اجتماعی اصولوں کو مانتے ہیں (یعنی مرکزی حکومت ایک ولادینی سیکولر حکومت ہوگی۔)

مرکزی حکومت خارجی اور جنگی معاملات اور خارجی تجارت اپنے ہاتھ میں رکھے گی۔

مختلف جمہوریتیں مرکزی حکومت میں اپنے تناسب آبادی، اقتصادی، تمدنی اور فوجی اہمیت کی بنا پر حق نمائندگی حاصل کریں گی۔

امپیریا لزم کو توڑنے اور ایشیا میں مندرجہ بالا اصولوں پر آزاد حکومتیں قائم کرنے کے لیے ایشیا ٹک فیڈریشن بنائی جائے گی جس میں روس کو بھی شامل کیا جائے گا۔

روس کو ایشیا ٹک فیڈریشن میں شامل کرنے میں یہ مقصد مد نظر تھا کہ اس سے انگریزی امپیریا لزم کے خلاف مدد ملی جائے اور اس کو آزادی کے بعد ہندوستان کے معاملات میں محنت کشوں کی حمایت کے بہانے سے دخل اندازی کرنے کا موقع نہ دیا جائے۔

مندرجہ بالا خلاصے سے قارئین کو معلوم ہو سکتا ہے کہ اس پروگرام کے ذریعہ (مذہبی سوال کو درمیان لائے بغیر) ہندوستان میں رہنے والی اقلیتوں کی ہستی کو محفوظ کرنا اور ہندوستان کے ان علاقوں

کو جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے ایک جگہ جمع کرنا اور ان علاقوں میں اسلام کو سرکاری مذہب بنانا اور مسلمانوں کا ہندوستان کے اندر رہ کر اپنی ہستی اور اپنی تہذیب کو محفوظ رکھنا ممکن تھا۔

۱۹۲۳ء میں جب پروگرام مرتب کیا گیا تھا۔ ہندوستان کی فضا اور ہندو مسلم تعلقات اتنے خراب نہ تھے جیسے کہ ۱۹۳۰ء میں اور بعد میں نئی اصلاحات ملنے پر ۱۹۳۷ء میں ہو گئے تھے۔ جس کی وجہ سے مسلمانوں کو ہندوؤں سے بالکل جدا ہونے کی ضرورت محسوس ہوئی تھی لیکن اس کے باوجود قبلہ مولانا صاحب نے دور اندیشی سے ۱۹۲۳ء ہی میں ہندوستان کے لیے ایک ایسا وفاقی فیڈرل نظام (FEDERAL SYSTEM) تجویز کیا تھا جس میں مسلمانوں کی اکثریت رکھنے والی جمہوریتوں کو باہم مل کر اور ایک وفاقی نظام میں منسلک ہو کر ہندوستان کی مرکزی حکومت میں شامل ہونے کا موقع ملتا اور اس طرح وہ اپنی ہستی اور اپنی تہذیب قائم رکھ سکتیں۔ نیز ان کو مرکزی حکومت میں ان کی سیاسی اور فوجی اہمیت اور تناسب آبادی کے مطابق نمائندگی کا حق دینا تجویز کیا گیا تھا۔

ہمارے پاس پروگرام کو خفیہ طور پر ہندوستان بھیجنے کے لیے روپیہ نہ ہونے کی وجہ سے ہم نے مجبوراً اس کو ڈاک کے ذریعہ آہستہ آہستہ مختلف ہندوستانی لیڈروں کے نام بھیجنا شروع کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کاپیاں ساری کی ساری یا ان میں سے کچھ انگریزی بحری سنسر (Censor) کے ہاتھ پڑیں۔ چنانچہ اس پروگرام کی ہندوستان میں ضبطی ہو گئی۔ اور اس کا داخلہ ہندوستان میں بند کر دیا گیا۔

اس پروگرام کی ہندوستان میں ضبطی کے بعد میں نے قبلہ مولانا صاحب کے حکم سے اس میں کچھ تھوڑی سی تبدیلیاں کر کے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ تاکہ جب اس کو چھپوا کر ہندوستان بھیجیں تو وہ اس اتناعتی حکم کے ماتحت ممنوع قرار نہ دیا جاسکے۔

مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم نے بحیثیت ”پریذیڈنٹ کانگریس کمیٹی کابل (ناظم نظارہ المعارف دہلی)“ خود اپنے قلم سے ”مہا بھارت سرو راجیہ“ پارٹی سے ہندوستان کلاں کی جمہوری جماعتوں کی مجلس کا نظام عمل“ کا پروگرام کا تعارف رقم فرمایا تھا۔ یہاں اس کے بعض اقتباسات درج کیے جاتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

”ہندو مسلم اختلاف کو رفع کرنے کی بارہا کوششیں کی گئیں، مگر ان میں سے کوئی بھی بار آور نہ ہو سکی۔ کیونکہ مسئلے کی اصلیت و اہمیت پر غور نہیں کیا جاتا۔ اگر تعمق سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ نہ صرف ان دو فرقوں میں باہمی اختلاف ہے بلکہ ہر ایک فرقے کے اندر قومی اور معاشرتی تقسیمات موجود ہیں۔ مسلمانوں میں قومی سوال موجود ہے۔ اگر پنجابی و سندھی، ہندوستانی اور پٹھان، کشمیری اور بلوچی کا قومی سوال موجود ہے تو ہندوؤں میں بنگالی، بہاری، مدراسی و مرہٹی، گجراتی و مارواڑی کا مسئلہ پایا جاتا

ہے۔ ان قومی اختلافات کو مذہبی رنگت بھی نہیں مل سکتی۔

”اس کے بعد ہر ایک قوم میں طبقاتی پیچیدگی موجود ہے۔ مالدار و محنت کش، زمیندار و کسان، سرمایہ دار و مزدور کی باہمی کشاکش ہر ایک ہندوستانی قوم کو دو طبقاتی اور متعارض صنفوں میں باسانی تقسیم کر سکتی ہے۔ اس لیے صرف مذہبی بنا پر تمام ہندوستانی مسائل اور خصوصاً ہندو مسلم اختلافات کو حل کرنا کوئی راہ نجات پیدا نہیں کر سکتا۔ لہذا ہم اپنے پروگرام میں مذہب کو ان مسائل کو حل کرنے کی اساس نہیں قرار دیتے بلکہ قومی اور طبقاتی تفریق اور اقتصادی و سیاسی اصول پر ان مشکلات کا حل پیش کرتے ہیں، جس کے ذیل میں مذہبی اختلافات بھی معقولیت سے رفع ہو سکتے ہیں۔ ہم ہندوستان کو ایسے ممالک میں تقسیم کرتے ہیں جہاں ایک قوم آباد ہو جس کی زبان اور معاشرت میں یکسانی پائی جاتی ہو۔ اس تقسیم کے بعد ہر ایک مذہب کے لیے کسی نہ کسی ملک میں اکثریت حاصل ہونے کی گنجائش ہے۔ اس لیے مذہبی تنازعات کا قطعی طور پر سدباب ہو سکتا ہے۔ ان ممالک کی جمہوریتوں میں انتخاب کے لیے حق نمائندگی مذہبی تفریق کے بجائے طبقاتی اختلافات کی بنا پر دیا جائے گا۔ اس لیے چھوٹے مذہبی فرقوں کی بھی حق تلفی نہیں ہوگی۔“

مروجہ نظام سرمایہ داری کو ہم رد کرتے ہیں۔ لیکن اس کے بجائے کوئی ایسا نظام قبول نہیں کرتے، جس میں مذہب کے لیے بالکل گنجائش نہ ہو اور وہ چھوٹی انفرادی ملکیت کی اجازت نہ دیتا ہو۔ کیونکہ ہمارے ملک کی ۷۲ فیصدی آبادی پرانے طریقہ کاشت کاری سے اوقات بسر کر رہی ہے۔ عوام میں مذہبی رسوم ان کی معاشرت کا جزو بن چکی ہیں۔ اگر ان امور کا خیال نہ کر کے کوئی پروگرام بنایا جائے تو تحریک آزادی بہت دور پیچھے پڑ جائے گی۔“

”ہندوستان جیسے ملک کا دنیا سے علیحدہ رہنا ممکن نہیں اور نہ وہ دنیا سے کبھی علیحدہ رہ سکا ہے۔ ہماری پارٹی ہندوستان کے تعلقات خارجیہ بتدریج پیدا کرنے کے لیے سب سے بہتر طریقہ ایشیا ٹک فیڈریشن تحریک کو سمجھتی ہے اس لیے ہم نے اسے اپنے پروگرام کا اہم حصہ قرار دیا ہے۔ ہماری کمیٹی کا خیال ہے کہ ایشیا ٹک فیڈریشن کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک ایشیا روس کو اپنے اندر جذب نہیں کر لیتا۔ روس ایک ایشیائی کی نظر میں ایشیائی قوم ہے۔ اس وقت نصف ایشیا اس کے زیر اقتدار ہے۔ روس پرانے ایپرا طور پر خیالات چھوڑ کر ایک ایسے اصول کے لیے لڑ رہا ہے جس کی علم برداری ایشیا کو کرنی چاہیے تھی۔ ممکن ہے روسی انقلاب کے زمانے میں مذہب کے خلاف جو تشدد برتا گیا ہے اس سے متاثر ہو کر ہمارے دوست ایشیا ٹک فیڈریشن میں روس کا نام سن کر گھبرا جائیں۔ اس لیے میں اپنا خیال ذرا وضاحت سے لکھنا چاہتا ہوں۔“

”انقلاب روس کے دو پہلو ہیں۔ ایک تو یہ موجودہ تقسیم دولت اور قانون ملکیت کو بدلا جائے اور اس کے عوض ایک نیا نظام ایسا قائم کیا جائے جس میں انفرادی ملکیت کے بدلے اجتماعی ملکیت کا قانون جاری ہو اور زمین کی پیداوار اور صنعتی مال کو بیچنے کے لیے نہیں بلکہ حسب ضرورت استعمال کے لیے پیدا کیا جائے۔ انقلاب کا یہ پہلو دنیا پر اثر ڈال رہا ہے۔ اگر کمیونسٹ انٹرنیشنل اپنے انتہائی نقطہ نظر میں جلدی کامیاب نہ بھی ہو پھر بھی وہ دنیا میں سیاسی اور اقتصادی طاقت محنت کش طبقے کو دلا کر رہے گا۔ انقلاب کے اس پہلو سے صرف نظر کرنا سیاسی کوتاہ بینی کی دلیل ہے۔“

”اس انقلاب کا دوسرا پہلو مذہب سے علیحدگی ہے جو روس میں تشدد کا انتہائی درجہ اختیار کر چکی تھی کیونکہ راہنمایان مذہب نے پرانے نظام ایمپراطوری و سرمایہ داری کی حمایت میں مذہب کو آلہ کار بنایا تھا، لیکن حالات کے سکون پذیر ہونے پر مذہب کی مخالفت دھیمی پڑ گئی..... اگر ہندوستانی مذاہب کے رہنما سروراجیہ جمہوریہ کے سیاسی و اقتصادی پروگرام کو اپنے ہاتھ میں لے کر اسے کامیاب بنانے پر کمر ہمت باندھ لیں تو نہ تو ان کے مذہب کو کوئی خطرہ ہے اور نہ اس کے خلاف تشدد کا اندیشہ۔“

”ہندوستان نے انقلاب عظیم فرانس سے چشم پوشی کر کے اپنی عظمت کو خاک میں ملا دیا۔ اب اس عالمگیر اہمیت رکھنے والے واقعہ سے اغماض کر کے ہم نہیں چاہتے کہ وہ اپنی موت کے فتوے پر دستخط کر دے۔ ہمالیہ قرہ قروم اور ہندوکش کے مقام اتصال سے چند قدم آگے روس ہم سے ملتا ہے۔ ہماری قطعی رائے ہے کہ اس غلامی کے ساٹھ سال میں جو کہ ہم نے حاصل کیا ہے اگر وہ سارے کا سارا دے دیں اور ننگے بھوکے رہ کر شمال مغربی دروں سے قطب شمالی تک رہنے والی قوموں کی دوستی خرید لیں تو ہم خسارے میں نہیں رہیں گے۔“

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستان والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستاںوں میں

علامہ اقبال جاوید نامہ طبع اول ۱۹۳۲ء میں ”پیغام افغانی با ملت روسیہ کے تحت فرماتے ہیں:

ملتی خواہد ایں دنیائے پیر آنکہ باشد ہم بشر و ہم نذیر!

بازی آئی سوئے اقوام شرق بست ایام تو با ایام شرق

(یہ بوڑھی دنیا ایک ایسی قوم چاہتی ہے۔ جو خوش خبری دینے والی ہو اور ڈرانے والی بھی۔ تم پھر مشرقی قوموں کی طرف لوٹو تمہاری تاریخ مشرق کی تاریخ سے وابستہ ہے)

پروفیسر محمد سرور مرحوم از قلم مولانا عبید اللہ انور

سرور صاحب مرحوم علم و دانش کے مہر تاباں ولی اللہی علوم و معارف کے خواص عربی اردو کے فطری ادیب اور وسیع النظر عالم اور محقق تھے۔ شورش کاشمیری نے ایک بار لکھا تھا کہ ”پاکستان میں جو دو چار پڑھے لکھے ہیں سرور صاحب ان میں سے ایک ہیں۔“ وہ دو اور دو چار کی طرح بات کرتے ہیں۔ انہیں مشکل ترین مضمون کو آسان زبان میں لکھ کر دل میں اتارنے کا ذہنگ خوب آتا ہے۔ اس سلسلہ میں ان کے آئیڈیل ادیب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں تھے جن سے سرور صاحب کو بڑی عقیدت و محبت تھی۔ مرحوم آغا شورش کاشمیری نے ایک بار مجھ سے کہا تھا جیل کی تنہائیوں میں سرور صاحب کی کتابوں نے فلسفہ شاہ ولی اللہ اور مولانا سندھی کے افکار و نظریات سے مجھے صحیح معنوں میں متعارف کرایا اور میں اس بارے میں ان کا ہمیشہ ممنون احسان رہوں گا۔ مرحوم سادگی پسند منکسر المزاج کم گو اور کم آمیز بزرگ تھے لیکن شرافت و انسانیت کے پیکر بیدار مغز مطالعہ و مشاہدہ کے دلدادہ اور انتھک کام کرنے والے تھے۔ تعصب و تنگ نظری انہیں چھو کر نہیں گئی تھی وہ اخیر تک اپنے آپ کو ایک طالب علم ہی تصور کرتے تھے۔ جدید و قدیم عربی اردو ادب سیاست و معاشرت اور تاریخ و ثقافت پر بڑی گہری نظر رکھتے تھے اور حافظہ بھی بلا کا پایا تھا ان کی کچھ یہی خوبیاں تھیں جن کی بنا پر مشہر ادیب و مورخ جناب سید ہاشمی فرید آبادی جب ۱۹۳۸ء میں حج کو گئے تو وہاں مولانا سندھی سے حجتہ اللہ البالغہ کے بعض مقامات کی تشریح سننے کے بعد سرشار و مسرور ولی واپس آئے تو جامعہ ملیہ میں ڈاکٹر ذاکر حسین شیخ الجامعہ کو مولانا سندھی کا ایک پیغام دیا اور ساتھ ہی اپنی طرف سے بھی درخواست کی خدا معلوم مولانا وطن واپس آسکیں گے یا نہیں بہتر یہی ہے جامعہ کے ایک استاد کو امام ولی اللہ کے فلاسفی پڑھنے کے لیے مکہ مکرمہ مولانا کی خدمت میں بھیج دیا جائے۔ ذاکر صاحب کو یہ تجویز پسند آئی کیونکہ اسیر مالٹا حضرت شیخ الہند سے عقیدت و محبت اور ان کے مشن سے تعلق کا یہی تقاضا تھا۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے پروفیسر محمد سرور صاحب کو منتخب کیا۔ جامعہ میں عربی زبان و ادب کے ماہر اور جامعہ ازہر کے فارغ التحصیل یہی ایک استاد تھے۔

چنانچہ ذاکر صاحب نے مولانا عبید اللہ سندھی کے نام ایک خط بھی لکھ دیا اور فرمایا جلدی روانہ ہو جاؤج کی سعادت سے مشرف ہو گے اور مولانا کی زیارت اور ان کے افکار سے استفادے کا موقع بھی میسر آئے گا۔ سرور صاحب کی خوش نصیبی تھی کہ وہ مکہ معظمہ میں بھی مولانا سے مستفیض ہوئے اور مراجعت وطن کے بعد یہاں بھی پانچ برس تک مولانا سے شاہ ولی اللہ کی کتابیں تحقیق و محنت سے پڑھتے رہے اور ان کے افکار و خیالات کے استفادہ میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ اس دوران میں بھی امام ولی اللہ اور مولانا سندھی پر برابر لکھتے رہے۔ بعد میں شاہ صاحب کی بعض کتابوں کے انہوں نے نہایت عمدہ تراجم کیے اور خود سرور صاحب کی تصنیف ”ارمغان شاہ ولی اللہ“ اپنے موضوع پر بے نظیر کتاب ہے۔ جسے شاہ ولی اللہ کی کتابوں کا خلاصہ اور نچوڑ کہنا چاہیے اور علوم قرآنی کے طلبہ کے لیے تو وہ ایک نعمت ہے۔ ایسے ہی مولانا سندھی پر ”افادات و ملفوظات“ اور ”مولانا عبید اللہ سندھی“ نام کی دو کتابیں لکھ کر تو انہوں نے امت پر احسان عظیم کیا ہے۔ انہی دنوں ”نوائے وقت“ کے مشہور کالم نویس میاں محمد شفیع صاحب نے صحیح لکھا کہ سرور صاحب نے مولانا کے خیالات کو آج کے قومی اور عالمی حالات کے پس منظر میں شرح و بسط سے بیان کیا ہے اگر یہ کتاب انگریزی میں لکھی جاتی تو آج سارے عالم اسلام میں اس کی دھوم مچ گئی ہوتی۔ ۱۹۴۳ء میں جب یہ کتاب چھپی تو ذاکر صاحب نے اسے پڑھ کر فرمایا سرسید کی لائف ”حیات جاوید“ میں نے کئی بار پڑھی ہے لیکن یہ کتاب پڑھنے کے بعد اب مجھے ایک مرثیہ محسوس ہوتی ہے اس کتاب میں روشنی، پیغام، امید اور زندگی کی امنگ دکھائی دیتی ہے۔“ اس کا منظر عام پر آنا تھا کہ پورے ہندوستان میں ایک تہلکہ مچ گیا۔

جماعت اسلامی نے تو آسمان سر پر اٹھا لیا۔ میرے سامنے ملک نصر اللہ خان عزیز نے مولانا سندھی سے پوچھا اس کتاب کے بارے میں خود آپ کی کیا رائے ہے۔ مولانا نے فرمایا ”پروفیسر صاحب نے ہر ممکن کوشش کی ہے کہ میرے افکار و خیالات سے متصادم کوئی چیز اس میں نہ آنے پائے ظاہر ہے خیالات تو میرے ہی ہیں لیکن زبان و بیان سرور صاحب کا ہے۔“ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ اس دور میں اس کتاب نے دوست دشمن پر گہرے اثرات چھوڑے اور طلباء برادری کو تو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اس کے مطالعہ سے طلبہ اپنے دل میں شوق تحقیق و تجسس کے سوتے پھوٹتے ہوئے محسوس کرتے اور کائنات کے جدید علوم سے دامن بھرنے اور نئے افق سر کرنے کی اپنے اندر لگن پاتے۔ اس کے برعکس کچھ لوگ اس کے بعض مندرجات سے پریشان ہو گئے۔ اس ملی جلی فضا میں ایک روز دیوبند کی جامع مسجد میں مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی تقریر کرتے ہوئے فرمانے لگے کاش یہ کتاب میں نے یا مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے مرتب کی ہوتی تو گردوغبار کی یہ آندھی کبھی نہ اٹھتی پھر افسوس کے لہجے میں فرمایا

ہماری سستی اور اغیار کی چستی نے ہمیں یہ دن دکھایا ہے اس سے ہمیں سبق حاصل کرنا چاہیے۔ انہیں دنوں اگست ۱۹۴۴ء میں عین مولانا سندھی کی وفات کے مہینہ جب کہ مولانا کے عزیز و اقربا اور شاگردوں کے دل زخمی تھے معارف اعظم گڑھ میں مولانا مسعود عالم نے اس کتاب پر ایک دل آزار اور گمراہ کن تنقید لکھی۔ اس کے جواب میں مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے جن کا مولانا سندھی کے ارشد تلامذہ میں شمار ہوتا ہے برہان دہلی میں ایک تبصرے پر تبصرہ کے عنوان سے ایسا دندان شکن جواب دیا جس پر آج تک کسی کو ایک حرف لکھنے کی جرأت نہ ہوئی۔ چنانچہ وہ علمی و تحقیقی بلکہ ایک لحاظ سے تاریخی مضامین ”مولانا عبید اللہ سندھی اور ان کے ناقد“ کے عنوان سے کتابی صورت میں اسی وقت چھپ گئے تھے۔ اب سنا ہے امریکہ میں ان کا انگریزی ترجمہ بھی چھپ گیا ہے۔ بہر حال میں قدرت کی اس بے نیازی پر حیران ہوں کہ علم و ادب کی یہ عظیم خدمت اس نے کس کے سپرد کی جس کا کوئی علمی پس منظر نہیں سرور صاحب کا تعلق گجرات کے ایک گھرانے اور پس ماندہ علاقے سے ہے۔

وہ ۱۹۰۶ء میں پیدا ہوئے اور ستمبر ۸۳ء میں ۷۷ سال کی عمر میں عالم بقاء کو سدھارے۔ انہوں نے پانچویں جماعت اپنے گاؤں کے سکول میں پاس کی۔ دسویں تک شہر گجرات میں پڑھا مزید تعلیم کے لیے مسلمانوں کے اس وقت کے سب سے بڑے علمی و تہذیبی مرکز جامعہ ملیہ اسلامیہ میں داخلہ لیا۔ عربی میں بی اے آنرز کر کے تکمیل تعلیم کے لیے عازم مصر ہوئے۔ ساڑھے تین برس تک قاہرہ میں زیر تعلیم رہے۔ داخلہ تو جامعہ ازہر میں لیا تھا اور وہیں تعلیم بھی مکمل کی لیکن جامعہ مصریہ میں ڈاکٹر طہ حسین اور الاستاذ احمد امین کے لیکچرز پابندی سے سماعت کرتے رہے۔ صحافتی دنیا میں ایڈیٹر الہرام محمد حسین بیگل، فرید وجدی اور دوسرے اہل قلم کے مضامین دلچسپی سے مطالعہ کرتے رہے۔ وہاں سے واپسی پر مولانا ظفر علی خاں نے آپ کو زمیندار اخبار کا ایڈیٹر مقرر کر دیا جہاں انہوں نے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ لیکن ابھی چند ماہ ہی گزرے تھے کہ جامعہ ملیہ دہلی میں بطور پروفیسر ان کا تقرر ہو گیا۔ وہاں بڑے شوق سے تعلیمی خدمات سرانجام دے رہے تھے کہ قدرت نے سفر حجاز کا بندوبست کر دیا۔ حرمین شریفین سے واپسی پر انہیں ولی اللہی علوم کو عام کرنے کی لگن لگ گئی اس مقصد سے انہوں نے مستقل طور پر صحافتی زندگی کو اپنا لیا۔ تقسیم برصغیر کے بعد پہلے امروز کے ایڈیٹر بنے غالباً پالیسی اختلاف کی وجہ سے الگ ہو کر کچھ عرصہ بعد ہفت روزہ آفاق نکالا جو جلد ہی روزنامہ میں تبدیل ہو گیا۔ پروفیسر سرور صاحب نے اس پرچہ میں سرمایہ دارانہ استحصالی نظام معاشی عدم توازن بالخصوص بندہ مزدور کے اوقات کی تلخی کو شیرینی میں بدلنے کے لیے قلم کے خوب جوہر دکھائے اور زرعی زمین کی تجدید جسے اب تمام سیاسی جماعتوں اور حکومت نے اپنا لیا ہے یہ دراصل انہیں کے علم و قلم کے مرہون احسان ہے۔ انہوں نے

”آفاق“ میں اس پر تاثر توڑ حملے کیے۔ اس سلسلہ میں ربوہ کے مدارالمہام اور امیر جماعت اسلامی کی دلائل کا جس طرح تاروپو بکھیرا وہ اب تاریخ کا حصہ بن چکا ہے۔ اصل میں ان کے لکھنے کا مقصد تھا، چونکا نا نہ تھا۔ جسے انہوں نے ہر دور میں ہر قیمت پر ادا کیا۔ انہوں نے بلاشبہ قلم کو نئی رفعتیں بخشیں وہ جتنا سادہ لکھتے ذہن کو اتنا ہی متاثر کرتا، یوں معلوم ہوتا جیسے بھاری بھر کم الفاظ استعمال نہ کرنے کی انہوں نے قسم کھا رکھی ہے۔

سرور صاحب کا تعلق تو پرانی نسل سے تھا لیکن لکھتے وہ نئی نسل کے لیے تھے اور زیادہ تر فائدہ بھی اس سے آئندہ نسلیں ہی اٹھائیں گی۔ میرا خیال ہے مستقبل میں ان کی تحریریں اور مقبول ہوتی چلی جائیں گی کیونکہ یہ کوئی وقتی باتیں یا سطحی نظریات نہیں۔ یہ دراصل مولانا سندھی کے برسوں کے تجربات اور شاہ ولی اللہ کی مجتہدانہ تعلیمات پر مبنی ہیں۔ جن کی ضرورت جوں جوں زمانہ گزرے گا اور بڑھتی جائے گی ان کے مضامین سے نفسیاتی حقیقت پسندی جھلکتی ہے جسے فنکارانہ انداز میں برتنا نہیں خوب آتا تھا وہ الفاظ کے طوطا مینا اڑانے کے خلاف تھے وہ مسائل کو حقیقت کے روپ میں دیکھنا چاہتے تھے اور فطری انداز میں ان کے حل کرنے کو ترجیح دیتے تھے۔ وہ مسائل سے آنکھیں موندنے کے حق میں نہ تھے بلکہ مردانہ داران کے مقابلہ کی ترغیب دلاتے انہوں نے ایک بھر پور منفرد اور متنوع زندگی گزاری ان کی ذات میں کئی پہلو سمٹ آئے تھے وہ صحافی محقق انشاء پر داز مترجم دینیات کے ماہر تاریخ اور فلسفہ تاریخ پر عمیق نگاہ رکھنے والے استاد تھے۔ اسلام کے عروج و زوال اور اس کے اتار چڑھاؤ پر غور و فکر کرنے کی صلاحیت انہیں اپنے استاذہ سے وراثت میں ملی تھی وہ دیکھنے میں سادہ پنجابی نظر آتے لیکن دلی کی روزمرہ اجلی زبان بے تکان لکھتے جو خود وہاں کے ادیبوں کو نصیب نہیں۔ انہوں نے بہت کچھ لکھا اور بہت کچھ لکھنے کی آرزو دل میں لے کر چلے گئے۔ ماہنامہ الرحیم حیدرآباد فکر و نظر اور الزکوٰۃ اسلام آباد خصوصاً آفاق کے پرانے فائلوں سے اگر ان کے مضامین یک جا ہو سکیں تو یہ ایک بڑی مفید خدمت ہوگی۔ گزشتہ دنوں پروفیسر سرور صاحب جب آخری مرتبہ شیرانوالہ گیٹ تشریف لائے تو میں نے ”مولانا سندھی کا آخری سفر دیوبند“ انہیں اپنا ایک مضمون پڑھ کر سنایا اور ساتھ ہی پروفیسر اسلم صاحب کی نئی تالیف ”مولانا سندھی کے سیاسی مکتوبات کے چند نسخے ہدیۃ پیش کیے جنہیں پا کر بہت ممنون ہوئے میرے مضمون کے ایک جملہ کہ مولانا سندھی نے فرمایا ”بے شک انسان اپنی عمر طبعی گزار کر رخصت ہو جاتا ہے لیکن ہر شخص اپنے عمل کے خیر و شر میں ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔“ سن کر اسے اپنی زبان سے دہرایا اور وداعی معافقہ و مصافحہ کرتے وقت مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کہہ رہے ہوں ”چراغ سحر ہوں بجھا چاہتا ہوں“ اور یہ دیکھ کر افسوس ہوا حسن و توانائی کے مظہر پروفیسر محمد سرور کی جگہ نحیف و نزار

سرور صاحب نے لے لی ہے اب ان کی صحت کو گھن لگ چکا تھا۔ وصال کی خبر سے کوئی دو تین روز پہلے ماہنامہ الزکوٰۃ میں ان کا آخری ایڈیٹوریل پڑھ کر دلی مسرت ہوئی کہ اسلام کے عملی نفاذ اور وطن عزیز کے بننے والوں کی ترقی و خوشحالی سے انہیں کس درجہ لگاؤ ہے جو انہیں اس عمر میں بھی بے چین کیے ہوئے ہے۔

نظاہر سرور صاحب نے اپنے صاحب زادے کو ملنے کے لیے دوہنی کا رخت سفر باندھا لیکن انہیں کیا خبر تھی کہ وہ سفر آخرت پر روانہ ہو رہے ہیں۔ انہوں نے دوہنی میں ہی داعی اجل کو لبیک کہا لیکن جس سرزمین میں اس مرد حق آگاہ نے جنم لیا اور جہاں علم و حکمت کی شمع روشن کی آخر اس دھرتی نے اپنی گود میں کھینچ بلایا اور آج وہ اس تاریخی شہر میں ابدی نیند سو رہے ہیں۔ رحمۃ اللہ علیہ و اسعوا و کثیرا۔

سرور صاحب جیسے ذہین و فطین انسان دوست آفاق گیر اور علم و دانش کے رسیار روز روز نہیں پیدا ہوتے ان کا بزم علم و ادب سے اٹھ جانا کوئی معمولی بات نہیں۔ ان کے علم و فکر کے ڈانڈے بلند پایہ مفکرین اسلام سے جاملتے ہیں اور اس سلسلہ میں دور خلافت راشدہ بنو امیہ بنو عباس تاریخ اسلام عہد بہ عہد ترقی و تنزل نیز بر عظیم میں مسلم دور کی داستان اور مفکرین عالم اسلامی کے افکار و نظریات پر انہیں بھر پور گرفت حاصل تھی اور اپنی کتابوں میں انہوں نے اس پر بے لاگ تبصرے بھی کیے ہیں جس کے اثرات دور رس ہوں گے۔ میرے نزدیک وہ اسلام کی متاع بے بہا تھے طلباء علوم اسلامی اور عام شائقین علم و فن اور خاص طور پر جو یان حق و صداقت ضرور اس سے استفادہ کریں گے۔ سرور صاحب ان میں سے تھے جن کے متعلق کہا جاتا ہے۔

عمر ہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات

تاز بزم عشق یک دانائے راز آید بزوں

وہ خود تو ہمیشہ خزاں کے ستم سہتے رہے لیکن ہمارے لیے پوری جانفشانی سے بہاریں تلاش کرتے رہے۔ ان کے اس جہان رنگ و بو کو خیر باد کہہ دینے سے علم و ادب کی مانگ اجڑ گئی ہے اس کا حسن لٹ گیا ہے خوشبو ماند پڑ گئی ہے۔ ایسے روشن ستارے آسمان علم و حکمت پر کبھی کبھی ابھرتے ہیں اور دکھ اس بات کا ہے کہ اب وہ ستارہ فلک کے درپچوں سے کبھی نہیں جھانک سکے گا۔

سرور صاحب فطرت کا ایک عطیہ تھے جن کی دریافت مولانا سندھی ہیں اور مولانا سندھی نے ہمارے لیے شاہ ولی اللہ کو دریافت کیا اور شاہ ولی اللہ نے خیر القرون سے لے کر اپنے دور تک اسلام کی فلاسفی کو جس طرح مدون کیا ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔ لیکن افسوس کہ مسلمانوں نے اپنے محسنوں کی کبھی قدر نہیں کی جس کی سزا بھی انہیں ہمیشہ ملی لیکن اب وہ دور جلد آ رہا ہے کہ امام ولی اللہ کے افکار و آراء اور

ان کے ذہنی کمالات کی مہر میں مفراسلام کے نظریات پر مثبت نظر آئیں گی انشاء اللہ العزیز۔
 سرور صاحب کا انتقال جہاں فکر ولی اللہی کے قدر شناسوں کے لیے ایک ناقابل تلافی
 نقصان ہے وہاں علم و ادب کے لیے بھی ایک بہت بڑا المیہ ہے۔ انہوں نے نام و نمود سے بچ کر ساری
 زندگی ٹھوس علمی و ادبی خدمات انجام دیں اور شاہ ولی اللہ کی کتابوں کو اردو کا جامہ پہناتے وقت انہوں
 نے جن اعلیٰ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے اس کا ایک زمانہ معترف ہے اور ولی اللہ سوسائٹی کے لیے تو ان کا
 یہ کارنامہ ہمیشہ باعث فخر رہے گا اس لحاظ سے ان کی موت بلا ریب ایک فرد کی نہیں بلکہ ایک ادارہ کی
 موت ہے۔

کل گئے تم کہ ہم پہ قیامت گزر گئی

بحوالہ ہفت روزہ خدام الدین لاہور

۱۴ نومبر ۱۹۸۳ء



www.KitaboSunnat.com



پروفیسر محمد سرور ۱۹۰۶ء میں ضلع گجرات کے ایک گاؤں بکریالی میں پیدا ہوئے۔ میٹرک میں تعلیم حاصل کر رہے تھے کہ تحریک ترک موالات کے سلسلے میں حضرت سید عطا اللہ بخاری شاہ کے قائم کردہ آزاد مسلم ہائی سکول میں داخلہ لے لیا۔ اس سکول کا الحاق جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ سے تھا جامعہ بعد میں دلی منتقل ہو گئی اس کے بانی مولانا محمد علی جوہر تھے۔ گجرات سے میٹرک کرنے کے بعد جامعہ ملیہ اسلامیہ تشریف لے گئے اور یہیں سے بی اے (آنرز) عربی ادب و تاریخ کیا۔ جامعہ سے ڈگری لینے کے بعد جامعہ ازہر مصر میں داخلہ لیا۔ اور ساڑھے تین سال مصر میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد وطن واپس ہوئے۔ ۱۹۳۳ء میں زمیندار اخبار میں بطور اقتصادی نگار صحافتی زندگی کا آغاز کیا۔ اس کے کچھ عرصہ کے بعد دلی چلے گئے اور جامعہ ملیہ اسلامیہ میں عربی ادب اور تاریخ کے پروفیسر مقرر ہوئے۔

مولانا عبید اللہ سندھی کے بلائے پر ڈاکٹر ڈاکٹر حسین کی نگاہ انتخاب آپ پر

پڑی اور آپ کو ڈاکٹر صاحب نے ۱۹۳۶ء میں مولانا صاحب کے پاس مکہ معظمہ بھجوایا۔ وہاں آپ مولانا مرحوم سے شاہ ولی اللہ کے فلسفہ اور تعلیمات کے بارے میں درس لیتے رہے۔ مکہ معظمہ سے مولانا سندھی صاحب کے وطن واپس آنے پر مولانا مرحوم نے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں بیت انکسٹ قائم کیا تو اس ادارہ کے مہتمم مقرر ہوئے۔ اور اس کے بعد ساری عمر مولانا سندھی کے افکار و خیالات اور شاہ ولی اللہ کے فلسفے کی ترویج و اشاعت کرتے رہے۔

۱۹۳۲ء میں جامعہ سے طویل رخصت لے کر لاہور آئے تاکہ صوبے میں لکھنے پڑھنے کے ذریعے کوئی سیاسی کام کریں۔ یہاں آ کر روزنامہ احسان کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ مگر اخبار کی پالیسی سے اتفاق نہ کر سکے۔ ۱۹۳۳ء کے شروع میں اس اخبار الگ ہوئے۔ اس سال شاہ ولی اللہ اور مولانا عبید اللہ سندھی کے افکار و فلسفہ کی اشاعت کے سلسلے میں سندھ سائمر اکادمی کے نام سے ایک اشاعتی ادارہ قائم کیا۔ اس کے ساتھ تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع کیا۔ اس زمانے میں ”مولانا عبید اللہ سندھی حالات تعلیمات اور سیاسی افکار“ نامی کتاب لکھی۔ نومبر ۱۹۳۳ء میں واپس جامعہ تشریف لے گئے ۱۱ اگست ۱۹۳۷ء کو لاہور آئے تو واپس جامعہ نہ جاسکے۔

۱۹۳۸ء میں جب روزنامہ امروز جاری ہوا تو اس اخبار کی سبکی مجلس ادارت میں جناب فیض احمد فیض مولانا چراغ حسن حسرت کے ساتھ پروفیسر محمد سرور بھی شامل تھے۔ بعد میں امروز کی ادارت سے الگ ہو گئے۔ اور اپنا اخبار ہفت روزہ آفاق جاری کیا جو بعد میں روزنامہ آفاق کے نام سے شائع ہونا شروع ہوا۔ اس اخبار میں پاکستان میں پہلی بار جاگیرداری نظام کے خلاف لکھا گیا۔ آپ کی تحریریں ذوق و شوق سے پڑھی جاتی تھیں۔ روزنامہ آفاق سے الگ ہو کر آپ کراچی چلے گئے اور حکومت پاکستان کی وزارت اطلاعات میں اسٹنٹ ڈائریکٹر مقرر ہوئے وہاں سے تبدیل ہو کر اور محکمہ اطلاعات لاہور میں ڈپٹی ڈائریکٹر کے طور پر کام شروع کیا ۱۳۵۹ء میں سرکاری نوکری چھوڑ دی۔

۱۹۵۹ء میں پشاور پہنچے اور روزنامہ بانگ حرم کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ ان کے کچھ عرصہ بعد جب محکمہ اوقاف پاکستان نے حیدر آباد میں شاہ ولی اللہ اکیڈمی قائم کی تو اس ادارے کے جریدے الرتیم کے ایڈیٹر ہو گئے اس طرح چند برس تک اس ادارے سے منسلک رہے اور شاہ ولی اللہ اور مولانا عبید اللہ سندھی کے افکار و تعلیمات پر کام کرتے رہے۔ یہاں ملازمت کر رہے تھے کہ ڈاکٹر فضل الرحمن نے جو ادارہ تحقیقات اسلامی حکومت پاکستان کے ڈائریکٹر تھے نے آپ کو اپنے ادارے میں لے لیا

297.64

م 151 م



* 2 2 1 3 6 - EU - 6 4 *

ادارے سے الگ ہو گئے اور لاہور چلے آئے۔ یہاں پر شیخ محمد اکرام جو اب ہوئے اور ادارہ کے مجلہ المعارف کے ایڈیٹر کے طور پر اپنا منصب سنبھالا پاکستان کے جریدے الزکوٰۃ کے ایڈیٹر مقرر ہوئے اچانک پیغام اجل آیا۔ پروفیسر صاحب موصوف ۱۹۸۳ء کو جب اپنے بیٹے سا

بھروسہ و فیات کے باوجود پروفیسر صاحب موصوف مسلسل علمی تحقیقی اور تفسیری سرگرمیوں میں مصروف رہے۔

ان کی علمی و فکری خدمات پر پاکستان میں ”تسلیت علیہ“ سے نوازا